The TANVIIR
MONTHLY
BOMBAY, No. 8
SEPTEMBER
1940.
مدیرہ :-
''سحر''
قیمت
مقامی

Mr. NAJM-E-ALAM
and
Dr. DILSHAD BEGUM.

Mr Najm is from Royal Family of Bhopal State Mrs Najm is from a high Muslim family of Poona and she is M B B S Their marriage is being considered an ideal one among educated people We congratulate them and wish them every success in life

ماہنامہ تنویر

The "TANVIR" Monthly Bombay. 8.

مدیرہ — سحر

نائب مدیرہ — انوری خانم

جلد ۴

شمارہ ۹

فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۴۰ء

آزمایش کی گھڑی

حکومت برطانیہ تہذیب انسانیت کی محافظ ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی ہندوستان کے جائز حق آزادی کو تسلیم کر لینے میں ہمیشہ حیل وحجت سے کام لیتی رہی ہے، دنیا بھر کے ملکوں کی آزادی کا اسے خیال ہے، خود اپنی آزادی کی خاطر وہ آخر دم تک لڑنے اور مرمٹنے کو طیار ہے یہ بات قابل قدر ہے اور قابل تقلید بھی۔ چونکہ زندہ قومیں غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتی ہیں، برطانیہ بھی ایک زندہ قوم ہے اور وہ آزادی کیلئے اپنا آخری قطرہ خون بہانے سے دریغ نہ کریگی۔ مگر حیرت ہے کہ وہ ہندوستانیوں کو اپنے نقش قدم پہ چلنے دینا کیوں گوارا نہیں کر سکتی، ہندوستانیوں کی آزادی اسے کیوں نہیں بھاتی؟ جبکہ ہندوستان کی آزادی کیلئے اسے کسی سے لڑنا بھی نہیں ہے۔ یہہ خود اسکے بس کی بات ہے، مگر ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں اس نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی حیلہ تراشا۔ انڈین نیشنل کانگریس ہندوستان کی واحد سیاسی انجمن ہے اور اس کا مقصد ہندوستان کو آزاد کرانا ہے ہمارے ملک کی تائید اسے حاصل ہے کیونکہ کونسا ایسا بدبخت اور غلامانہ ذہنیت کا انسان ہوگا جو اپنے ملک کی آزادی نہ چاہے۔ اسی لئے کانگریس کی پوزیشن اتنی مضبوط ہے جس پر ہم ہندوستانی جسقدر بھی فخر کریں بجا ہے۔

اِدھر ہندوستانیوں کی آزادی کی سچی خواہش اُدھر برطانیہ کے تہذیب انسانیت اور آزادی کی حفاظت کے دعوے، اس امر کے متقاضی تھے کہ ہندوستان فی الفور آزاد ہوجائے، مگر بیچ کے فتور اسمیں مخل ہوتے رہے۔ چند غداران وطن اور انکی پارٹیوں کو ابھارا گیا اور ان کا بہانہ بنا کر سارے ہندوستان کی آزادی کو التوا میں ڈالدیا گیا۔

یہاں سب سے پہلا سوال ہندو مسلم پیدا کرایا گیا اور اس سوال کو لیکر ہندوستانیوں کو بدنام کیا گیا، کہ وہ آپس میں کٹ مریں گے اگر انہیں آزادی دیدی گئی۔ پچھلے دنوں حکومت برطانیہ مسلم لیگ کی کانگریس سے مخالفت کا سہارا لیتی رہی ہے، مگر بھلا ہو سچے محبان وطن کا جنہوں نے حکومت کے اس ناجائز سہارے کو اپنے ایثار پسندی سے بیکار کر دیا ہے، چنانچہ حال ہی میں مسٹر راج گوپال اچاریہ نے لندن کے اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" کو مندرجہ ذیل بیان دیا ہے:—

"وزیر ہند مسٹر ایمری نے اقلیتوں کے متعلق جس دشواری کا ذکر کیا ہے اس کے جواب میں مَیں یہ چیز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ اگر برطانوی حکومت اس پر طیار ہوجائے کہ عارضی قومی حکومت قایم کیجائے، تو میں اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے کانگریسی رفقاء کو اس بات پر آمادہ کروں گا کہ وہ اس چیز پر راضی ہوجائیں کہ حکومت مسلم لیگ کو دعوت دے کہ وہ ہندوستان کا وزیر اعظم نامزد کرے اور اسے اس بات کا اختیار دے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق وزرا منتخب کر کے وزارت مرتب کرے۔ برطانوی حکومت نے جس دشواری کا ذکر کیا ہے اسمیں اگر واقعی صداقت ہے تو یہ دشواری کو میں جو چیز پیش کر رہا ہوں اس سے حل ہو سکتی ہے"

معزز معاصر "تیج دہلی" کا یہہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:—

"راجہ جی کی یہ پیشکش کو دھچیک کی سی حیثیت رکھتی ہے سیاسی اصول اور منطق کا اسمیں کوئی سوال نہیں ہے اور معقولیت حد

انصاف کا بھی اس سے کوئی تعلق نہیں، اسپر ہزاروں اعتراض ہو سکتے ہیں، مگر ایک اعتراض نہیں ہو سکتا کہ یہ ان میں سے کسی اقلیت کے خلاف ہے، جن کے مفاد کی امانتداری وزیر ہند نے اپنے ذمہ لی ہے"

ہندوستان کی آزادی کے مسئلہ میں اب گورنمنٹ برطانیہ کو حیل حجت نہ کرنا چاہیئے، کانگریس ہندوستانیوں کی سچی خیرخواہ اور آزادئ وطن کی حامی ہے، وہ مسلم لیگ کی حکومت کو غیر ملکی حکومت پر ترجیح دیتی ہے برعکس اسکے مسلم لیگ! ...... ہم کیا کہیں اسکے کارنامے تو اظہر من الشمس ہیں، آزادئ وطن کیلیئے اس نے کیا کچھ کیا؟ آزادی کی راہ سے مسلمانوں کو ہٹایا، اور غیر ملکی حکومت کی غلامی کا سبق پڑھایا، یہی اس کے بڑے کارنامے ہیں۔

اب دیکھنا چاہیئے کہ برطانیہ اور مسلم لیگ کا رویہ راجہ جی کے بیان کی روشنی میں ہندوستان کی آزادی کے متعلق کیا ہوتا ہے۔

ہندوستان میں برطانیہ کی بیخوفی

جرمنی کے وحشیانہ حملوں سے یورپ کے سکون کی جو ابتر حالت ہو رہی ہے خاصکر اس حالت میں جبکہ برطانیہ عظمیٰ انکی بہیمیت پناہی پر تھی اسبات سے نہ صرف برطانیہ کے وقار کو صدمہ پہنچا بلکہ اسوقت ان ممالک کی جو حالت ہے برطانیہ کی تاریخ میں ایسا نازک وقت کبھی نہیں پایا جاتا۔ ہمارے اس قول کے ثبوت میں تاریخ کی جلدیں بطور گواہ کے موجود ہیں۔

علاوہ بریں اس بات کی تائید برطانیہ کی حمایت میں ان اپیلوں سے بھی ہوتی ہے جو دن رات مختلف طریقوں سے یونائیٹیڈ اسٹیٹ امریکہ کی "شرکت جنگ" اور "جنگ میں مدد" کی غرض سے کی جاتی ہیں۔

ہندوستان سے بھی مدد مانگی جاتی ہے، مگر غلام ہندوستان جو خود اپنی مدد آپ نہیں کر سکتا کسی آزاد ملک کی کیا مدد کر سکتا ہے؟

اسی لئے ہندوستان کے قوم پرست رہنما اور آزادی کے دلدادہ ہندوستانی اپنے جائز حق آزادی کیلیئے موجودہ گورنمنٹ سے فتیں کر رہے ہیں اور اسی آزادی کی خاطر جیلوں کو آباد کر رہے ہیں۔ ہر ہندوستانی کی یہی آواز ہے کہ ہمارا جائز حق آزادی ہمیں ملنا چاہیئے آزاد ہندوستان ہی گورنمنٹ برطانیہ کی اس نازک وقت میں مدد کر سکتا ہے۔ مگر برطانیہ جواب میں یہی کہتی ہے کہ "جنگ کے بعد دیکھا جائیگا اور اسپر غور کیا جائیگا"

برطانیہ کی اس لاپروائی، سرد مہری، اور بے خوفی پر یہہ خیال آنا قدرتی بات ہے کہ اگر ہم ہندوستانیوں کی حالت موجودہ حالت سے بہتر ہوتی تو بھی کیا برطانیہ یہی لب ولہجہ اختیار کرتا اور یہی جواب دیتا؟۔

جبکہ جاپان کی مثال بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہندوستان کے جائز مطالبہ سے یہہ بے اعتنائی اور اسکے برعکس جاپان کی ہر جائز وناجائز بات کو زمانے کی نزاکت سے مجبور ہوکر نہیں مانا ——— اور اس کے سامنے سر خم نہیں کیا؟ ———

کیا ہندوستانیوں نے کبھی اسپر غور کیا ہے کہ ان کی کیا حالت بنا دی گئی ہے؟ صدیوں سے انہیں جس بلند معیار تعلیم پر پہنچایا جا رہا تھا اور جس معیار غلامی پر پورا اترنے کیلیئے طیار کیا جا رہا تھا اب وہ امتحان کی گھڑی آپہنچی۔ برطانیہ سو فیصدی کامیاب رہا۔ اور ہندوستانی بھی برطانیہ کے نقطہ نظر سے امتحان میں کامیاب رہا ہے، مگر بحیثیت انسان کیا برطانیہ اس بے خوفی اور کامیابی پر اور ہندوستانی اپنی اس بے حیثیتی اور غلامی پر فخر کر سکیں گے؟

مردانہ بربریت

حال ہی میں دہلی سے ایک دلخراش اور دردناک واقعہ کی خبر ملی ہے کہ ایک چالیس سالہ مالدار برہمن پروہت[1] نے ایک غریب ہمسایہ نائی کی نو سالہ لڑکی سے زنا بالجبر کیا لڑکی نازک حالت میں ہسپتال میں داخل کی گئی اور

[1] پروہت ہندی زبان میں "مذہبی پیشوا" کو کہتے ہیں۔

ملزم کو گرفتار کر لیا گیا تھا مگر وہ اسوقت بھاری بھاری رقموں کی ضمانت پر چھوٹا ہے۔ مقدمہ چونکہ زیر سماعت ہے اسلئے ہم اپنی رائے اس واقعہ پر نہیں دے سکتے۔ ہندوستان میں ایسے واقعات اکثر سننے میں آتے ہیں اور پاکیزہ نفس انسان اس سے متاثر ہو کر اسکے انسداد کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلئے خاص واقعہ پر کوئی رائے نہ دیتے ہوئے بھی ہمارا عام طور پر یہ خیال ہے کہ حکومت اور قانون ساز انجمنوں کو ایسے گناہ عظیم کیلئے کوئی سخت سے سخت سزا مقرر کرنا چاہئے تاکہ اس قسم کے حیاسوز افعال میں زیادتی کی بجائے کمی ہو۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں عورت کی عصمت "موتی کی سی آب" قرار دی گئی ہے، عورت کی عصمت و عفت کی حفاظت اسی طرح حکومت پر فرض ہے جس طرح وہ لوگوں کی جان کی حفاظت کرتی ہے۔ ہندوستانی عورت اپنی عصمت کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اس قسم کے درندہ صفت، بدمعاش، نفس پرست، اور آتش شہوت میں دیوانے مردوں کی ایسی حرکتوں سے معصوم اور بےگناہ لڑکیاں ہمیشہ کیلئے تباہ ہو جاتی ہیں، انکی زندگی برباد ہو جاتی ہے، اور یہ گناہگار مرد اپنے اس ہولناک جرم کی سزا چند سال جیل میں کاٹ کر پھر جرم کرنے کو آزاد ہو جاتے ہیں۔

آل انڈیا ویمنز ایسوسی ایشن کو اسطرف خاص طور پر دھیان اور اسی مسئلے کو سامنے رکھکر انتخاب لڑنا۔ عورتوں کے مردوں کو ووٹ دلانا چاہئے، تاکہ جد و جہد کرکے یہ قانون بنوایا جائے کہ نابالغ لڑکی سے زنا بالجبر کی سزا اگر موت نہیں تو ایسی "جسمانی اذیت" ضرور ہونی چاہئے جس سے ایسے گناہگار مرد ہمیشہ کیلئے "بیکار" کر دیئے جائیں۔ نیز اس گناہ کے ملزم کو کسی بھی صورت میں بھاری سے بھاری ضمانت پر بھی عارضی رہائی نہ ملنی چاہئے۔

اور یہ کوئی ایسی نئی وحشتناک سزا بھی نہیں ہے ہمارے یہاں اس قسم کی سزائیں پہلے سے ہی موجود ہیں، اسلامی قانون میں چور کے ہاتھ کاٹ ڈالنے کی سزا موجود ہے، اور دور کیوں جاؤ، قتل کی سزا پھانسی اسوقت بھی دیجاتی ہے۔ کون ایسا پاکیزہ نفس انسان ہے جو اپنی عصمت کو جان سے زیادہ عزیز نہیں رکھتا، بس جب جان لینے پر پھانسی کی سزا دیجاتی ہے تو عصمت پر ڈاکہ ڈالنے والے کی سزا پھانسی سے بھی زیادہ سخت ہونا چاہئے۔ اور جو سزا ہم نے تجویز کی ہے وہ کوئی زیادہ نہیں ہے کہ اسپر اعتراض کیا جائے۔

بی۔ بی۔ سی اردو براڈکاسٹ

ہر روز شام کو سات بجکر چالیس منٹ سے آٹھ بجے تک بھی ۲۰ منٹ کیلئے ہندوستانی پروگرام ہوتا ہے جسمیں خبریں، اور ملاقاتیں ڈرامے وغیرہ بہت کچھ براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔

جہانتک خبروں اور ملاقاتوں کا تعلق ہے ہمیں پسند ہیں۔ لیکن بہت سے پروگرام ایسے بھی ہوتے ہیں جو بالکل غیر معیاری ہوتے ہیں اور جن سے ہندوستانیوں کی ہنسی اڑائی جاتی ہے، بالخصوص اردو دان طبقے کی، مثال کے طور پر ۲۵ راگست کی شام کو ایک جوتشی اور ایک میم کی ملاقات کو ہی لے لیجئے اسمیں جوتشی کا کردار ایسے برے اور بھدے انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ یقیناً ہر سننے والے پر شاق گذرا ہوگا۔

ہم بی۔ بی۔ سی کے ہندوستانی ڈیپارٹمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ اردو دان طبقہ کسی طرح بھی انگریزی دان طبقے سے گرے ہوئے مذاق اور کم معیار کا نہیں ہے، اس کیلئے بھی انگریزی ہی کی طرح معیاری چیزیں پیش کیجائیں۔ ورنہ یہ موجودہ روش اردو دان اردو دان طبقے کی توہین کے مترادف ہے۔

یورپ کی کمزور قوموں کو بچانے کی بات

ہم دن بھر میں کئی کئی بار برطانوی ریڈیو اسٹیشنوں سے یہ سنتے ہیں کہ برطانیہ اسوقت تک چین سے نہ بیٹھے گا جبتک کہ وہ

یورپ کی کمزور قوموں مثلاً پولینڈ، ناروے، بلجیم، ہالینڈ، فرانس وغیرہ کو جنہیں ہٹلر اپنے آہنی پنجہ میں دبوچے بیٹھا ہے آزاد کرائیگا یہ رٹ سن سن کر قدرتی طور پر ہمیں یہ خیال آتا ہے کہ ہمیں بھی تو کوئی اپنے پنجے میں دبوچے ہوئے ہے، ہم بھی تو آزادی کے مستحق ہیں، مگر برطانیہ کو ہماری آزادی کی ذرا بھی فکر نہیں، یا پھر یہ کہ برطانیہ ابھی تک رنگ و نسل کے خبط میں مبتلا ہے اسکے نزدیک یورپ والے انسان ہیں اور آزادی کے مستحق، اور ہم لوگ انسان نہیں ہیں نہ آزادی کا استحقاق رکھتے ہیں۔ یا پھر یہ کہ مشرق کی قوموں کو یورپین قوموں کے مقابلے میں کمزور نہیں سمجھا جاتا —— لیکن یہ خیال خام ہے، ہندوستان فرانس کے مقابلے میں کئی گنا کمزور و قابل ہمدردی ہے۔

جذبات زریں

(از محترمہ زبیدہ زرین صاحبہ گوالیار)

جو سفیدانِ فرنگی کو سمجھتے ہیں امام — کہہ رہے ہیں کہ غلامی ہے مسلماں پہ حرام

فیصلہ شاہی کمیشن کا ہو جن کو منظور — کیا بھلا انکو سیاست کے خم و پیچ سے کام

کوئی یہ قائد اعظم سے تو جا کر کہدے — کہ مسلمان کو زیبا نہیں دینا دشنام

آپ گاندھی کی سیاست کو تو جو چاہیں کہیں — لیکن آزادیٔ نفس کو نہ کریں یوں بدنام

آپ وحدت کا مسلمان کو پیغام نہ دیں — ہر مسلماں ہے حقیقت میں خدا کا پیغام

دل سے برطانیہ عظمیٰ کی پرستش جو کریں — کیسے ہو سکتے ہیں وہ اپنے زمانہ کے امام؟

جذب دینی کو خدا کیلئے پھر زندہ کر — جذب دینی نے الٹ دی ہے بساطِ ایام

جذب دینی کا تقاضہ ہے کہ آزاد رہو — رہتا محکوم نہیں حلقہ بگوشِ اسلام

عافیت کوش مسلماں ہیں اسی سے خائف — کیوں دگرگوں نہ ہو پھر ملت بیضا کا نظام

خاص تنویر کے لئے

از:—
محترمہ حور بانو صاحبہ
نئی دہلی

فائنل امتحان سے پہلے ابراہیم نہ جانے کیا سوچا کرتا تھا۔ "شادی آرام، راحت اور کامیاب زندگی" یہ اس کے خیالات کا بنیادی مطمح تھا۔

دن آئے اور راتیں گذریں۔ ابراہیم امتحان میں کامیاب ہوا۔ بی اے کی ڈگری کوئی معمولی بات نہیں تھی، شادی کے پیغامات آنے لگے، اور اس نے اپنی مرضی کے مطابق شریک حیات منتخب کرلیا۔ ایک سال کے اندر اندر قدرت نے ایک ہنستا کھیلتا بچہ بھی دیدیا۔ الغرض ابراہیم کی تمام خواہشات کی تکمیل ہوگئی۔ لیکن ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور مسرت بخش بنانے کے ذرایع اس کے پاس نہیں تھے۔ ملازمت کی تلاش میں صبح سے شام تک کارخانوں اور دفتروں کی خاک چھانا کرتا، مگر قدرت کو یہی بات پسند نہیں تھی۔

اسی طرح ایک نہیں دو نہیں بلکہ پورے چوبیس ماہ گذر گئے، باپ دادا کی بچی کھچی جائیداد بھی آہستہ آہستہ سکڑنے لگی، ملازمت کی طرف سے ناامید ہوکر ابراہیم کو لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کا خبط ہوگیا۔ وہ ہر مرتبہ یہی سوچتا کہ اب کے ایک موٹی رقم آرہی ہے، لیکن اتفاقی نزول دولت بھی قسمت والوں کے حصہ میں آتی ہے، امید اور مایوسی کی بنیاد پر جیسے اسکی زندگی کی دیوار کھڑی ہو، وہ ہر مایوسی کے بعد امید باندھتا اور ہر امید کے بعد مایوس ہوجاتا۔ بیوی بچوں کا پیٹ پالنے سے ملازمت کی تلاش بھی جاری تھی۔

کچھ دنوں بعد یکایک اسکی قسمت نے پلٹا کھایا، ایک کارخانے میں بیس روپیہ ماہوار کی ملازمت اس شرط پر ملی کہ ایک ماہ تک مفت بڑائی (امتحان) دینی پڑے گی، اس کے پاس ایک ماہ تک کھانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا، پھر بھی مجبوراً اسے یہ شرط منظور کرنی پڑی۔

تیس دن گذر گئے۔ آج اسکی قسمت کا فیصلہ ہونیوالا تھا، شام کو چار بجے ایک لفافہ ملا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا، یقین نہ ہوا، سر میں چکر آنے لگا، بڑی مشکل سے اپنے نڈھال جسم کے بوجھ کو سنبھالتا ہوا گھر واپس آیا۔

حمیدہ نہایت بے چینی سے اسکا انتظار کررہی تھی، آج اس نے نمازیں شوہر کی کامیابی کے لئے خدا سے گڑگڑا کر التجائیں کی تھیں، لیکن یہ کیا؟ ابراہیم چپ چاپ کمرے میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ حمیدہ نے میٹھے لہجہ میں پوچھا:—

"طبیعت اچھی ہے نا؟"

جواب ندارد۔ ابراہیم کے چہرے پر مایوسیاں چھائی ہوئی تھیں، اس کے لئے یہ سوچنا بھی مشکل ہورہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے؟ وہ جتنا غور کرتا مستقبل اتنا ہی تاریک نظر آتا۔ بیوی کا محبت آمیز فقرہ سن کر اسکا دل انتشار اور پریشانیوں کا جولانگاہ بن گیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

حمیدہ سے اب کوئی بات پوشیدہ نہیں تھی، وہ سب کچھ سمجھ گئی، بولی:—

"صبر کو کھونے سے کیا فائدہ؟ خدا بڑا کارساز ہے زندگی دکھ یا سکھ سے بسر ہو ہی جائے گی۔"

یہ کہکر حمیدہ نے گود کی مسکراتی ہوئی بچی کو اس کی طرف بڑھا دیا، ابراہیم کا جیسے سارا غم دور ہوگیا، تسکین کے پھول جیسے نازک رخسار پر اس نے اپنے ہونٹ رکھ دئے۔ محبت کرنیوالے خاندان کی یہی عجیب دنیا ہوتی ہے۔

رات کو یکایک تشکیلہ نے چیخ کر دی۔ حمیدہ کی آنکھ کھل گئی، بچی کو گود میں اٹھاتے ہی وہ چونک پڑی، تشکیلہ کا جسم توا جیسا تپ رہا تھا، اور پھیپھڑے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ حمیدہ نے ابراہیم کو جگایا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا، کلی سے بھی زیادہ نازک تشکیلہ کی نگاہیں باپ کی طرف لگی ہوئی تھیں، ابراہیم نے حمیدہ سے پوچھا:۔

"کیا بات ہے ؟ ۔"

جواب میں حمیدہ رو پڑی، ابراہیم نے تشکیلہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کچھ توقف کے بعد بولا :۔

"افسوس ! یہ دنیا تاریک نظر آ رہی ہے ۔"

حمیدہ چپ چاپ اٹھی اور صندوقچی سے پارکر کا قلم نکال لائی، یہ قلم ابراہیم نے حمیدہ کو تحفہ کے طور پر دیا تھا۔

"اسے بیچ کر میری تشکیلہ کو بچا لو پیارے ! ۔" کہہ کر حمیدہ نے اپنی اداس آنکھیں تشکیلہ کے چہرے پر گڑا دیں۔

تھوڑی دیر بعد شہر کا وہ سب سے گندہ محلہ موٹر کی پوں پوں سے گونج اٹھا، ڈاکٹر نے تشکیلہ کا معائنہ کیا۔ انجکشن دیئے لیکن وہ تشکیلہ کی ہچکی کو ہمدم ہونے سے نہ روک سکے۔

حمیدہ کی دنیا اجڑ چکی تھی۔ اب تک اس کے پاس تھا سکون اور سکھ کا ایک ہی ذریعہ .... تشکیلہ .... لیکن قسمت نامہربان نے اب اسے بھی چھین لیا تھا۔ یہ ضرب شدید حمیدہ کی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے کافی تھی۔ حمیدہ کی صحت دن بدن خراب ہونے لگی اور ایک دن وہ تپ دق جیسی مہلک بیماری کے زیر سایہ آ گئی۔

پاس کی پونجی ختم ہونے کے بعد دو چار فاقے بھی ہو گئے تھے۔ بیچارا ابراہیم کیا کرتا، چوٹ پر چوٹ کھا کر اس کا دماغ ماؤف سا ہو گیا تھا۔ اس نے کوشش کر کے حمیدہ کو شہر کے خیراتی ہسپتال میں بھرتی کرا دیا۔ لیکن جس کی حیات کے دن ختم ہو گئے ہوں اس کا کیا علاج۔ حمیدہ نے ہسپتال کے اسٹیچر پر ہی دم توڑ دیا۔ اب ابراہیم دنیا میں اکیلا رہ گیا تھا۔

انسان دست قدرت کا محتاج ہے۔ حوادث روزگار اسے سب کچھ برداشت کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جو حمیدہ بہترین رفیقۂ حیات تھی، اسی حمیدہ کو ابراہیم نے چیتھڑے کے کفن میں لپیٹ کر سپرد خاک کر دیا۔

قبرستان سے واپس آنے کے بعد اسے ایک رجسٹری خط ملا تھا۔ کھول کر دیکھا، پندرہ ہزار کی لاٹری۔ مگر اب کیا ؟ ۔ اس کے مژگانِ خونچکاں کے درمیان سے آنسو کے دو قطرے ٹپک کر زمین پر چمکنے لگے اور آنسو کے ان قطروں میں حمیدہ اور تشکیلہ آہ و زاری کرتی ہوئی نظر آئیں۔

پیام

یہ نہ کہنا زندگی مرجھا گئی
اور دن شیریں امیدوں کا گیا
جبتک اس دل میں محبت ہے تیری
یہ چراغ حسن جلتا جائیگا

یہ نہ کہنا حسن افسانہ ہوا
گرچہ پہلی سی وہ رعنائی نہیں
مستقل دلکش ترانہ عشق کا
تجھ کو رکھے گا یوں ہی دائم حسیں

حسن رفتہ کا ترے اک شائبہ
مجھ کو اوروں سے کہیں مطلوب ہے
ایک سے بڑھ کر اک آئے ساحرہ
تو ہی شاید کو میری مطلوب ہے

(میراجی)

دل شکیبا بھی بے قرار بھی ہے
بیخودی بھی، خیال یار بھی ہے

لطف سامان عتاب یار بھی ہے
مجرم عشق شرمسار بھی ہے

خود کو کر غرق نور بھی لیکن
زندگی اکتساب نار بھی ہے

خلوت حسن و عشق بھی ہو اداس
سرد کچھ بزم روزگار بھی ہے

کون ترغیب ہوش دے، کہ جنوں
بیخبر بھی ہے ہوشیار بھی ہے

تابہ کے ماتم جراحت غم
زندگی تیغ آبدار بھی ہے

سست پیمان و بے نیاز سہی
حسن تصویر انتظار بھی ہے

کیا کرے وہ نگاہ لطف، کہ عشق
شادماں بھی ہے سوگوار بھی ہے

اپنی تقدیر اپنے ہاتھ میں لے
شامل جبر اختیار بھی ہے

گلشن عشق ہوں، خزاں میری
وجہ رنگینی بہار بھی ہے

عقدۂ غم گو تو نہیں سمجھا
یہی عقدہ کشودکار بھی ہے

عشق ہجراں نصیب کا بھی ہے دھیان
ترے وعدے کا اعتبار بھی ہے

دل سے ہے دور بھی نگاہ تری
دل کے اندر بھی دل کے پار بھی ہے

ان نگاہوں میں ہے شکایت سی
عشق شاید جفا شعار بھی ہے

آپ اپنا چڑھاؤ، اپنا اتار
زندگی نشہ ہے خمار بھی ہے

اس میں لاکھوں نظام شمسی ہیں
زندگی تیرہ روزگار بھی ہے

عشق کو بھی ہوئی نہ جن کی خبر
ان جفاؤں کا کچھ شمار بھی ہے

سن کبھی ہو کے گوش بر آواز
کچھ پیام سکوت یار بھی ہے

دیدنی ہے بہار لالہ و گل
جو شگفتہ ہے دل فگار بھی ہے

اس کی ضو اس کی گرمیاں مت پوچھ
زندگی نور بھی ہے نار بھی ہے

عشق کی زندگی و موت نہ پوچھ
سر دنیا ، تہ مزار بھی ہے

رنگ و بو کے اگر نہ دھوکے کھائیں
جس کو کہئے خزاں بہار بھی ہے

عشق ہی سے ہیں منزلیں آباد
کارواں کارواں پکار بھی ہے

کوئی سمجھا اسے نہ دیکھ سکا
نگہ شوخ شرمسار بھی ہے

اس سے چھٹ کر یہ سوچتا ہوں فراق
اس میں کچھ اپنا اختیار بھی ہے

خواتین ہند کیلئے قابل توجہ مضمون

از:- جناب نانجی کالیداس مہتہ صاحب (یوگنڈا)

[ہماری محترم بہن فاطمہ ہاشم اسمٰعیل نے اپنے قیام افریقہ میں، ہندوستانی عورتوں میں بیداری اور بہبودی کے لئے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کی استدعا پر قابل مضمون نگار نے یہ خط آپ کو لکھا تھا، جو اس قابل ہو کہ ہر ہندوستانی عورت اسے بغور پڑھے اور اپنی حالت کے متعلق سوچے۔ اور اپنے مستقبل کو سدھارنے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھائے۔ کیونکہ اس کے مستقبل پر قوم کے مستقبل کا انحصار ہے۔ (مدیرہ)]

نہایت محترم بڑی بہن صاحبہ کی خدمت میں وندنا

آپ کا عنایت نامہ ملا، پڑھکر خوشی ہوئی۔ ماتاؤں کو پیغام دینا ایک وِدوان کا کام ہے، مجھ جیسے کسان کے پاس سرسوتی دیوی کے رہنے کی جگہ کہاں؟ ہند کی عورتوں کی حالت دیکھ کر دکھ کے مارے سمندر سی موجیں دل میں اٹھتی ہیں اور پھر سما جاتی ہیں، عورت دنیا کی شکتی کی جنم داتا ہے، جتنا بخشے اتنا دنیا آگے بڑھ سکتی ہے، ورنہ جس طرح برسات کے پانی بغیر جھاڑ اور ہریالی سوکھ جاتی ہے اور سوکھا جنگل رہ جاتا ہے اسی طرح انسان کی زندگی بھی خشک رہ جائے۔

مائیں جس وقت مسرت سے ہنستی ہیں تو دنیا پر جنت اتر آتی ہے اور جب وہ دکھی ہوتی ہیں تو دنیا دوزخ بن جاتی ہے، آج میرے ملک کی ماتاؤں کی حالت دکھیاری اور کچلی ہوئی ہے، اس لئے ہند مصیبت کا مارا افلاس کا ستایا ہوا، جھگڑے فساد میں پھنسا ہوا اور غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے، آج ہند کی استری جاتی کی انتی کے لئے ہر ایک ودوان کو اپنا اپنا حصہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہر ایک مذہبی کتاب میں یہی لکھا ہے کہ "ایک ماتا ایک سو گروؤں سے بڑھ کر ہے"

یورپ، امریکہ کی عورتیں آج اپنے ملک کی بہبودی میں کیسا ساتھ دے رہی ہیں؟ لڑائی ہو یا امن ہو، آفسوں میں، فیکٹریوں میں، ٹرام اور بسوں میں، ہسپتالوں میں اور دکانوں میں جہاں دیکھو گے وہاں عورتیں ہی عورتیں پوری طرح ملک کا ساتھ دیتی اور ہاتھ بٹاتی نظر آئیں گی۔ ذرا ان کے بچوں کی تعلیم تو دیکھو! ان میں تہذیب ہے۔ میٹھی زبان ہے۔ کسی کی جھوٹی غیبت چغلی نہیں ہے نہایت پاکیزہ ہنسی خوشی اور کھیل کود بھرا رہنا سہنا ہے!

۱۹۳۶ء میں میں جب جاپان گیا تو میری پتنی جی بھی میرے ساتھ تھیں، چین اور جاپان کی لڑائی ہم پہونچے ہی تھے کہ شروع ہو گئی۔ ایک ایک ماتا اور ایک ایک بچہ سورج کی نشانیوں والا اپنے دیس کا قومی نشان لیکر ابھر آئے اور اپنے خاوندوں، جوان بیٹوں کو ساتھ لے کر دور دور سے ہفتہ بھر کا کھانا ساتھ باندھکر اپنی پیاری سی پیاری چیزوں کو مادر وطن کے قدموں پر قربان کرنے کے لئے چھاؤنیوں میں ایک دوسرے کے اوپر گری پڑتی تھیں۔ جس ماتا کے پتی یا پتر کا نام پہلا آتا وہ مارے خوشی کے اچھل پڑتی اور اپنے آپ کو سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھتی۔ شوہر جب میدان جنگ میں جانے لگتا تو اس سے کہتی کہ "ملک کے لئے فتح پاکر آؤ تب ہی بھرکے میری دعائیں پاؤگے، ہار کے آئے تو ابھی سے جو آشیرواد میں دونگی

وہ اکارت جائیگا! لیکن جان کی سلامتی کی خاطر ایک ایک رکھشا جسے ہمارے ملک میں "راکھڑی" کہتے ہیں ہر ایک بہن اپنے بہادر بھائی کے ہاتھ میں باندھ دیتی۔ جب خاوند یا بیٹا میدان جنگ میں مرتا اور اسکی نعش واپس آتی تو گھٹنوں کے بل گر کے ہر ایک ماں، جورو، بہن اس کے پاؤں پڑتی اور پکارتی کہ "میرے دیس کو اُجول کیا"۔

اس ملک کے ماتاؤں کی شکتی دیکھ کر میں دنگ رہ گیا ہوں اور ہمیشہ میرے دل میں یہی خواب آتے رہتے ہیں کہ جاپان کی ترقی کرانیوالی اور جاپان کی عزت بڑھانیوالی کوئی ہستیاں ہیں وہ جاپان کی مائیں ہیں۔ اس ملک کی عورتوں میں جتنا جسم اور کام کرنے کی چستی ہے اتنی کسی اور ملک کی عورتوں میں نہیں، شائستگی سے تواں ہیں۔ سیوا بھاؤ سے تواں ہیں، ایثار و قربانی کا مادہ سے تواں ہیں۔ تکلیف برداشت کرنیکی طاقت سے تواں کی! غرضکہ ان کے ہاتھ سونے کے ہیں جنہوں نے ملک کو مالا مال کر دیا۔ وہ انکھنے سخت کام کرتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں تو گپیں ہانکنے اور غیبت کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ اسی لئے تو ہم اپنے غریب دیس کے سر پر بوجھ بنے پڑے ہیں۔ دیگر جاپان میں بڑے بڑے کروڑپتی کے گھر میں بھی فرنیچر وغیرہ کچھ دکھائی نہیں دیتا اور وہ لکڑی کے گھروں میں رہتے ہیں، نیچے زمین پر چٹائی ڈالکر سوتے ہیں۔ اس ملک سے جیسا صفائی ستھرائی والا دوسرا کوئی ملک نہیں، پاکیزگی میں اس ملک کا نمبر پہلا ہے۔ وہ اپنا گھر انگنائی وغیرہ حد درجہ صاف رکھتے ہیں برعکس ان کے ہمارے لوگ بالکل گندے رہتے ہیں۔

اس لئے اگر ہندوستان کو ترقی کی چوٹی پر پہونچانا ہو تو تم کو جاپان کی ماتاؤں جیسا علم اور طاقت پیدا کرنا چاہئے، تب ہی جا کے نکمی کمزور پرجا پیدا ہونا بند ہوگی اور ہند ماتا کی ترقی ہوگی۔ چوڑے سے لگے پاس بیٹھے رہنے سے، اونچی ایڑی کے بوٹ پہننے سے یا پاؤڈر لگا کر ہاتھ میں پاکٹ جھلاتے سینماؤں میں جانے سے یا ٹاپ ٹیپ، بناؤ سنگار کرنے سے دیس کی اُنتی ہونے کی نہیں اور میری التجا ہے کہ تمہاری ترقی تمہارے بھیتر میں ہے۔ اس کو باہر لانے کے گن تم میں پیدا ہوں اور جنت نشان ہندوستان پر خدا رحم کرے اور ہند کی ماتاؤں کا مسئلہ پہلے حل ہو اور ملک ہند کے موافق ان کو تعلیم ملے اور مغرب کی اندھا دھند تقلید نہ کی جائے، اور مادر ہند مغرب کا پھینکا ہوا کوڑا کرکٹ نہ اٹھائے بلکہ اس سے دور بھاگے اور ہند کی عورتیں آدرش ماتائیں بنیں! آمین۔

ماتاؤ! تمہاری دن بدن زیادہ ترقی ہو جس سے ملک ہند طاقت اور صاحب عقل پرجا پیدا کرے اور آخر ملک کو غلامی سے نجات ملے۔

آپ نے جو خدمت کا جھنڈا اٹھایا ہے اس کیلئے آپ کو میں "دھنواد" دیتا ہوں۔

راقم:- بھائی نانجی کالیداس

ساز تنہائی

خاص تنویر کیلئے

(از جناب سید طالب علی صاحب عابد ایم اے الہ آبادی)

آئینہ کیوں بنی ہو تم پیاری ۔ مخملو سرے ڈھلک چلی ساری
لو سناتا ہوں ساز تنہائی ۔ کھل ہی جائے گا راز تنہائی
بیس سال اس طرف کا ہے قصا ۔ میں جواں تھا جوان تھی دنیا
فارسی کا مجھے تھا شوق کمال ۔ بچپنے سے تھا اس کا ذوق کمال
ختم تھی انتہا کی درسیات ۔ فارسی بن گئی تھی قندِ حیات
تھا کتابی جو علم کا دریا ۔ بے تکلف نہ بول سکتا تھا
گو پڑھی تھی جدید ایرانی ۔ پر فصاحت نہیں تھی امکانی
چند ایرانیانِ باتمکین ۔ شہر میں آکے ہو گئے تھے مکیں
قالی بافی کا کارخانہ تھا ۔ جن کا گرویدہ ایک زمانہ تھا
تھی کشش ایسی ذوقِ فطری کی ۔ دوستی مجھ سے ہو گئی گہری
روز جاتا تھا میں بلاناغا ۔ وقت اکثر وہیں گذرتا تھا
دن ہو یا رات صبح ہو یا شام ۔ میں تھا اور ان کی صحبتیں تھیں مدام
رفتہ رفتہ کچھ ایسا ربط بڑھا ۔ داخل اہلبیت میں بھی ہوا
عورتوں نے اٹھا دیا پردا ۔ گھر میں بے روک ٹوک جانے لگا
زاہدہ ایک ان کی دختر تھی ۔ مجھ سے پڑھنے لگی وہ انگریزی
اس نے چودہ بہاریں دیکھی تھیں ۔ خاتم حسن کی بنی تھی نگیں
لاکھوں میں نے حسین دیکھے ہیں ۔ خوش ادا مہ جبین دیکھے ہیں
تھا مگر اس کا حسن سب سے جدا ۔ آپ اپنا جواب تھی گویا
دلکش و دلربا تھا ہر انداز ۔ فلک ناز تھی وہ مہر نیاز
حسن ایسا مگر غرور نہ تھا ۔ الھڑ ایسی تھی کچھ شعور نہ تھا

نشۂ صحت و شباب میں چور — وسمہ و غازہ و کریم سے دور
ورس نے رنگ اب نیا بدلا — ہو گیا ایک دوسرے پہ فدا
دونوں تھے انتہا کے دیوانے — کون عاشق ہے کوئی کیا جانے
عقد کا میں نے جب پیام دیا — مسکرا کر احد نے مجھ سے کہا
دل سے یہ بات ہے ہمیں منظور — پر ہمارے یہاں کا ہے دستور
باپ لڑکے کا خود سوال کرے — تا کہ دونوں طرف سے غنچہ کھلے
کشمکش میں پڑا میں یہ سن کر — شمع ساں جل بجھا میں سر دھن کر
باپ تھے میرے انتہا کے نجیب — سربر آوردہ اور وکیل و خطیب
پیار کرتے تھے جان و دل سے مجھے — میری مرضی کا دھیان رکھتے تھے
دے چکے تھے مگر پھوپھا کو زباں — شادی میری کرینگے ان کے یہاں
اپنے وعدے کے تھے بڑے پکے — چاہے سر جائے بات رہ جائے
آخرش دل میں تھا مرے جو نہاں — بے کم و کاست کر دیا وہ بیاں
کر دی ظاہر تمام مجبوری — ہوئی مقبول میری معذوری
صاف یہ میں نے کر لیا وعدہ — سال بھر بعد راز ہو افشا
چپکے چپکے ہوئی میری شادی — مل گئی مجکو خانہ دامادی
دس مہینے ہوتے بسر ایئے — رہتے ہوں ہم بہشت میں جیسے
والد محترم ہوئے اک بار — سیر اعراق کے لئے تیار
میرا انکار بڑھتا جاتا تھا — ان کا اصرار بڑھتا جاتا تھا
نہ چلی جب میری کوئی تدبیر — رکھ دی میں نے بھی ہاتھ سے شمشیر
روح فرسا بیاں ہے رخصت کا — یاد اب تک سماں، ہے رخصت کا
پانچواں ماہ اس کے حمل کا تھا — ساتھ کس طرح اس کو لے جاتا
جانے کیا دونوں کہتے جاتے تھے — اشک آنکھوں سے بہتے جاتے تھے
کہتی تھی میں چلوں گی بن کے کنیز — اصلیت کی نہ ہونے دوں گی تمیز
ہے جو تشویش راز کھلنے کی — تم نہ آنا میرے قریب کبھی
دور سے دیکھ لونگی جی بھر کر — کچھ تو بہلے گا یہ دل مضطر

کہتی جاتی تھی روتی جاتی تھی　　سلک گوہر پروتی جاتی تھی

میری ہمت مگر نہ پڑتی تھی　　بجلی گرتی جب آنکھ لڑتی تھی

تھک گئی ہر طرح سے جب کہہ کر　　حالت اس کی ہوئی بہت ابتر

رنگ رخ زرد ہوتا جاتا تھا　　جسم سب سرد ہوتا جاتا تھا

لب پہ کلمے تھے یاس کے جاری　　کانپتی جا رہی تھی بے چاری

کہتی تھی اب میں گئے روز جزا　　بخشدو مجھ سے جو ہوئی ہو خطا

تم یہاں لوٹ کر جب آؤ گے　　دیکھ لینا مجھے نہ پاؤ گے

ہو کے رخصت میں گھر سے یوں نکلا　　آپ اپنا ہی بن گیا لاشا

لوٹ کر چار ماہ پر آیا　　کیا کہوں کیا فلک نے دکھلایا

عمر بھر کے لئے ہوا مغموم　　ساس سے اپنی یہ ہوا معلوم

ہر گھڑی میری یاد رہتی تھی　　نام لے لے کے میرا کہتی تھی

ہم تو جاتے ہیں اب خدا حافظ　　رہے اللہ آپ کا حافظ

میرے آنے سے چار دن پہلے　　ساتھ پیدا ہوئے تھے دو بچے

دونوں تھے موٹے تازے اور حسین　　دو برابر کے جس طرح ہوں نگیں

ایک شب بھی مگر نہ گزری تھی　　ساتھ ہی موت آئی تینوں کی

سن کے یہ حال کھو گیا میں تو　　نیم مجنوں سا ہو گیا میں تو

روز و شب دو مہینے میں رویا　　ایک پل کے لئے نہیں سویا

گاہ اٹھتا تھا گاہ گرتا تھا　　رات بھر چاندنی میں پھرتا تھا

دانت سے کاٹتا تھا جب بوٹی　　تب تسلی ذرا سی ہوتی تھی

بیس سال اس کو ہو گئے ہیں مگر　　دل مضطر ہے اب بھی نوحہ گر

اب بھی خون جگر میں پیتا ہوں　　سانسیں لیتا ہوں اور جیتا ہوں

پاس اولاد بھی ہے دولت بھی　　سب ہیں سامان عیش صحت بھی

پر عجب طرح کی ہے تنہائی　　نہ کوئی غم ہے اور نہ کوئی خوشی

بس اسی آس پر ہوں اب زندہ　　وہ تھی سچی ملے گی روز جزا

ٹھنڈی سانسیں نہ اب بھرو پیاری
آنکھیں پونچھو سنبھال لو ساری

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

افراد

برج نارائن —— ایک معمولی وید
لچھمی بائی —— برج نرائن کی استری
وسنت —— برج نرائن کا بڑا لڑکا۔ نوجوان کالجیٹ
مدھو —— منجھلا لڑکا
سہاسنی —— مدھو سے چھوٹی بہنیں عمر
سنالینی —— ۱۱ و ۸ سال
کیلاش —— سب سے چھوٹا لڑکا عمر ۵ سال

منظر ۱۱ (ایک معمولی سادہ دومنزلہ مکان۔ نیچے دواخانہ اوپر رہائشی کمرے، صبح کا وقت ایک کمرے میں وسنت سو رہا ہے، رسوئی میں تمام بچے اور لچھمی بائی ناشتہ کے لیے تیار ہیں، کمرہ میں دھواں بھرا ہوا ہے اور لچھمی بائی آگ پھونک رہی ہے نیچے دواخانہ میں ویدجی کوئی رسائن کی کتاب کا مطالعہ کر رہے ہیں۔)

لچھمی بائی اری سہاسنی ذرا سنالینی کے ایک تھپیڑ تو لگا۔ کب سے کہہ رہی ہوں کہ دودھ لے آ مگر وہ سے پڑی اینڈ رہی ہے، ایک تو کمبخت لڑکیاں۔ (جلدی میں لکڑیوں کو لڑکیاں کہتی ہیں سب ہنستے ہیں مگر ماں کی انگارہ سی آنکھیں دیکھ کر خاموش ہو جاتے ہیں)

سہاسنی (تھپیڑ مارتے ہوئے) اودی ساسنی کی کچی جاتی کیوں نہیں دودھ لینے کو ——!

سنالینی (روتے ہوئے) جاؤ ہم نہیں جاتے، جب دیکھو مارتی ہے۔ ایشور کرے مرے سہاسنی، اسکی ارتھی نکلے!

سہاسنی۔ (ایک اور تھپیڑ لگاتی ہے)، لے کوس اور کوس!

سنالینی۔ (اور زور سے روتی ہوئی) ایشور کرے تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ ناگ ڈسے تیرے ہاتھوں کو!

مدھو۔ (سنالینی سے) چپ رہتی ہے کہ لوں لکڑی، چل جا دودھ لے آ!

سنالینی (روتے ہوئے) آں آں ہم نہیں جائیں گے، مار کیوں ہم کو؟

مدھو۔ نہیں جائیگی؟ —— سنالینی۔ نہیں! ——

(مدھو مارنے کو اٹھتا ہے اور سنالینی بھاگتی ہے اور کمرے اچھے خاصے ریس کورس بنجاتے ہیں، ادھر سنالینی بھاگتے ہوئے برتنوں پر گرتی ہے اور مدھو سہاسنی سے ٹکراجاتا ہے اور غصہ میں ایک طمانچہ سہاسنی کے رسید کر دیتا ہے —— شور شغب سے وسنت کی آنکھ کھل جاتی، لیکن وہ چپ چاپ پڑا رہتا ہے)

مدھو۔ کیوں بیچ میں کھڑی ہے اب؟

سہاسنی (روتے ہوئے) ہاں ہاں ہم تو ایسے ہی کھڑے رہینگے جاؤ کیا کرلوگے؟

مدھو۔ ہیں، زبان چلاتی ہے (اور مارتا ہے، سنالینی بھی مارتی ہے دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں، لچھمی بائی ہاتھ میں چمٹا لئے ہوئے

لہ وہ لمدنی جسے گا کرہند و مائیں صبح اپنے بچوں کو جگایا کرتی ہیں۔

دوڑتی آتی ہیں)

لچھمی بائی - (مدھو کو چمٹے سے مارتے ہوئے) بچے مارے ڈالتا ہے لڑکی ذات کو۔ ارے وہ تجھ سے دو برس چھوٹی ہے تیرے کوئی یوں گھونسے مارے تب پتہ چلے!

مدھو - (جھٹکا پکڑتے ہوئے) ماتاجی تم ہی نے بگاڑا ہے ان سب کو!

لچھمی بائی - لو اور سنو- ہاں میں نے بگاڑا ہے میری بیٹری ہے تیری نہیں ہے۔ تیرے گھر مانگنے آئے تو مت دیجیو کھانے کو!

مدھو - آخر ہیں نا وہی گنوار پنے کی باتیں۔ ان پڑھ ہونا!

لچھمی بائی - کہنا اپنے پتا سے! سے آئیں کوئی لکھی پڑھی گیانی۔ ان پڑھ مورکھ سے کیوں دواہ کیا، لو اور سنو۔ کلجگ ہے کلجگ۔ اپنی پیٹ کی اولاد ہی لیٹ لوٹ کے کہتی ہے سچ ہے........ کچھ کہتے کہتے رک جاتی ہیں سنالینی کے کان اینٹھ کر۔ اری بدذات تو گئی نہیں۔ چل نکل جا اپنے پتا سے پیسے لیکر دودھ لے آ۔ دیکھ سنبھال کے لانا گرانا مت (سنالینی روتی ہوئی چلی جاتی ہے)

مدھو - دیکھ سہاسنی خبردار جو مجھ سے بات کی آج سے!

سہاسنی - کرتا کون ہے تجھ سے بات تو ہی تو مجھ سے بے شرم بن کے مجھ سے بات کرتا ہے!

مدھو - دیکھو ماتاجی۔ اپنی لاڈلی کو چپ کرالو ورنہ منہ توڑ ڈالونگا!

سہاسنی - اور میں کیا چھوڑ دونگی؟

لچھمی بائی - چپ رہتی ہے کہ نہیں کلکنی کہیں کی، میرا تو سینہ پکا ڈالا۔ بھگوان کسی کو ایسی اولاد نہ دے۔ انہیں دیکھو کہ بس بیٹھے ہوئے ہیں نیچے۔ یہ نہیں کہ بچوں کو پاس بلا کر سمجھائیں کچھ ادب تمیز سکھائیں (آگ پھونکنے لگتی ہیں، سہاسنی منہ پھلائے لیٹ جاتی ہے۔ مدھو منہ دھونے لگتا ہے)

لچھمی بائی - ائے سہاسنی کہاں مرگئی۔ اتنا نہیں ہوتا کہ ذرا چھوٹے بھائی کا منہ دھلادے دیکھ تو کلو (کیلاش) کیسی ناک بہہ رہی ہے ارے........ ارے مورکھ آستین سے مت پونچھ کل ہی کپڑے دھو کر پہنائے ہیں، میرے تو ہاتھ ٹوٹ گئے کپڑے دھوتے دھوتے! اری سہاسنی او سہاسنی اری میں کیا کہہ رہی ہوں، بھائی کا منہ دھلانے نہیں اٹھتی؟ آؤں اب میں کیا؟ (اتنے میں سنالینی دودھ لیکر آتی ہے اور ماں کو دیتی ہے)

لچھمی بائی - اری بچی یہ دودھ ہے یا پانی، انگلی پر تو بوند نہیں ٹھیرتی چلے کیا بھنگی ماں کی ------؟ کہہ رہی تھی اتنی دیر سے کہ جا کر لے آ جلدی سے صبح اچھا ملتا ہے۔ آخر اتنی دیر میں گئی اس نے پانی ملا دیا۔ تم لوگوں کی نیند سے ایشور بچائے۔ جبھی تو گھر میں لچھمی کی صورت نہیں دکھتی! آٹھ بجنے آئے آٹھ ہونے کو آئے اور لوگ سو رہے ہیں ابھی تک! (وسنت چپ چاپ اٹھ کر منہ دھونے چلا جاتا ہے) اے سنالینی ذرا کلو کے ہاتھ پر پانی ڈال دے وہ منہ دھوئے گا۔ (سنالینی بالٹی میں لوٹا ڈبا دیتی ہے اور کلو کے ہاتھوں پر پانی ڈالنے لگتی ہے کلو بھی منہ چپڑ لیتا ہے) سب لوگ چولہے کے آس پاس جم جاتے ہیں اور للچائی نظروں سے چائے کی دیگچی کو تکنے لگتے ہیں!

کلو - ماں ------ میں تو پھول والے کٹورے میں پیوں گا۔ (مدھو کے سامنے رکھا ہوا پھول والا کٹورا اٹھا لیتا ہے)

مدھو - چل ہٹ! بڑا آیا پھول کے کٹورے میں پینے والا (کلو کے ہاتھ سے کٹورا چھین لیتا ہے)

کلو - (چیخیں مار کر روتے ہوئے) "میرا کٹورا دے"

لچھمی بائی "ارے دے بھی ہے، بچہ مت بن مدھو!"

مدھو - مجھے چائے دو ------ زیادہ بات مت کرو!

لچھمی بائی - اُفّو! اے کلو بیٹا تو اس پیالے میں پی لے۔ دیکھ تو کیسا اجلا اجلا سفید ہے۔ (کلو نہیں مانتا بدستور روتا رہتا ہے)

پھمی بائی ۔ (مدھو سے) لے دے بھی دے لڑکے ۔ کیوں رلا رہا ہے کلو کو ۔

(مدھو کچھ جواب نہیں دیتا)

(پھمی بائی اٹھتی ہیں اور کپڑوں کی پیٹی میں سے ڈبل روٹی کا ٹکڑا نکال کر لاتی ہیں اور کلو کو خاموش کراتی ہیں پھر سنالینی کی طرف متوجہ ہو کر)

"اری تو نے منہ کیوں نہیں دھویا ۔ یونہی بن منہ دھوئے نکلنے بیٹھ گئی جا منہ دھو، اور دیکھ اپنے بابا کو ناشتہ کیلئے کہہ دے ۔ (سنالینی اٹھ کر جاتی ہے وسنت کھرا پلنگ کی چادر سے منہ پونچھتا ہوتا ہے)

مدھو ۔ ارے کلو! وہ دیکھ وسنت بھیا تیرے لئے کیا لائے ہیں ۔ (کلو وسنت کی طرف دیکھتا ہے ۔ مدھو جھپٹ ڈبل روٹی میں ایک ٹکڑا توڑ لیتا ہے مگر کلو دیکھ لیتا ہے)

کلو ۔ (روتے ہوئے) ماں مدھو نے میری ڈبل روٹی لے لی!

پھمی بائی ۔ "جانے دے بیٹا وہ تو دودھ پیتا بچہ ہے ۔ لے تو خواہ مخواہ بچوں کو چھیڑنے میں مزہ آتا ہے

مدھو ۔ چائے والے دیتی ہو یا پھینک دوں پیالہ ؟

پھمی بائی ۔ ارے کد مے رنگ بھی ست نکلنے دے (جلدی میں چائے کی گرم دیگچی بغیر "صافی" کے پکڑ لیتی ہیں ۔ ہاتھ جلتا ہے اور دیگچی چھوٹ جاتی ہے ۔ سب گرم گرم چھینٹوں سے تلملا اٹھتے ہیں اور ایک کہرام سا مچ جاتا ہے ۔ پھمی بائی مدھو کو مارنے اٹھتی ہیں" بڑے اب اٹی پینا" ۔

مدھو ۔ میں نے کیا کیا! کلو نے تو دھکا دیا ۔

کلو ۔ نہیں ماں میں نے کچھ نہیں کیا!

(سنالینی آتی ہے)

سنالینی ۔ "اماں ابا آرہے ہیں ناشتہ کے لئے"!

پھمی بائی ۔ "اب انہیں کیا پلاؤں گی ۔۔۔۔ خون اپنا!" ۔ یہ سہاسنی کہاں مر گئی؟ (سہاسنی کو مارنے دوڑتی ہیں اور پھر جاگم دوڑ شروع ہو جاتی ہے) ادھر کلو اور سنالینی دیگچی میں تھوڑی سی بچی ہوئی چائے پر لڑنے لگتے ہیں ۔ وسنت کپڑے بدلتا ہے ۔ کتابیں لیتا ہے اور چل دیتا ہے ، زینہ پر برج نرائن ملتے ہیں ۔

برج نرائن ۔ کیوں بیٹا ۔۔۔ کالج کا وقت ہو گیا؟

وسنت ۔ جی پتا جی!

برج نرائن ۔ ناشتہ کر لیا؟

وسنت ۔ جی پتا جی ۔۔۔۔ (برج نرائن اوپر اور وسنت نیچے جاتے ہیں ۔۔۔۔ وسنت کو سڑک پر برج نرائن کی غصیلی آواز سنائی دیتی ہے ۔۔۔۔ وہ جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہے اور دل میں سوچتا ہے کہ "اوہ آج تو منگل ہے ، منگا تر اینج بیریڈ [illegible] ہیں ، بھوک کے مارے دم نکل جائے گا")

(ڈراپ سین)

برس رہی ہیں نگاہوں سے ملگجی کلیاں! خیال نے مجھے بخشی ہیں یاد کی گھڑیاں!
سرِ تنک خندۂ طفلی اچھالنا ہے مجھے! فسانہ "دھر کے سانچے" میں ڈھالنا ہے مجھے!

یہ عزم اور یہ بیداریٔ خیال مری!
یہ منتہائے نظر اور یہ مجال مری!

یہ سوچتا ہوں کہ ہے اپنی زندگی گل ریز! حیات کا فقط احساس ہے نشاط انگیز!
شگوفے صبح کے پروردۂ بہارِ نشاط! رگوں میں جنبش سی آیا ہے اک خمارِ نشاط!
دفورِ ناز سے بیگانۂ امید و ہراس! وہ ماہتاب، سے چہرے وہ اجلے اجلے لباس!
وہ شیروانی، وہ مغلر، وہ کوٹ کے کس بل! نظر میں "جنبشِ ناداں" قدم میں اک ہلچل!
وہ شام زلف میں نگینیاں سمائی ہوئی! جوانی، "عارضِ طفلی" پہ مسکرائی ہوئی!
حیات، نغمۂ آزادی میں چھلکتی ہوئی! ضیائے علم سے پیشانیاں دمکتی ہوئی!
بنی ہے. نغمۂ دل "جنبشِ خیال" کہیں! اتر رہی ہے سبو میں "مئے جمال" کہیں!
سرور و لطف، وہ کیفِ نشاط رامش و رنگ! "قبائے زیست" بھی محسوس ہو رہی ہے تنگ!

رواں ہے "نبضِ عدم" میں بھی میرا خونِ وجود!
دواں ہیں میرے تخیل سے آگے میرے حدود!

پڑا ضمیر پہ یہ "عکسِ بیخودی" جس دم! اٹھی "نقابِ تمنائے عارضی" جس دم!
تو زلزلہ میں تھا یہ "قصرِ آرزو" یہ ہم! سیاہ ہوگئی "دنیائے رنگ و بو" اس دم!
یہ دیکھا "صاحبِ دولت" ہیں موٹروں پہ رواں! ہزار پیچ سے "کھاتا ہے سگرٹوں کا دھواں!

وہ بزم رقص، وہ نغمے، وہ لطفِ گردشِ جام! | "وہ آستان غلامی" پہ سر بسجدہ دوام!

یہ "کسب علم" کی تصویر اپنی محفل ہیں!

ہزار "تیر ندامت" اتر گئے دل ہیں!

انھیں بھی "سرخوشِ صہبائے زندگی" اے کاش! | کھلیں بھی اُن پہ یہ "اسرارِ بیخودی" اے کاش!

یہ کاش "دولتِ علمی" سے ہوسکیں واقف! | یہ کاش "رفتِ قومی" سے ہوسکیں واقف!

یہ کاش "داغ غلامی" کو دھوسکیں دل سے! | جھٹک دیں قید کے گل کو چراغ محفل سے!

کیف تغزل

(خاص برائے تنویر) از جناب ریاض جنیدی

نغمے بیچین ہیں بربط سے نکلنے کیلئے
جام بیتاب ہیں ہاتھوں ہیں مچلنے کیلئے

گھر کے آئی ہے گھٹا اور ہوائیں ہیں خنک
اشک آنکھوں ہیں چھلکتے ہیں نکلنے کیلئے

دور ہیں جام ہے اور ساقیٔ گلفام بھی ہے
میرے ارمان مچلتے ہیں نکلنے کیلئے

اک طرف ساغر ہے ایک طرف مست نگاہ
گرمئ ذوق اشارہ ہے سنبھلنے کیلئے

جنبش ابرو و مژگاں سحر و شام نہیں
تیر و تلوار ہیں عشاق پہ چلنے کیلئے

ان نگاہوں کی قسم آپ الٹ دیجئے نقاب
آفتاب آگیا بلور ہیں ڈھلنے کیلئے

کیف اسطرح سے چھایا کہ ہے بیتاب ریاض!
ذرّہ ذرّہ تپش عشق میں جلنے کیلئے

موسیقی

از جناب سید مظفر حسن صاحب دربھنگوی

تعریف:۔ ا

طویل غیر حاضری کے بعد آج کی صحبت میں ایسے موضوع پر لکھنے بیٹھا ہوں جس کی حقیقت کو الفاظ میں عریاں کرنا میری حد وجہد سے باہر ہے مگر پھر بھی ہمت مرداں مدد خدا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ کسی چیز کی بھی انسانی نطق نے مکمل تعریف نہیں کی خواہ وہ ذی روح ہو یا غیر ذی روح۔ ذی روح کے تذکرہ کے وقت آپ کا خیال انسان یا حیوان کی طرف منتقل ہو رہا ہوگا۔ انسان کو لیجئے اب اس کی دو طرح کی تعریف کرتے ہیں ایک خارجی دوسری باطنی۔ دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھ۔ دو کان، ایک سر غرض اسی طرح اس کے رنگ و روپ کو بھی بتاتے ہیں، باطنی میں اس کے عادات و اطوار، فطرت و خصلت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مگر نگاہ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ آجتک کی تشریحات اطمینان بخش نہیں۔

کیونکہ دونوں لحاظ سے فطرت نے بھانت بھانت کی تخلیق کی ہے اس لئے کوئی نظریہ مرتب ہی نہیں کیا جاسکتا۔ بحث فلسفیانہ ہے، طوالت کے خوف سے چھوڑتا ہوں۔

چنانچہ اسی طرح موسیقی کی تعریف ہر کسی نے بقدر ظرف کی ہے مگر اصول بالا کے تحت کہا جاسکتا ہے "ابھی اور" ہاں یہ ضرور ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا کہ جس کے قلم کا جیسا زور اتنا ہی اثر اور اسی اثر کے ماتحت زمانہ نظریہ، اصول و قواعد مرتب کرتا ہے ۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس میں تغیر و تبدل ہوتا ہے، ساتھ ہی فطرت کا یہ عجیب مذاق ہے کہ انسان کو اتنی طاقت گویائی نہیں بخشی گئی کہ جس کی بدولت وہ اپنے خیالات کا بجنسہ حال بیان کرسکے یہاں بھی وہی زور جس کی ودیعت قدرت نے غیر مساوی طریقے پر کی ہے جلوہ گر نظر آتی ہے چنانچہ شعر کی تعریف کرتے ہوئے حضرت جوش عاجز آکر فرماتے ہیں ؎

"ابولوں سے آہ کوئی اک اچٹتی سی ضیا
جھانکنا فطرت کے روزن سے مرد س بحر کا
کون سمجھے" شعر یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں"

دل سمجھتا ہے جیسے کہ دل میں تھے ویسے نہیں" بہرحال موسیقی کیا ہے؟ عرف عام میں موسیقی گانے کے مترادف سمجھی جاتی ہے لیکن آپنے سنا ہوگا لوگ کسی کی تعریف کرتے ہیں تو کہتے ہیں "اسکی آواز میں موسیقیت ہے" حالانکہ وہ آدمی جکی توصیف بیان کی گئی ہے گاتا نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آواز کی خوبی کو موسیقی کہتے ہیں، آواز کی خوبی کو ہم کئی قسموں میں منقسم کرسکتے ہیں۔ نرم و نازک آواز جس سے دل کو فرحت ہو، ایسی سریلی آواز جس سے رقت ظاہر ہو، ایسی آواز جس سے معلوم ہو کہ سروں سے گلا بھنجگیا ہو وہ آواز جو بچوں کو ڈرانے میں کام آئے، کرخت آواز جو دشمن کو مرعوب کردے۔ غرض اسی طرح تقسیم در تقسیم کرتے چلے جائیں، آخری دو قسم کی آواز سے موسیقی کو کوئی تعلق نہیں کیوں کہ موسیقی کا منشاء دل کو خوشنودی، روح کی تازگی، طبیعت کی بحالی، سرمد جذبات لطیفہ کا ہیجان، رقت، جوش اور دوسرے پاک جذبات سے ہے، جس آواز سے مندرجہ بالا حالات پیدا ہوں اس کو موسیقی کہتے ہیں تو نثر کے جملے ہی کیوں نہ نظم کی جگہ لیلیں اور

نثر کے چند جملے ہی کیوں نہیں حالات بالا کے محرک ہوتے ہیں، اسکا جواب میں صرف اسقدر دے سکوں گا کہ لفظ موسیقی جو "مو" اور "سیقی" سے مرکب ہے، اس کے معنی آتار چڑھاؤ کے ہیں اور چونکہ یہ آتار چڑھاؤ عام گفتگو کے متعلق استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کا استعمال اب فنی حیثیت سے ہوتا ہے اس لئے نثر کی کھپت ممکن نہیں ——۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نظم اور موسیقی کا تعلق قریب ترین ہے اور نظم ہی ایسی شے ہے جو آواز کے اس فنی آتار چڑھاؤ کو برداشت کر سکتی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ صرف موسیقیت آواز پر بعض رقص کرتے نظر آتے ہیں آپ پوچھینگے جب ایسا ہے تو آواز کی خوبی کی موجودگی میں اس فن کے دم چھلے کی کیا ضرورت تھی مگر سوال سے پہلے یہ سوچ لیں کہ تلوار جب تلوار ہے تو پھر اسے سان دینے کی کیا ضرورت ہے۔ فرق یہی ہوگا کہ بغیر سان کی تلوار زنگ آلود ہوگی اور تھوڑے دنوں میں بالو کی طرح جھڑ جھڑ کر ختم ہوجاتی مگر سان پڑتے رہنے سے اسکی چمک دمک میں روز اضافہ ہوگا اور ساتھ ہی اپنا کام کرے گی، بس اسی طرح اچھی آواز پر فن کا سان دینے سے ہمیشہ دل پر کاری ضرب لگائے گی اور بغیر فن کے لمحے بھر کا اثر ہوگا اور پھر وہ بھی غائب۔

ابتدا اور

اس فن کی ابتدا کے متعلق آج تک ہم خیالی پیدا نہ ہوسکی، ایک انسان کو دوسرا پرندے کو اس کو موجد بتاتا ہے مختلف انسانی آبادیاں (یعنی ممالک) اپنے موجد ہونے کا دعوے کرتے ہیں جن میں ایک ہمارا وطن ہندوستان بھی شامل ہے، اس امر کا فیصلہ مشکل ہے مگر چند قیاس کا ذکر کروں گا۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ موسیقا پرندہ کے نام سے مشتق ہے دوسرا جناب موسیٰ ؑ کو اس کا موجد بتا کر ان کی نام کی نسبت ظاہر کرتا ہے، حضرت داود ؑ کو بھی اس کا موجد خیال کیا جاتا ہے اور لحن داودی تو ہماری زبان میں ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔

اس سلسلہ میں پروفیسر واقف تاریخ روضۃ الصفا اور صاحب روضۃ الاحباب کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں " تاریخ روضۃ الصفا اور صاحب روضۃ الاحباب کا قول فیصل یہ ہے کہ موسیقی حضرت آدم ؑ کے زمانے میں جاری ہوئی ہے" آپنے اس دعوے کی دلیل و شہادت میں کلام ربانی کی آیت " وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّھَا (اور آدم ؑ کو تمام اسماء تعلیم کئے گئے) کو پیش کرتے ہیں اور دوسری شہادت اس امر کی بھی لاتے ہیں کہ مزامیر بیسر حضرت آدم ؑ کی ایجاد ہے، مذکورہ روایات مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں" آگے چل کر اہل مغرب کے خیالات کے متعلق فرماتے ہیں:—

(۱) موسیقی کی ابتدا ایکہزار آٹھ سال قبل از مسیح ہوئی (۲) نرسل (نل) کے جنگل میں ہوا کے تموج سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسی سے اس فن کو اخذ کیا گیا (۳)، پرندوں کی آواز سے اس فن کا اصول مرتب ہوا۔ (۴) پانی کی آواز سے اس فن کی ابتدا کا خیال پیدا ہوا۔

ہندوستان کے متعلق فرماتے ہیں:—

"لیکن ہندو حضرات اور امور مذہب کی طرح اس کو بھی خدا کیطرف منسوب کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ اسکی ابتدا برہما سے ہوئی، مہیش (مہادیو) نے اس کو ترتیب دیا اور نارد جی نے اس کو عالم میں پھیلایا، اہل ہند کا دعویٰ ہے کہ یہ فن سرزمین ہند سے جاری ہوا اور دوسری اقوام نے یہیں سے حاصل کیا، یہ خیال کہاں تک درست ہے اس پر زیادہ تبصرہ کی ضرورت نہیں، تاریخ عالم کے مطالعے سے یہ امر ظاہر ہے کہ دنیا کی پہلی آبادیاں شہر بابل اور سوس ہیں اور یہی آبادیاں تمدن انسانی کا گہوارہ ہیں، اشیائے کوچک اور نینوا کے برباد ہوجانے پر وہاں کے لوگ اطراف عالم میں پھیلنا شروع ہوگئے، چنانچہ ایک زمانے کے بعد وہاں سے کچھ لوگ

ہندوستان میں وارد ہوئیں، جو آرین کہلائیں اور ویداور پران سے یہ بات ثابت ہے کہ آرین لوگ مقدس اشلوک اور منتر جاپ کی عبادت میں شامل ہیں، گاتے ہوئے سرزمین ہند میں اترے تھے ایسی صورت میں ہند کی اولیت کہاں باقی رہی[1]

۳ - اثرات :-

موسیقی کے ہمہ گیر اثرات سے ایک عالم واقف ہے، قلب جس سے انسانی زندگی کے واردات ظہور میں آتے ہیں، اس فن لطیف کے اثر سے جذبات لطیفہ کا مخزن بن جاتا ہے۔ خیالات عالیہ کا وجود میں آنا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔

ضمیر کی معاون اول موسیقی ہے۔

گناہ ومعصیت کی طرف بڑھتے ہوئے قدم کو واعظانہ طریقے پر روکنا ضمیر کا کام ہے، مگر موسیقی وہ سخت اور جابرہ پہرہ دار ہے جو طمانچے مار مار کر بہ زور راہ بدلنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جانور بھی اپنے کو اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتے، ہاتھی گنج برنگ مست ہو کر جھومنے لگتا ہے۔ گھوڑا بینڈ یا جنگی باجوں پر میدان جنگ میں حیرت انگیز کام کر جاتا ہے، سانپ بانسری کی آواز پر مسحور ہو جاتا ہے۔

بچپن میں دایہ نے مجھے ایک کہانی سنائی کہ مصر میں دریا کنارے ایک مصری نبی پر درد آواز میں تلاوت کلام ربانی کر رہا تھا کہ نیل میں تموج شروع ہو گیا اور پانی اس کے قدموں کو چھونے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ دایہ مذہبی عورت تھی یا موسیقیت کے آواز کے زور کو بیان کرنا تھا۔

ہندی موسیقی

۴ — ساز کی ایجاد میں ہندوستان کا حصہ —

بین یا دینا، کھرتال، ڈھولک، پکھاوج، سارنگی، مردنگ، طبلہ، تنبورہ، بانسری، ڈمرو وغیرہ اہل ہند کی ایجاد ہیں، ستار حضرت امیر خسروؒ کی ایجاد ہے۔

۵ — مقام، شعبہ، گوشہ، نغمہ۔

ہندوستانی موسیقی میں بموجب بھرت مت اور ہنومان مت چھ راگ حسب ذیل ہیں:—

(۱) بھیروی — (۲) ہنڈول — (۳) مالکوس — (۴) دیپک — (۵) سری راگ — (۶) میگھ راگ —

کالی ناتھ یا کلناتھ مت (کرشن جی کا طریقہ) اور سمیرت (مہادیو) میں بھی چھ راگ ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ بجائے ہنڈول مالکوس۔ دیپک راگ کے بسنت، پنچم، نٹ نارائن نین راگ تسلیم کئے گئے ہیں۔

ہندوستانی موسیقی میں سوائے کلناتھ مت کے اور تمام متوں میں ہر راگ سے پانچ پانچ راگنیاں نکالی گئی ہیں، اور کلناتھ مت میں ہر راگ سے چھ چھ راگنیاں ہیں۔

اس کے علاوہ ہر مت میں ہر راگ کے آٹھ آٹھ پتر ہیں اور بھرت مت میں پتروں کے علاوہ آٹھ آٹھ بہار جاون کا بھی اضافہ ہے، گویا راگ کے شعبے صرف بھرت مت میں زیادہ ہیں جن کی

---

[1] حضرت واقف موجد کے بارے میں فرماتے ہیں "مگر موجد کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ سب سے پہلے یوبل نامی شخص نے بین اور بانسری بنائی، چنانچہ اس کا ذکر کتاب پیدائش (بائبل) کے چوتھے باب کے اکیسویں آیت میں آیا ہے"۔ پروفیسر صاحب نے جہاں سازوں کی ایجاد میں ہندوستان کا ذکر کیا وہاں بین اور بانسری کو ہندوستان کی ایجاد بتایا ہے مگر مندرجہ بالا تحریر سے خود ان کے خیال کی تردید ہوتی ہے۔ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔

تفصیل یہ ہوئی :— چھ[6] راگ، تیس[30] راگنیاں ۔ اڑتالیس[48] پترا ور اڑتالیس[48] بہارجا دون

۶ — تقسیم راگ باعتبار موسم

موسم	ماہ	راگ
بسنت رُت	چیت ۔ بیساکھ	ہنڈول راگ
گریشم رُت	جیٹھ ۔ اساڑھ	دیپک راگ
برکھا رُت	ساون ۔ بھادوں	میگھ راگ
شرد رُت	کنوار ۔ کاتک	بھیروں راگ
ہیم رت	اگھن ۔ پوس	سری راگ
سرت رت	ماگھ ۔ پھاگن	مالکوس راگ

۷ — راگ راگنیاں باعتبار دن رات

وقت	نام
۶ بجے صبح سے ۹ بجے صبح تک	الکوس ۔ رام کلی ۔ اساوری وغیرہ
۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے دن تک	توڑی ۔ کاموود وغیرہ
۱۲ بجے دن سے ۳ بجے تک	پوربی ۔ گوجری "
۳ بجے سے ۶ بجے شام تک	براڑی ۔ بھوپالی ، گوری وغیرہ
۶ بجے سے ۹ بجے رات تک	شام کلیان ۔ ایمن وغیرہ
۹ بجے سے ۱۲ بجے رات تک	کھماج ۔ کدار ۔ ملار وغیرہ
۱۲ بجے سے ۳ بجے رات تک	سوہنی ۔ درباری وغیرہ
۳ بجے سے ۶ بجے صبح تک	بھیرویں ۔ کلیان وغیرہ

۸ — مغنی کی خوبی

سکھابہ — جسکی آواز حاضرین میں مسرت کی لہر دوڑا دے ۔

مدھر — جسکی آواز نہایت شیریں ، دلکش اور دلاویز ہو۔

کارن — کھنک ، درد اور سوز و گداز ہو جس سے محفل میں گہرا اثر طاری ہو

چھپال — آواز سریلی ہو نہ پست بلکہ متوسط درجے کی جس کے گانے کے وقت دم نہ اکھڑے ۔

یرحر — وہ مغنی جو گانے کے وقت اپنے منھ اور دیگر اعضا کو نہ لگاڑے ۔ اور پاٹ دار آواز ہو ۔

سراوک — ایسا مغنی جس کی آواز دور تک پہونچے مگر کریہہ نہ ہو ۔

سانگدھ — ایسا مغنی جو تمام تانوں کو بآسانی ادا کرسکے اور آواز کسی جگہ جھول نہ کھائے ۔

کومل — ایسا مغنی جسکی آواز نہایت نازک ، ملائم اور دل نشیں ہو ۔

دنیا کبھی عاشقوں سے خالی نہیں رہی ہے، ہر زمانہ اور ہر ملک میں ایک نہ ایک مجنوں ایک نہ ایک فرہاد ایک نہ ایک رانجھا پیدا ہوتا رہا ہے، عرب اگر مجنوں ولیلیٰ، قیس ولبنیٰ، وامق وعذرا پر ناز کرتا ہے تو عجم کو شیریں وفرہاد پر فخر ہے، ہند اگر ہیر ورانجھا، نل دمن پر نازاں ہے تو دکن چندر بدن ومہیار، پر خوش ہے۔

چندر بدن اور مہیار کی عاشقی کا افسانہ بالکل تاریخی ہے، مرزا محمد یار متوفی سنہ ۱۱۴۶ھ نے اسی نام سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہے، بیجاپور سے بیس میل کے فاصلہ موضع "کدوری کوٹہ" میں چندر بدن اور مہیار ایک ہی قبر میں میٹھی نیند سو رہے ہیں، ابراہیم عادل شاہ کے بنوائے ہوئے جڑواں تعویذ گو شکستہ سہی مگر باقی ضرور ہیں، دن بھر دھوپ لحد کو تپاتی ہے تو رات میں شبنم آتش زدگان عشق کی گرمی لحد بجھانے کی کوشش کرتی ہے۔

عادل شاہیوں کے زمانہ میں بیجاپور حسن کی کان تھی نہ جانے خارزار کرناٹک میں کونسی مٹی کا خمیر دیا گیا تھا تھا کہ اس کالی مٹی سے جو عورت پیدا ہوتی قدرت کی صناعی کا بہترین نمونہ ہوتی تھی، ایک غریب کسان کی جھونپڑی میں چندر بدن کا جنم لینا تعجب انگیز تھا کیونکہ نہ صرف وہ ناک نقشہ سے درست ہاتھ پاؤں کی سیدھی ہنس مکھ، قبول صورت، کندنی رنگ کی سندر بی تھی، بلکہ اس میں وہ تمام خصوصیات بھی تھیں جنہیں دیکھ کر کوئی شاعر کہہ سکتا تھا کہ

ع آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

چندر بدن کو قدرت نے حسن کے ساتھ پاکیزہ سیرت اور معصوم دل بھی دیا تھا، وہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے اطراف و جوانب میں مشہور تھی اور اپنے اخلاق کی وجہ سے گاؤں بھر میں شہرت رکھتی تھی اور ہر دلعزیز تھی، وہ ہر روز مندر کو جاتی اور دیوی کے آگے ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل گھنٹوں کھڑی رہتی، اسکی آنکھیں بند رہتیں جسم کا رواں رواں کانپتا نظر آتا، نرگسی آنکھوں سے آنسو ڈھلک ڈھلک کر گلگوں رخساروں پر مسلسل گرتے اور منتشر ہو کر تھوڑی پر پھیل جاتے کئی ایک قطروں کا ایک موٹا قطرہ اسکی ٹھوڑی پر سے ڈھلک کر بقول غالب —— "بہ انداز چکیدن سرنگوں" ہو جاتا اور "مقیاس التہاب" پر گرتا۔ اسکی مرہٹی ساڑھی جو اس کے شانوں اور سینے کو چھپائے رہتی بھیگنے لگتی، مگر اسے احساس تک نہ ہوتا اور وہ محویت کے عالم میں پوجا کے پورے رسم ادا کرتی اور ڈنڈوت کرتی ہوئی پچھلے پاؤں لوٹ جاتی، مندر سے باہر نکلنے پر اسے احساس ہوتا کہ اسکا سینہ بھیگا ہوا ہے اس وقت اسکی آنکھیں سرخ اور گلگوں رخسار افسردہ نظر آتے مگر ایک ہی انگڑائی میں یہ ساری کیفیت غائب ہو جاتی، ساڑی کے پلو سے

چہرہ صاف کرکے دونوں ہتھیلیوں سے آنکھیں مل لیتی اور ساڑی کا آنچل سر پر اوڑھ کر وہ اٹھلاتی ہوئی گھر کو لوٹ جاتی ۔

چندر بدن پر سیکڑوں مٹے ہوئے تھے اور ہزاروں دلوں میں اس کے حاصل کرنے کی آرزو تھی مگر وہ کسی طرف متوجہ ہی نہ ہوتی تھی، اسکے والدین اپنی غربت اور فلاکت کی وجہ سے اسکی شادی بچپن میں کرسکے مگر جب وہ بڑی ہوگئی اور والدین نے شادی کی فکر کی تو اس نے صاف انکار کردیا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی، ماں باپ نے لاکھ لاکھ سمجھایا مگر وہ اپنی ہٹ پر قایم رہی، جوں جوں دن گذرتے اس کے حسن کی بہار میں اضافہ ہوتا جاتا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اسکے چاہنے والے بھی پیدا ہوتے جاتے تھے ۔

جھبیارا ایک آوارہ منش کسان تھا اس کا خاندان وسیع اور متمول تھا زمینداری خاصی تھی، باپ بھائی وغیرہ کھیتی باڑی کرتے اور یہ بدمعاشیاں کرتا، اسے سوائے شرارت کے اور کوئی بات سوجھتی ہی نہ تھی، روپیہ پیسہ کافی، دوست احباب کی جماعت ساتھ جوانی کے ولولے بد اطواری کا راستہ دکھاتے اور وہ دل پھینک پھینک کر تماشے دیکھتا، دن بھر میں بیسیوں کو دل دیتا، پچاسوں سے اظہار محبت کرتا، محبت کے مقدس نام سے واقف نہ تھا، عشق و عاشقی اسکے نزدیک بوالہوسی کا دوسرا نام تھا، اسکی بوالہوسی کی کوئی انتہا نہ تھی، ہر صورت دار اور نک سک سے درست آنیوالی پر وہ ریجھ جاتا اور مختلف طریقوں سے اسکی آبرو بگاڑتا، اگر روپئے پیسے سے کام چلتا تو وہ عشق جتانے لگتا چند روز تک محبت کا کھیل کھیلتا اور اپنے دام میں لاتا، یوں بھی پھنس نہ جاتی تو پھر زبردستی کرتا۔ دیہاتی عورتیں ضرورتاً کے لئے گاؤں سے باہر نکلتی ہی ہیں یہ مع اپنے بدمعاش ساتھیوں کے گھات میں رہتا اور زبردستی پکڑ لیتا ۔

چھبیس ستائیس برس کا مضبوط ہاتھ پاؤں اور کسرتی بدن کا گبرو جوان اور پھر لطف یہ کہ دولتمند، عورتیں اس کے فریب میں جلد پھنس جاتی تھیں، اس نے سوائے ہوس رانی کے کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی وہ جانتا ہی نہ تھا کہ محبت کیا چیز ہے ۔

چندر بدن کا شہرہ سنا تو جھبیار نے اپنی ٹولی کو ساتھ لے کر اسکے گاؤں کا رخ کیا۔ چندر بدن کو دیکھا تو اسکی آنکھیں کھل گئیں، ایسی سندر صورت اس نے خواب میں بھی تو نہیں دیکھی تھی، اس نے چندر بدن کو گھیرنے کیلئے وہ سارے ہتھکنڈے صرف کردیئے جو ہمیشہ کیا کرتا تھا مگر یہاں دال نہ گلی، ڈیڑھ دو مہینے گذر گئے۔ مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا، اس کے بدمعاش ساتھیوں نے "بالجبر" کے پرانے طریقے کا انتظام کرنا چاہا مگر جھبیار کی ہمت جواب دے چکی تھی اس کا دل یہ گوارا نہ کرتا تھا کہ ایسی نازنین پر اس طرح ظلم کیا جائے، اب دراصل وہ محبت کے جال میں پھنس چکا تھا جس محبت کو وہ کھیل سمجھ کر اس سے کھیلا کرتا تھا اب وہ محبت اس کے گلے کا ہار تھی ۔

صبح سویرے چندر بدن حسب عادت مندر کو پہونچی تو جھبیار نظر پڑا، اُسے کئی مہینوں سے چندر بدن دیکھ رہی تھی مگر کوئی خاص خیال کبھی نہ آیا تھا، یوں جو مندر کے پاس اُسے دیکھا تو بھی کوئی خیال نہیں آیا وہ جھبیار کے قریب پہنچی ہی تھی کہ جھبیار نے آگے بڑھ کر اسکے قدموں پر سر رکھ دیا اور اپنی "پریم بپتا" سنانے لگا تھوڑی دیر تک تو چندر بدن نے اسکی کہانی سننے کی زحمت کی مگر پھر پوجا کا خیال آیا تو اس کے سر کو ٹھکرا کر آگے بڑھ گئی، پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر لوٹی تو جھبیار اسی جگہ جہاں اس نے پہلے دیکھا تھا اوندھے منھ پڑا ہوا نظر آیا اور وہ اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی،

جھبیار کا کام ایک ہی ٹھوکر میں تمام ہو چکا تھا۔ تھوڑی

دیر میں سارے گاؤں میں اسکی موت کی خبر پھیل گئی، اس کے ساتھیوں نے اپنے طریقہ پر جنازہ اٹھایا، راستہ میں چندر بدن کا مکان تھا اسی طرف لے چلے، کہتے ہیں کہ چندر بدن کے مکان کے سامنے پہونچکر جنازہ اتنا وزنی ہوگیا کہ اٹھانے والوں نے کندھے سے اتار کر زمین پر رکھدیا۔

چندر بدن کو گھر پہونچنے کے بعد معلوم ہوا کہ اسکی محبت میں تھیار کا کام اس طرح تمام ہوگیا ہے اور جب تھیار کا جنازہ اس کے گھر کے سامنے پہونچکر ٹھہر گیا اور تھیار کی روح نے اسے مجبور کیا کہ

ع ۔ تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

تو اس نے بھی اپنے چاہنے والے کے جنازے کو کوٹھے پر سے دیکھا اور اتنی متاثر ہوئی کہ ایک ہی چھلانگ میں وہ جنازے پر پہونچ گئی لوگوں نے دوڑکر اسے روکنا چاہا مگر وہ تھیار کی نعش سے لپٹ چکی تھی، جب اسکے والدین نے آکر دیکھا تو وہ عشق پیچہ کی بیل کی طرح تھیار سے لپٹی ہوئی تھی اور اسکی روح بھی تھیار کی روح کیساتھ عالم ارواح میں وصال کے مزے لوٹ رہی تھی۔

لوگوں نے چندر بدن اور تھیار کی نعشوں کو الگ کرنا چاہا مگر جنہیں عشق ملا دیتا اور محبت متحد کر دیتی ہے انہیں کون جدا کر سکتا ہے بالآخر اسی طرح ان دونوں حرماں نصیبوں کی میت اٹھائی گئی، اور ایک ہی قبر میں دونوں کو دفنا دیا گیا، ابراہیم عادل شاہ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سلطان نے بنفس نفیس قبر پر آکر فاتحہ پڑھی اور پختہ مزار بنوا کر وہاں تعویز بنوا دیئے۔

اس معجزہ محبت کا ثبوت کدری کوٹہ میں اب تک موجود ہے اور یہ افسانہ بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ چندر بدن رہی تھیار رہا مگر انکی عاشقی اب بھی زبان زد خلائق ہے سچ کہا ہے

ع ۔ ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

جذبات سہا

از:۔ جناب محمد اکرم اللہ صاحب قریشی سہا بھنڈوی

اس عالم آشنا کی نہیں ہے نظر کہاں　　مجھکو چھپائے دامن شام و سحر کہاں
ہر سنگ رہگزر ہے ترا سنگ در کہاں　　پیدا ابھی ہوئی وہ جبین نظر کہاں
وارفتۂ وفا کو ہے اپنی خبر کہاں　　لوح جبیں کہاں ہے ترا سنگ در کہاں
جھپکی ہوئی نگاہ سے دیکھا کئے مجھے　　تارے بھی عافیت سے رہے رات بھر کہاں
بجلی کی زد میں تیرا نشیمن ہے بے خبر　　بنیاد اٹھا رہا ہے سر رہگذر کہاں
روپوش تم تو جلوہ دکھاتے ہی ہوگئے　　یہ تو بتاؤ جائیں خراب نظر کہاں
اس پردہ ساز سے کوئی اتنا تو پوچھ لے　　عمر محبت اپنی کریں ہم بسر کہاں
ان کا ہی کچھ نشاں ہے، نہ میرا ہی کچھ پتہ　　گمراہیوں میں چھوڑ گیا راہبر کہاں
کہدو کہ گلستاں میں نہ آیا کرے بہار　　اب خونفشانیوں کیلئے ہے جگر کہاں

درد آشنا سہا نہ ہوا کوئی چارہ ساز
دل میں چھپا ہوا تھا وہ تیر نظر کہاں

انسانی تخلیق کا ہیولیٰ مجموعۂ اضداد و تخالف ہے اگر ذرا تعمق نظری سے کائنات عالم کا مطالعہ کیا جائے تو اختلاف در کائنات کے باوجود انسانی ہیئت ایک خاص نظام و اہتمام کے ماتحت مصروف عمل نظر آئیگا۔ تسلسل ہر حال میں قائم ہے، اور دائم رہیگا، ایک انسان کبھی بیمار ہے کبھی تندرست، کبھی آلودۂ غم ہے کبھی زمزمہ ساز مسرت۔ کبھی گدائے بینوا ہے کبھی پروردہ ناز و نعم، بچپن کے بعد لڑکپن، لڑکپن کے بعد عالم شباب، شباب کے بعد بڑھاپا اور پھر آغوش قبر۔ بجنسہٖ پہلے بیٹا پھر دولہا اور بعد میں باپ کے مدارج سب کو طے کرنے پڑتے ہیں۔

اسی طرح صانع حقیقی کی وہ حسین ترین مخلوق جس کی آغوش میں عارف آشنا مرد نے پہلے پہلے آنکھ کھولی اور جسے عورت اور صنف نازک کے لطیف و جمیل نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تین مراکز میں سے گذرنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں بلکہ یقینی ہے، یا وہ بیٹی ہے، یا دولہن ہے یا ماں ہے، یہ تینوں مراتب اپنی اپنی جگہ پر بہت [illegible] عظیم الشان ہیں۔

جب وہ والدین کے گھر میں ہوتی ہے تو بیٹی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ اس سے جسقدر اظہار محبت کیا جاتا ہے، اور جو جو نازبرداریاں کی جاتی ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وہ ماں باپ کی آنکھ کا تارا۔ ان کے کلیجہ کی ٹھنڈک اور ذرا سیانی ہو کر اپنی ماں کا سہارا اور گھر کی منتظمہ ہوتی ہے، پھر والدین کو اس کی شادی کا فکر لاحق ہوتا ہے، اس کے لئے بہترین سے بہترین شوہر کی تلاش ہوتی ہے۔ لائق سے لائق برسر روزگار اور خوبصورت نوجوان اسکی زندگی کا ساتھی بنانے کے لئے چنا جاتا ہے، چھان پھٹک ہوتی ہے، اور کئی دفعہ بات بن بن کر بگڑ جاتی ہے۔

یہ بیسویں صدی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر اسے انقلابی صدی کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ اس صدی میں جہیز کی لعنت نے ہزاروں گھرانے تباہ کر دیئے ہیں۔ لڑکی والے غریب ہوں زیادہ جہیز نہ دے سکیں تو نقد رقمیں طلب کی جاتی ہیں، اور اگر ادائیگی کا یارانہ ہو تو لڑکی خوبصورت اور پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ایسے فرد سے منسوب نہیں ہو سکتی جو جامہ زیب ہونے کے علاوہ تعلیمیافتہ اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ دنیا کے رسم و رواج اور اسکی ذہنیت پر جسقدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے، ایک حسین و جمیل اور پڑھی لکھی لڑکی کو کوئی شخص محض اس لئے قبول کرنے کو تیار نہیں کہ اس کا باپ اس کے ہمراہ زیادہ جہیز یا نقد روپیہ نہیں دے سکتا، گویا دنیا کی نظر میں سب سے زیادہ وقعت روپے کی ہے۔ خوبصورتی قابلیت سیرت اور خوش اخلاقی کسی شمار میں نہیں۔ ہم اپنے آپ کو مہذب تہذیب یافتہ اور پڑھے لکھے کہلاتے ہیں۔ مگر ہماری جہالت کی کوئی انتہا نہیں،

ہم ہر چیز کو روپے کے پیمانے پر ناپنے کے اسقدر عادی ہو چکے ہیں کہ جو چیز اس پیمانے پر پوری نہ اترے اسے ہم ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں، اس کے برعکس یوں بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکے کے والدین جبتک لڑکی کے ماں باپ کو ایک گرانقدر رقم نہ دیں اسوقت تک وہ شادی سرانجام نہیں پہنچتی۔ گویا زمانہ جاہلیت کے مطابق کچھ روپیے کر اپنی بیٹی جسکی نازبرداریاں اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا غلام لونڈیوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے اور یہ دونوں صورتیں ہماری لڑکی کے لئے خطرناک ہوتی ہیں۔

اب اسکی زندگی کا باب پلٹتا ہے اور اب وہ دلہن بنکر دوسرے گھر میں قدم رکھتی ہے، اور اس گھر کی بلاشرکت غیرے مالک ہوتی ہے۔ عروسی زندگی کے چند ہفتے جس شان سے گذرتے وہ محتاج بیان نہیں، دولہا دلہن کی محبت میں جان تک قربان کرنے کو تیار ہوتا ہے، دولہن کی ہر فرمائش پوری کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ خاندان کے تمام چھوٹے بڑے دلہن کے اشاروں پر ناچنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ دولہا جب اپنی خواہشات حیوانیہ سے اچھی طرح سیر ہوجاتا ہے رفتہ رفتہ محبت کا بھوت اترنے لگتا ہے، عورت بیچاری کو ذلیل اور رسوا کیا جاتا ہے پھر طرح طرح کی ایذائیں دیجاتی ہیں۔ قسم قسم کی تکلیفوں میں مبتلا کیا جاتا ہے، خاوند تو خاوند وہ ساس جس نے بہو کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد حاصل کیا ہوتا ہے اسکی دشمن بن جاتی ہے، بیٹے کے پاس اسکی چغلیاں کھائی جاتی ہیں، بیچاری کا عیش و تنعم جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے، غرض اسکی تمام راحتیں سیل گریہ کی نذر ہوجاتی ہیں، کوئی اس کا پرسان حال نہیں ہوتا، ہر طرف سے اسپر تیر ستم برسائے جاتے ہیں، اس کا شوہر اسے ایک لونڈی سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں انہیں مراسم کے تحت شوہروں کے ظلم نے ہی عورتوں میں جذبۂ آزادی پیدا

پیدا کیا۔ کتنی عورتیں مردوں کے مظالم کی تاب نہ لاکر فسخ نکاح کے بہانے غیر مذہب میں چلی گئیں، مرد مزور اور تکبر کے نشہ میں سرشار ہوکر خدا، رازق اور حاکم سب کچھ بن جاتا ہے۔ اور اپنے زعم میں یہ سمجھ لیتا ہے کہ اسے اس سزا اور جرم کا کوئی معاوضہ نہ ملے گا۔

خدا کی عدالت قریب ہے، ایسے نابکار شوہر خون کے آنسو بہائیں گے، تب بھی بن نہ آئے گی۔

اب عورت کی حیات کا باب سوم شروع ہوتا ہے اور یہ ماں کے پیارے اور معزز لقب سے ممتاز ہوتی ہے۔ یہ اس کی رفعت شان کی انتہائی منزل ہے۔ اس سے بہتر اور علو مرتبت اور کونسی بلندی ہوسکتی ہے کہ جنت جیسی عظیم الشان چیز ماں کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے۔

کہتے ہیں کہ مغرب پرست اور پردہ شکن عورتیں آنا دولمی کی رو میں کیوں بہتی جارہی ہیں، وہ ان مراتب کو چھوڑ کر اور کونسا مرتبہ چاہتی ہیں، اگر وہ مرد بننے کی خواہشمند ہیں تو یہ قرین دانش نہیں۔ اگر وہ کونسلوں کی ممبر یا دفتروں کی کلرک بننے کی آرزومند ہیں تو یہ کم عقلی کی دلیل ہے۔ جو عورت بیٹی بنکر اپنا احترام نہ کرا سکی، جو عورت دلہن بنکر مرد پر حکومت نہ کر سکی، جو عورت ماں بنکر محترم نہ بن سکی وہ کونسلوں اور دفتروں میں جاکر بھی کوئی تیر نہیں مار سکتی، وہ اپنا فطری اور ذاتی احترام کھو کر عارضی احترام حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن بکری ہر حال میں بکری ہے، وہ کتنی ہی توانا، تندرست اور کتنے ہی اوصاف کی مالک کیوں نہ ہو۔ قصاب کی چھری کے نیچے اسے ایکدن ضرور آنا ہے۔ شریر شوہروں کی بدمزاجی نے ظالم قصابوں کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اب جب تک عورتیں خود قصاب بن کر ان کو چھری کے نیچے نہ رکھیں گی ان کے حواس ٹھکانے نہیں آسکتے۔ عورتوں پر مظالم کا سلسلہ

بدستور جاری رہے گا۔ جبتک عورتیں ان سے انتقام لینے کی نہ ٹھانیں گی۔

مرد غالباً اس چیز کو فراموش کرچکا ہے کہ عورت جب انتقام پر آمادہ ہوتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اس کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

اور یہ بھی ایک اٹل حقیقت ہے کہ عورت کی گود گہوارۂ تمدن کی ایک لامحدود دنیا ہے۔ اس کی آغوش عشق و شوق کی ایک دلفریب جنت ہے۔ اسکی ہر ادا ایک مبسوط کتاب دلربائی ہے، جس کی تالیف خود خالق حسن و عشق نے کی۔ اور جس کے مطالب و معانی کے استفسار و استفہام کے سمجھنے کی ہر دیدہ صلاحیت نہیں۔

غزل

از جناب پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

الم میں، درد میں، آہ و بکا میں
الٰہی پھنس گیا میں کس بلا میں

ہو کیا دل بستگیٔ دار فنا میں
لگے دل کیا مسافر کا سرا میں

ابھی کیوں چھوڑتی ہے ساتھ ہمت
ابھی باقی ہے طاقت دست و پا میں

پسیجے کچھ تو دل اس سنگدل کا
اثر اتنا تو ہو آہِ رسا میں

بڑھی بیتابیٔ دل دیکھ کر اور
عجب الٹا اثر ہے اس دوا میں

کیا ہے حشر کا وعدہ کسی نے
بلا یہ عمر بھر کی التجا میں

مریضِ عشق کو مرنا شفا ہے
بقا کا راز مضمر ہے فنا میں

طلب دل کو ہے رہ رہ کر ستم کی
مزا ملتا ہے کیا عذرِ جفا میں

ہمیں جس نے بھلایا اپنے دل سے
ہم اس کو یاد کرتے ہیں دعا میں

خیالِ ناامیدی دور بھی ہو
نہ رخنہ ڈال عرض مدعا میں

وہی اک دل کہ تھا پہلو میں میرے
بتوں کو دے دیا راہِ خدا میں

کیے جاؤ جفاؤں پر جفائیں
یہ لذت ہو نہیں سکتی وفا میں

کروں تو کیا کروں ہیں اب خدایا
خفا بت ہو گئے مجھ سے ذرا میں

جفا تیری سے ہے یا میری وفا سے
انہیں کی دھوم ہے خلق خدا میں

جو چشم و دل میں جلوے ہیں وہ شاکر
سما سکتے نہیں ارض و سما میں

مجنوں نما اسے زندگی کے راستے تنگ نظر آئے تو اس نے جنگل کی راہ لی
جہاں زندگی قدرتی رنگ میں کرشمہ کار تھی، وہ ہر راستے پر چلا یہاں تک کہ حقیقی زندگی کو پالیا
آپ کو حقیقی زندگی دکھائے گا!
شاندار تیسرا ہفتہ
ڈائرکٹر: چترنجن ڈوشی
رنجیت مووٹون کی شاندار پیشکش
مسافر
پیاری خاص ادا کار
خورشید
واسنتی
اشتوری لال
رائل اوپیرا ہاؤس
روزانہ:
۴ - ۳¾ ۶ - ۹¾ بجے سنیچر، اتوار تہوار کو ½۱۲ بجے زائد شو
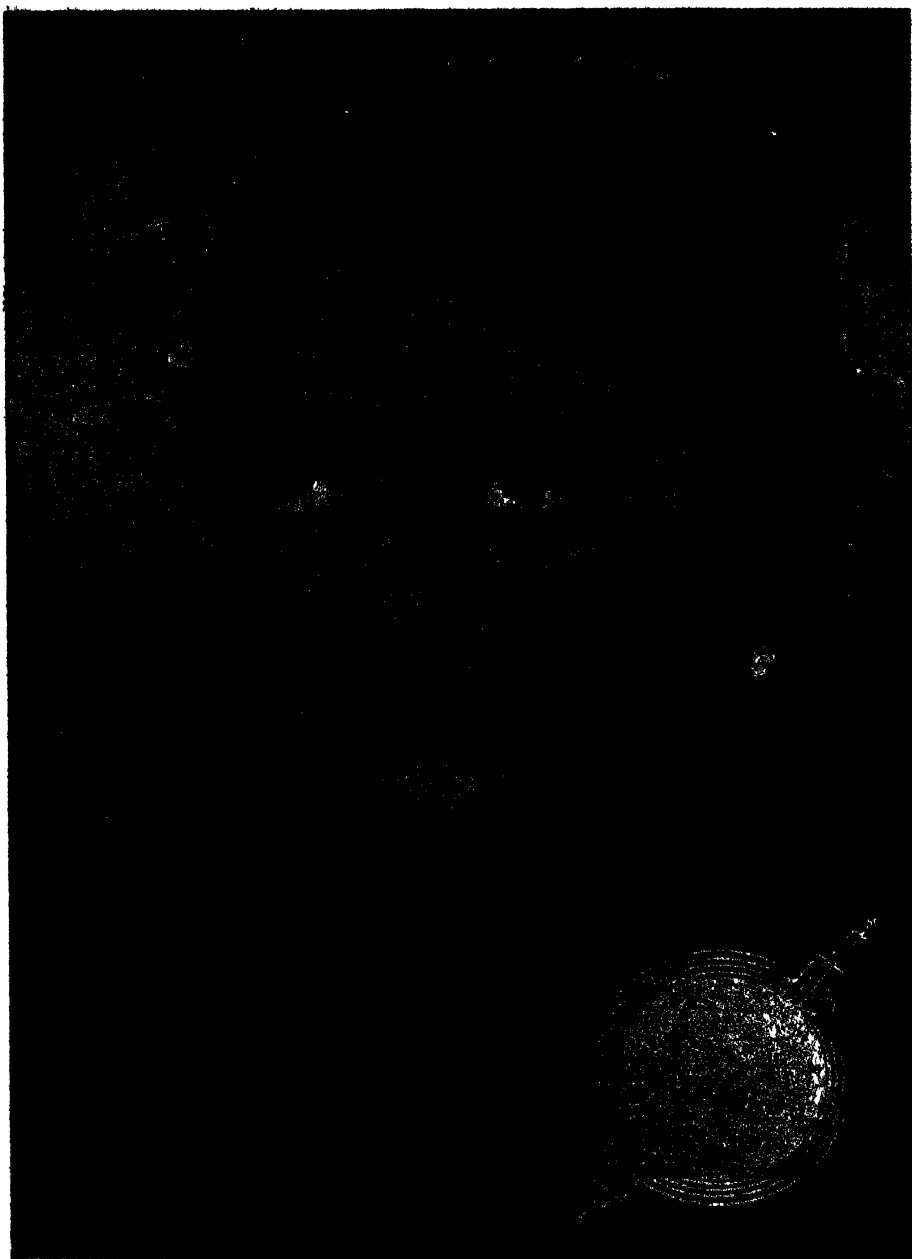
SABITA DEVI in Sudama's SAJNI.

"نرسی بھگت" ۱۹۴۰ء کا ہنگامہ خیز شاہکار
جس کی زبردست
کامیابی کی دو ماہ پہلے پیشین گوئی کیگئی ہے
سچائی — رواداری — مساوات
کی جیتی جاگتی تصویر!
نرسی بھگت
جسے پرکاش پکچرز نے
لاکھوں روپیہ صرف کرکے
تیار کیا ہے!
نرسی بھگت اسی شان کا پہلا مذہبی فلم ہے جو ہندوستان کے
ہر فرقہ و قوم کے لوگوں سے
شرف قبولیت
حاصل
کریگا!
اراکان خصوصی
افسانہ مسٹر ایم جی دوے
پرکاش کے آئندہ شاہکار:— مالا ، راکھی ، رومیو جولیٹ

شیام مزدور کا بیٹا تھا کوئلے کی کان میں کام کرنیوالے جفاکش مزدور کا — ان کے گاؤں میں بھی سب کان کن ہی آباد تھے - اور ہر شخص کانکن ہونے پر فخر کرتا تھا - اڑھائی ہزار نفوس کی اس آبادی میں جسے باہر کی دنیا سے کوئی سروکار نہ تھا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو کانکنی کے کام کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہو ، اس آبادی میں جب دو شخص آپس میں ملتے تو کان کے حوادث کے چرچے ہوتے — شیام گو ایک مزدور کا بیٹا تھا مگر اس میں وہ روح نہ تھی جو ماحول اسے عطا کرنیکی کوشش کر رہا تھا ، وہ اس ہولناک قوت کو پوری طرح محسوس کر رہا تھا جو اس قصبے پر حکمران تھی ، اور جس ، کی مرضی کے بغیر کوئی کام ممکن نہ تھا -

وہ خوفناک آہنی چکر جو اس کے گندے مکان کی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا اور چکی کے پاٹ کی طرح ہر وقت گردش میں رہتا تھا ، اسکی ایام طفلی سے اسکے خیالات پر حکمران رہا تھا ، جب وہ بچہ تھا تو اکثر پڑھتے ہوئے خوف بھری نظر وہ چکر اسے اپنی آہنی گرفت میں لئے ہوئے چکر کھا رہا ہے اور اسے دور بہت دور زمین کی گہرائیوں میں گاڑے جا رہا ہے ، وہ ان خیالات میں اسقدر محو ہوتا کہ خوف اسے خالی الذہن کر دیتا اور وہ کچھ بھی نہ سوچ سکتا.......

شام کے وقت بازاروں میں گذرتے ہوئے پژمردہ انسان سیاہ چہرے اور داغدار کپڑے لئے گذرتے تو اس کے خیالوں میں ایک دہشت ناک سنسنی دوڑ جاتی اور اسوقت وہ سمجھتا کہ یہ سب آہنی چکر کی ہولناک قوت کا اثر ہے -

اس کا باپ بھی تو اسی حالت میں گھر آتا تھا خستہ حال ، پریشان درماندہ ، اس کے باپ کے کپڑوں کی بو اس کے ماں کے کپڑوں یا پھر اپنے کپڑوں سے بہت مختلف ہوتی تھی ، ایسی بو جسے وہ سمجھ نہ سکتا تھا مگر جو اسکی روح میں ایک نفرت ایک حقارت پیدا کرتی چلی جاتی تھی -

پھر وہ لوگوں کی باتوں کو سمجھنے لگا ، تھکا دینے والے کام کی نوعیت اسکی سمجھ میں آنے لگی ، وہ سمجھنے لگا کہ اس کا باپ جب گھر آتا ہے تو اتنا نڈھال کیوں ہوتا ہے .... مگر آہنی چکر اور اسکی دہشت اس کے دماغ سے نہ ہٹی وہ یقین کر چکا تھا کہ اگر یہ آہنی چکر اسجگہ نہ ہو تو تھکا دینے والا کام نہ ہوگا - یہ خستگی اور پریشان حالی نہ ہوگی - یہ سیاہ چہرے نہ ہونگے اور نہ ہی باپ کے کپڑوں سے نفرت انگیز بو آئیگی -

بچپن میں ہمیشہ آہنی چکر اس کے خیالوں کا مرکز بنا رہا - اسے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آہنی چکر ایک دن اسے بھی دوسروں کی طرح تھکا دیگا - بیکل کر دیگا اور وہ بے بس انسان کی طرح اس آہنی قوت کے سامنے جھک جائیگا

رات کو وہ خوابوں میں دیکھتا کہ چکر اسپر چڑھا آ رہا ہے ... جیسے ڈراتا ہے ، وہ ہڑبڑا کر جاگ اٹھتا ، وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے اسے ہٹانا چاہتا مگر وہاں تھا کیا ایک سیاہی ایک منجمد تاریکی ، اور وہ سمجھتا کہ وہ کوئلے کی کان میں پھینکدیا گیا ہے - اور چاروں طرف پھیلی ہوئی سیاہی کوئلے کی دیواریں ہیں جو اسے کسی طرف بھی کھسکنے یا بھاگنے کا راستہ نہ دینگی ، وہ ہاتھ پھیلاتا تاکہ ان پتھر کی دیواروں کو چھو سکے ، اور جب اس کا ہاتھ اوڑھنے کو چھوتا جسے وہ خواب کی کشمکش میں دور ہٹا چکا تھا تو اسے احساس ہوتا کہ وہ اپنے گھر میں ہے .... وہ چپ سادھے

زمین پر پڑا رہتا، پسینے میں تر بتر، وہ اس اذیت کو بھولنے کی کوشش کرتا جس میں وہ ابھی مبتلا تھا مگر آنکھیں بند کرنا قیامت تھی وہی خواب دوبارہ شروع ہو جاتا، وہ خوف وہراس کی اذیتوں سے نیم دم ہو کر سو جاتا۔ پریشان حال —— اوہ!

وہ کبھی پریشان ہو کر سامنے سرسبز پہاڑیوں میں سیر کیلئے چلا جاتا اور سبزے کو روندتے ہوئے اسے یکایک خیال آتا کہ جہاں وہ کھڑا ہے اس کی گہرائیوں میں ہزاروں انسان کوئلے کی دیواروں سے نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ مگر مگر دنیا والے نہیں دیکھ سکتے، کوئلے کی بڑی بڑی چٹانیں جن کے سامنے کانکن عاجز اور بے بس نظر آتے ہیں وہ سوچتا کہ اگر یہ پہاڑ ان پر گر پڑے تو ان میں سے ایک بھی سانس تک نہ لے سکیگا۔ یہ سوچتے سوچتے اس کا حلق خشک ہو جاتا۔ وہ آنکھیں بند کر لیتا۔ مگر آنکھیں بند کرنا تو اور بھی پریشانی کا باعث ہے وہی کوئلے کی سیاہی —— وہ گھبرا کر آنکھیں کھولتا اور پھر سامنے وہی بھیانک آہنی چکر.....

اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ کانکن بننے سے انکار کر سکے...... مگر یہ اسکے بس کی بات بھی نہ تھی، یہاں کا رہنے والا ہر شخص کانکن بننے پر ہی تو فخر کرتا ہے۔ عورتیں فخریہ اپنے مردوں کے دلچسپ تجربات بیان کرتی ہیں، اگر وہ انکار کر دیگا تو لوگ اسے بزدل کہیں گے....... آخر ایکدن آئیگا جبکہ وہ کان کی تاریکیوں میں جھونک دیا جائیگا۔ یہی اسکی تقدیر میں لکھا ہے...... اور گھر والے تو ابھی سے شام کی ملازمت کے تذکرے کیا کرتے تھے۔

سکول کی چار دیواری بھی اسے خوفناک ماحول سے دور نہ لیجا سکتی تھی ماسٹر کان کنوں کی جرات اور بہادری کے کارنامے سناتا تھا کہ وہ بھی بڑے ہو کر اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چل سکیں۔ آج وہ کان کنوں کی زندگی پردۂ فلم پر دکھانیوالا تھا۔ شیام اسے دیکھنا نہ چاہتا تھا مگر مجبوراً، اسنے چاہا کہ تصویروں کو نہ دیکھے اور آنکھیں بند رکھے مگر ماسٹر کے الفاظ حقیقی تصویروں سے بھی زیادہ ہیبتناک اور روح فرسا تھے وہ ان کی تاب نہ لا سکا۔ تصویروں کو دیکھتا رہا لیکچر تو سنتا رہا مگر وہ خود نہ جانتا تھا کہ اس نے کیا سنا اور کیا دیکھا۔

ماسٹر کا خیال تھا کہ لیکچر بہت کامیاب رہا ہے۔ لڑکوں نے اس میں بڑی دلچسپی لی ہے...... چھٹی ہو گئی اور شیام اس خیال سے کہ سب لڑکے آج کی تصویروں اور لیکچر کا ذکر کرتے ہوئے جائینگے اور اسے اپنے جذبات چھپانا مشکل ہو جائیگا تمام لڑکوں کے بعد آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلا کہ اتنے میں ماسٹر نے اسے آلیا اور بولا: — "شیام لیکچر اچھا تھا؟" — "جی" کہہ کر لڑکے نے پیچھا چھڑانا چاہا مگر ماسٹر تو اپنے لیکچر کے تاثرات دیکھنا چاہتا تھا بولا: — "تو پھر تم بڑے ہو کر کانکن ہو گے نا؟" — شیام اب ضبط نہ کر سکا بولا: — "نہیں — کبھی نہیں"۔ ماسٹر حیران ہو گیا...... پھر بولا: — "تو پھر تم کیا کام کرو گے"۔ شیام تے کان کے خیال سے کبھی فرصت ہی نہ پائی تھی جو وہ یہ سوچتا کہ کانکنی کے علاوہ کونسا پیشہ اختیار کرنا چاہئے، اس سوال سے گھبرا گیا، مگر پھر فوراً ہی ماسٹر کو سامنے کھڑا پا کر بولا: — "میں ماسٹر ہی بنوں گا"۔

ماسٹر نے اس جملے کو اپنے پیشہ کی تعریف سمجھا اور فخریہ تن گیا پھر بولا: — "تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہیں تعلیم کا شوق ہے اور غربت تمہیں اسے جاری رکھنے سے باز رکھتی ہے ایسا ہے تو میں وظیفے کا بندوبست کر دونگا"۔ شیام نے ماں کو یہ خوشخبری سنائی، تو وہ بولی کا ہل ماسٹر ہوگے۔ ہرگز نہیں تمہیں کان کن ہی بننا ہوگا۔ اور اسکی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

دن گذرتے گئے کان سے اسٹیشن تک کوئلہ پہونچانے کیلئے جو گاڑیاں کمپنی نے بنا رکھی تھیں آتیں اور پھر کر چلی جاتیں۔ مگر رفتہ رفتہ خالی گاڑیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ پھر سڑکوں پر بیکار انسان بھی نظر آنے لگے۔ انکی تعداد بھی دن بدن بڑھتی جاتی تھی، آخر ایکدن کان بند کر دی گئی ...... کوئلہ ختم ہو چکا تھا۔ شیام کی ماں اور باپ آنیوالے فاقوں کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔

گھر پر خاموشی مسلط تھی نہ شیام کی ماں بولتی تھی نہ باپ، چولہا ٹھنڈا پڑا تھا، اور شیام باری باری دونوں کو دیکھ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ اسکے باپ اور بھائی نے باز دو کوئلے کی سنگین دیواروں سے طاقت آزمائی کر چکے ہیں، لڑ چکے ہیں اور انہیں نیچا دکھا چکے ہیں اب انہیں کیا کام مل سکتا۔ ماں نے مہر سکوت توڑی اور بولی جاؤ شاید دوسری کان میں کام مل جائے۔ باپ بولا کوئی امید نہیں وہاں صرف نوعمر لڑکوں کو رکھا جا رہا ہے، بوڑھوں کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ شیام نے یہ سنا ٹوپی اٹھائی سر پر رکھی اور روانہ ہو گیا...... شام کے وقت جب وہ گھر لوٹا تو آتے ہی بولا "ماں میں دوسری کان میں ملازم ہو گیا ہوں......... اس سے زیادہ کچھ بھی کیا سکتا تھا".........
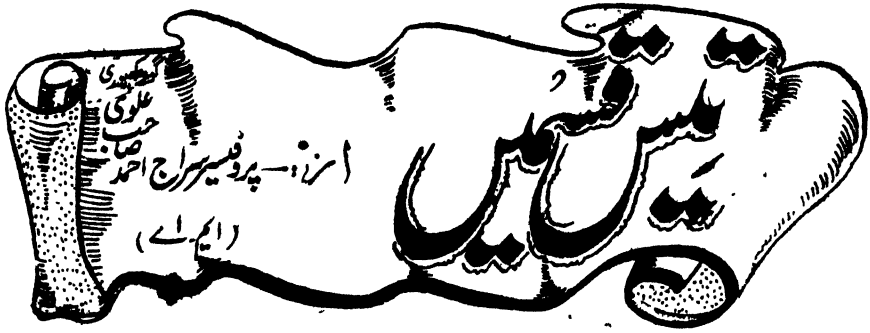
۱ــــ قسم ہے تیری جنون پرستی کی کہ اگر تو مجھ میں نہ ہوتا تو میں تیرے پاس ضرور آتا۔

۲ــــ قسم ہے اپنی ان مست انکھڑیوں کی جن کا تو مخمور ہے اگر مدہوش نہ ہوتا تو میں تیرے پاس آتا۔

۳ــــ قسم ہے اپنی زلف پیچاں کی کہ جس میں تیرا دل اٹکا ہوا ہے کہ وہ اگر سلجھ جاتی تو میں ضرور تیرے پاس آتا،

۴ــــ قسم ہے اپنی کمر باریک کی جس کا نشان تجھکو نہیں ملتا کہ اگر اس کے لچک جانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں ضرور آتا،

۵ــــ قسم ہے اپنے عارضہائے سیمیں کی جنہیں تو پھول سمجھتا اگر ان کے کمھلانے کا ڈر نہ ہوتا تو میں ضرور تیرے پاس آتا،

۶ــــ قسم ہے اپنے ان ہاتھوں کی اس حنا کی جسے تو خون سے تعبیر کرتا ہے اگر وہ میرے پیروں میں نہ لگی ہوتی تو میں ضرور آتا،

۷ــــ قسم ہے ان تاریک راتوں کی جنہیں تو مجھے یاد کیا کرتا ہے اگر وہ تاریک نہ ہوتیں تو میں ضرور آتا،

۸ــــ قسم ہے تیری شبانہ روز کی آہ وزاری کی کہ اگر انہیں کچھ اصلیت ہوتی تو میں ضرور تیری طرف کھنچ آتا،

۹ــــ قسم ہے ترے قاصد کی اگر وہ کبھی مجھ تک پہنچتا تو میں ضرور اس کے ساتھ آتا،

۱۰ــــ قسم ہے ان برسات کے راتوں کی جنہیں تو میری خواہش کرتا ہے کہ اگر میرے پیروں میں کیچڑ بھر جانے اور تاریکی میں گر پڑنے کا خوف نہ ہوتا تو میں ضرور تیرے پاس آنے کی کوشش کرتا،

۱۱ــــ قسم ہے اس موت کی جو میرے ہجر میں ہر وقت ترے پاس نازل رہتی ہے کہ اگر میں اس سے ڈرتا نہ ہوتا تو ضرور تیرے پاس آتا،

۱۲ــــ قسم ہے تیری جسم لاغر کی اگر مجھے تیرے ٹٹول کر نہ پانے کا خوف نہ ہوتا تو میں تیرے پاس آتا،

۱۳ــــ قسم ہے ان اغیار کی جو مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو میں ضرور تیرے پاس آتا،

۱۴ — قسم ہے تیرے ان رقیبوں کی جو تیرے خیال میں مجھے تجھ سے بدگمان کرتے ہیں اگر وہ مجھ کو تجھ سے بدگمان نہ کرتے تو میں ضرور آتا،

۱۵ — قسم ہے تیری بدمذاقی کی کہ اگر تو اپنے جوش میں میری پردہ دری نہ کرتا تو میں ضرور تجھ سے ملتا ،

۱۶ — قسم ہے اپنی اس یاد کی جو ہر وقت تیرے دل میں چٹکیاں لیا کرتی ہے اگر وہ نہ ہوتی تو میں ضرور تیرے پاس آتا ،

۱۷ — قسم ہے تیری اس بیدردی کی کہ اگر مجھے تو اپنا قاتل نہ سمجھتا تو میں ضرور تیرے پاس آتا ،

۱۸ — قسم ہے اپنے جگر دوز تیروں کی کہ اگر میرے ترکش میں وہ نہ ہوتے تو میں ضرور آتا ،

۱۹ — قسم ہے اس عشاق کش خنجر کی جو تو نے میری کمر میں حمائل کر دیا ہے اگر میں اسکے بوجھ سے دب رہا ہوتا ضرور آتا ،

۲۰ — قسم ہے تیرے رقص بسمل کی کہ اگر وہ لائق دیدنی ہوتا تو میں ضرور آتا ،

۲۱ — قسم ہے تیری ان ہوسناکیوں کی جو تیرے شعر دل سے ظاہر ہیں کہ اگر مجھے ان کا علم نہ ہوتا تو میں ضرور آتا .

۲۲ — قسم ہے تیری شب پیمائیوں کی کہ اگر تجھ پر چور کا گمان نہ ہوتا تو میں ضرور تجھ سے راستہ میں ملتا ،

۲۳ — قسم ہے ان ڈھیلوں کی اور پتھروں کی جن سے لڑکے تیری تواضع کرتے ہیں کہ اگر چوٹ کھانے کا ڈر نہ ہوتا تو ضرور سڑک پر میں تجھ سے ملتا،

۲۴ — قسم ہے تیری اشتہاری محبت کی کہ اگر اس میں صداقت کی جھلک ہوتی تو میں ضرور اسکی قدر کرتا ،

۲۵ — قسم ہے اپنی ان تمام رعنائیوں اور خوبیوں کی جن کا تو مداح ہے کہ اگر میرے اندر وہ ہوتیں تو میں ضرور آتا ،

۲۶ — قسم ہے تیرے حسن ظن کی کہ اگر میں عیسیٰ نفس ہوتا تو تیری بالین مرگ پر ضرور آتا .

۲۷ — قسم ہے تیرے جنازے کی کہ اگر وہ میری گلی سے نکلتا تو میں ضرور اسکے ساتھ جاتا اور کندھا دیتا ،

۲۸ — قسم ہے تیرے مرقد کی کہ اگر وہاں اندھیرا ہوتا اور شمع کی ضرورت ہوتی تو میں ضرور دیا جلانے کیلئے وہاں جاتا ،

۲۹ — قسم ہے تیری اس محبت کی کہ جس کا مجھے یقین نہیں ، اگر یقین ہوتا تو میں ضرور آتا ،

۳۰ — قسم ہے اپنی اس محبت کی جس کا تجھے یقین ہے کہ اگر تجھے اس کا یقین نہ ہوتا تو میں ضرور آتا ،

پس اے میرے خواہان شاعر اگر اتنی قسموں کے بعد بھی تجھے میری مجبوریوں کا یقین نہیں ہے تو مجبوری ہے ،

وہ دیکھئے بندرگاہ .... دیکھئے!

ہاں نیشاپور وہی ہے

اور وہ جہاز کتنے بڑے بڑے ..... وہ عمارتیں

کتنی عالیشان، اور وہ دیکھئے؟

وہی شاہی محل ہے! وہیں ہیں پہنچنا ہے۔

اور وہیں ہیں میری امی جان... ... !دس برس

کے معصوم بھولے بھالے قمر نے پر اشتیاق الفاظ میں کہا، ایام طفلی ہی سے دور وسط ایشیا کی ایک خانقاہ میں رہنے کے سبب اسے شہرت کے یہ ٹھاٹ باٹ نہایت عجیب وغریب معلوم ہو رہے تھے۔ دس برس کے بعد آج پہلی دفعہ وہ اپنی ماں الماس سے ملنے جا رہا تھا بوڑھے عذرا کے ساتھ۔ جیسے جیسے شاہی محل قریب آتا جا رہا تھا ویسے ویسے ننھے قمر کا دل اپنی ماں سے ملنے کے لئے فطری طور پر مچل رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ رہ رہ کر بوڑھے عذرا سے سوالات کر رہا تھا۔

دس سال پیشتر وسط ایشیا کی اسی خانقاہ میں جہاں سے بوڑھا عذرا اور قمر آرہے تھے الماس نامی ایک خوبصورت مگر بدنصیب عورت (جس کا نام لینا اتنا ہی گناہ تھا جتنا وہ اپنی خوبصورتی کے لئے دور ودراز ملکوں میں مشہور تھی) نے اپنے نوزائیدہ بچے کے ساتھ پناہ لی تھی، وہ ایک طوائف تھی، اپنے زندہ باپ کو اپنی ہستی قائم رکھنے کے لئے خانقاہ میں پناہ گزین ہوئی تھی، بوڑھے عذرا کو بچہ سپرد کر کے اسیر اخیر خانگاہ ڈالتی ہوئی چل دی۔ کسی نامعلوم مقام پر، اپنی قسمت آزمانے کے لئے۔ قسمت کے چکر نے گردش کی، کتنوں ہی کو رلایا، کتنوں ہی کو ہنسایا، انہیں ہنسنے والوں میں الماس بھی تھی۔

نیشاپور کے نوجوان شجیع شہزادہ اور تخت کے جائز وارث سراج کی پیاسی نگاہوں کو الماس نے تحفہ پیش کیا۔ سراج نے محبت کی خاطر اسے بھی قبول کر لیا۔ شادی کے بعد سراج عنان حکومت الماس کے سپرد کر کے خود عیش وعشرت میں ڈوب گیا، الماس اب وہ الماس نہ تھی، اس نے اپنے گذشتہ ایام زندگی یکلخت فراموش کر دیئے تھے اور بقایا دن ختم کرنے کے بہترین ذرایع تلاش کر رہی تھی، وہ اب ایک ملکہ تھی، ملکۂ عالم، جس پر اسکی نظر عنایت تھی وہ نہال تھا، دشمنوں کے لئے پیام اجل اسی ملکہ سے ملنے جا رہے تھے عذرا اور قمر۔

جب عالیشان عمارتوں اور کوٹھیوں میں غریبوں کا داخل ہونا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے تو محلوں کا ذکر ہی چھوڑ دیئے، لیکن جہاندیدہ بوڑھے عذرا نے اپنی دانائی سے کام لیکر محل کے داروغہ ناصر کے نام پر داخل ہونے کی اجازت حاصل کر لی، متعدد کمروں سے گذرنے کے بعد عذرا ناصر تک پہنچ گیا، جہاں وہ ملکہ کے کمرہ خاص پر پہرہ دے رہا تھا۔

بوڑھے عذرا کو دیکھتے ہی ناصر نے کہا۔ "تم نے میرے نام پر آنے کی اجازت تو

حاصل کرلی، اب مقصد بیان کرو۔"

درندہ صفت ناصر کی خوفناک آنکھوں کو دیکھ کر ننھا قمر بوڑھے عذرا سے چمٹ گیا۔

بوڑھے عذرا نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا:۔

"مجھے صرف ملکہ عالم ہی سے کام ہے۔"

"مجھ پر اپنا مقصد بیان کئے بغیر ملکہ سے نہیں مل سکتے، ملکہ اور میرے درمیان آجتک کوئی راز پوشیدہ نہ رہ سکا" ناصر آنکھیں نکال کر کہنے لگا۔

بوڑھے عذرا نے جب دیکھا کہ بغیر مقصد بیان کئے ملکہ سے ملاقات کرنا محال ہے تو کہنے لگا سنئے! "یہ بچہ میرے ساتھ پہلی مرتبہ اپنی ماں یعنی ملکہ سے ملنے آیا ہے"، اسی طرح اسنے تمام باتیں ناصر سے بیان کردیں۔

یہ راز معلوم کرنے کے بعد ناصر کے چہرے پر کئی دفعہ اتار چڑھاؤ آئے اور چلے گئے۔ آخر اس نے ایک فاتحانہ ہنسی کے ساتھ بچہ پر نگاہ جما کر کہا:۔ "بیشک بچہ بالکل ملکہ کی صورت پر ہے! اچھا تم یہیں ٹھہرو" یہ کہکر وہ الماس کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

فوراً ہی الماس باہر آئی۔ ملکہ کی پوری شان وشوکت کیساتھ۔ ناصر عذرا اور قمر باادب سر جھکا کر کھڑے ہوگئے، الماس نے اپنے بچہ قمر اور قمر نے اپنی ماں الماس کو ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ مامتا عود کرآئی۔ الماس میرے پیارے بچے کہتی ہوئی قمر سے لپٹ گئی۔

آنکھوں سے محبت کے آنسو جاری ہوگئے۔ اس عرصے میں اس نے اپنے آپ کو بالکل فراموش کردیا تھا کہ وہ ایک ملکہ ہے مگر فوراً ہی اسے خیال آیا ـ ناصر کا...... شاہ سراج پر راز افشا ہونے کا جسے آج دس سال سے اپنے سینہ میں دبائے ہوئے تھی، وہ گھبرا اٹھی۔ اس خیال نے اسے بیچین کردیا، انجام سوچکر وہ کانپ اٹھی، پسینہ میں تربتر ہوگئی، اپنے کمرے میں آکر ایک صوفے پر گر پڑی:۔

"کیا یہ ہوسکتا ہے کہ.......... ناصر........ شاہ سراج پر .... یہ راز فاش کردے گا........ اور شاہ سراج اسکو........ اسکو........ اوہ.......... اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی"

طبیعت سنبھلنے پر اس نے ناصر کو اپنے سامنے کھڑا پایا، اسکی آنکھوں میں اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جس کا اسے خوف تھا، نہایت دل برداشتہ ہوکر کہنے لگی:۔

"میں تمہارے قبضہ میں ہوں، میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے، شاہ سراج کو اسکی خبر نہ ہونے پائے"

"میں تو آپ کا ادنیٰ غلام ہوں، ملکہ عالم میرے سوا اور کون کہہ سکیگا"

"بوڑھا عذرا...... میرا لخت جگر قمر......" ملکہ نے رکتے رکتے کہا۔

اس کا صرف ایک ہی علاج ہے کہہ کر ناصر نے فرش کی جانب اشارہ کیا جس کے نیچے تہہ خانہ تھا اور تھا بھی موت کا کنواں جہاں ہزاروں بدنصیب موت کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیئے جاتے تھے اور اب عذرا اور قمر کی باری تھی

"کیا تمہارا مطلب ان کی موت سے ہے" آہ ناصر اتنے سخت دل نہ بنو۔ بوڑھے عذرا جس نے بیکسی کی حالت میں میرا ساتھ دیا۔ ننھا قمر میرا عزیز بچہ اپنے ہاتھوں اسکی موت، ان میں انہیں مار کر کبھی زندہ نہیں رہ سکتی ناصر۔ ذرا سوچو تو"

"ہاں ٹھیک ہے اگر تم انکی موت نہیں دیکھ سکتیں تو ایک گرم سلاخ اور چھری سے بھی کام نکل سکتا ہے۔ انہیں زندہ ہی جانے دو، میں ہمیشہ کے لئے خاموش، نابینا اور بے زبان۔ اس کے بغیر آپ کی خیریت نہیں"

خیریت ـــــ سلامتی ـــــ الماس چونک پڑی۔ ہاں اپنی سلامتی اور خیریت ضروری ہے۔ اپنی سلامتی ہی کے لئے تو وہ آج سے دس سال پیشتر معصوم اور نوزائیدہ بچے قمر کو چھوڑ کر آئی تھی، پتھر کا جگر تو کیا

اب ایک بچے کیلئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال سکتی ہے ۔ جبکہ اگر وہ چاہے تو کتنے ہی قمر اور وجود میں آسکتے ہیں ۔ مگر یہ بچہ .... آہ ترقانہ گلاب کا پھول اسکی موت اپنے ہاتھ ، اسکی بربادی کا سامان خود فراہم کرے۔ اس نے دیکھا کہ ایک گرم سلاخ بڈھے عذرا کی آنکھوں میں گھسی اور وہ میٹھی زبان اسپر تیز چھری اور اف یہ درد و کرب یہ چلاہٹ ، یہ رقص بسمل .... الٰہی پناہ

ماں کے دل اور ملکہ کی ایک عظیم ترین ہستی کی زبردست ترین الماس اپنے آپ کو نہ سنبھال سکی ، اسپر بیہوشی سی طاری ہونے لگی ۔ نیم بیہوشی کے عالم میں اسنے کہا کہ مجھ سے یہ تکلیف نہیں دیکھی جاتی اس سے تو موت بہتر ہے"

ایک .... دو ...... تین .... .. چار اسی طرح متعدد کمروں سے گذرتے ہوئے ناصر عذرا اور قمر موت کے کنوئیں تک پہنچے بوڑھا عذرا گھبراہٹ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا ۔ کنوئیں کے چاروں طرف ایستادہ غلام حبشیوں پر عذرا نے ایک نگاہ ڈال کر اور پھر جلاد ناصر پر اور پھر بدقسمت قمر پر ، اسے اپنی پرواہ نہ تھی ، مگر یہ بچہ جس کا ابھی نہ کوئی دوست تھا نہ دشمن ، اس نے کونسا گناہ کیا تھا ماں سے ملاقات کرنا کیا کوئی جرم ہے"

عذرا اپنی قسمت کو کوسنے لگا ۔

"رحم کر ! اس معصوم بچے پر رحم کر ۔ اگر یہاں آنا ہی قصور ہے اور اسکی سزا موت ہی تو مجھے مار ڈال ، اس نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے" عذرا نے قمر کو سینہ سے لگاتے ہوئے کہا ۔

اس کے جواب میں ناصر نے ایک ٹھوکر ماری اور ایک بڑا پتھر اٹھا کر کنوئیں میں ڈالدیا ۔ پتھر کے گرنے کی آواز کنوئیں کی گہرائی بتلا رہی تھی ، اور ناصر ہنس رہا تھا ، اس نے ہاتھ اٹھا کر حبشیوں کو اشارہ کیا اور دونوں گھسیٹے جانے لگے مگر

"ٹھہرو" ایک خوفناک ڈرا دینے والی آواز نے سب کچھ

جہاں کا تہاں ٹھہر گیا ، عذرا کنوئیں کے قریب ، قمر سیڑھیوں کے پاس اور ناصر کا ہاتھ اسکی بڑی بڑی مونچھوں پر ۔

قمر نے دیکھا اپنی ماں کو ...... ایک محبت بھرا دل رکھنے والی ماں کو .... خدا کی دین کو .... عذرا نے دیکھا انصاف پسند ملکہ عالم کو اور ناصر نے دیکھا خوبصورت بلا کو ملک الموت کے بھیس میں ۔ اسے اپنے خیالوں میں یہ زلزلہ اپنی موت کا پیغام معلوم ہونے لگا ۔

قمر حبشیوں کے پنجے سے چھوٹ کر بے تحاشہ بھاگ کر اپنی ماں کی گود میں چھپ گیا ۔

"ماں ! ماں !" سسکیاں لیتے ہوئے قمر کہنے لگا ۔

"میری ماں کہو ! قمر میری ماں"

"میری پیاری ماں ! میری پیاری ماں"

"آہ ! کتنا میٹھا پیارے قمر میرے بچے اور کہو"

"میری پیاری ماں مجھے ان بھیڑیوں سے بچاؤ ! یہ مجھے کھانا چاہتے ہیں"

"میرے سینہ سے لگ جا میری ماں ! میرا بچہ قمر ۔ آہ اب میرے جگر کی آگ کم ہوئی ، ایک دفعہ اور میرے سینہ سے لگ جا میرے بچے ، اور ایک بار اور"

"اچھا قمر ٹھہر جاؤ ورنہ جس کام کیلئے آئی ہوں وہ نامکمل رہ جائیگا"

"عذرا !" بوڑھے سے مخاطب ہو کر الماس بولی

"تم موت سے بالکل قریب ہو تم سے دغا کی اور جھوٹ کی کبھی امید نہیں کر سکتی ۔ اتنے سال سے تم نے میرا راز پوشیدہ رکھا ، کیوں ٹھیک ہے نا"

"جی ہاں ملکہ عالم ! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہاں خانقاہ میں میرے بھائی اور یہاں ناصر کے سوائے اس راز کو کوئی بھی نہیں جانتا"

"اور تم قمر میرے پیارے بچے !" اس نے اپنی ماستا بھری نظریں

تمر پہ چبا کر کہا "کیا میں تم سے یہ امید رکھوں کہ تم تا زندگی اس راز کو پوشیدہ رکھوگے۔ یہ راز جو شاید تمہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے مگر تمہاری ماں کی ہستی تباہ کر سکتا ہے"

"بیشک امی جان، آپ اطمینان رکھیں میں خاموش رہوں گا"

"تو پھر تم دونوں جا سکتے ہو! میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں، تمہاری خانقاہ کے لئے ایسے انتظامات کئے جائیں گے کہ تمہارا یہاں آنا مبارک سمجھا جائے گا" اب تم جا سکتے ہو مجھ سے پھر ملنے کی کبھی کوشش بھی نہ کرنا خدا حافظ"

"اور ناصر تمہارے لئے!" الماس نے صرف اپنا ہاتھ ہی اشارے سے ہلا دیا، اسی طرح جیسے ناصر نے تھوڑی دیر پہلے ان بےقصوروں کے لئے بلایا تھا۔

حبشی ناصر پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اسی ناروا سلوک کے لئے جسے ناصر نے عذرا اور قمر کے لئے تجویز کیا تھا۔

از: محترمہ سعیدہ مظہر صاحبہ

اکثر راتوں میں میں نے حسن کے دیئے، جلتے، چمکتے، دمکتے، دیکھے ہیں!
مگر دن میں خورشید حسن کی تابانی نہیں دیکھی ـــ کہیں آنکھیں تو چندھیا نہیں جائینگی؟ دوست! میں حسن کی تاب لا سکتا ہوں؟
کیا میری قوت مشاہدہ میں اتنی بصیرت افروزی ہے؟
کیسے معلوم میں اس مجسمہ حسن وخوبی کو دیکھ کر یہاں رہ بھی سکونگی! یا دور ـــ بہت دور ـــ افسانوں اور خیالوں کی دنیا میں پہنچ جاؤں گی؟
کچھ سمجھ میں نہیں آتا!
اوہ! مجھے کیا! میں کیوں کھپاؤں! مگر؛ مگر؟ ؟......... مگر؟ ؟ ؟
آخر یہ حسن اور یہ عشق ومحبت کیا چیز ہے؟ لوگ اسے نعمت کہتے ہیں۔
پھر اس کا متلاشی پاگل کیوں کہلاتا ہے؟
خیر ہوگا کوئی سبب! ہمیں کیا!!
مگر نہیں! پھر میرے دل میں خواہش کیوں ہوتی ہے کہ میں بھی اسکی "حقیقت" کو پانے کی کوشش کروں!
کیا بات ہوگی؟

جانے کیا بات ہے!
آخر کچھ تو ہوگا ـــ ورنہ کیوں اتنے لوگ یونہی جانیں کھپاتے! ضرور کچھ بات ہے!
لو پھر مجھے یہ کیا ہونے لگا! ـــ میرا دم کیوں گھٹ رہا ہے! ـــ میرا جی کیوں گھبرا رہا ہے!!
میرے سینے میں یہ کیا ہیجان برپا ہے! ـــ یہ کیسی کشمکش ہے! اف بلند معبود!! (باقی بر صفحہ ۴۶)

(مسلسل)

میری حالت دن بدن ابتر ہوتی جاتی تھی، پریذیڈنٹ صاحب کی وفات نے نہ صرف میری سنورتی ہوئی دنیا کو بگاڑ دیا تھا، بلکہ حقیقت میں ایک عظیم ترین انسان کا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا تھا۔ آپ کے زیرِ سایہ رہکر میں انسانیت کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتی تھی، انکی ذات سے دنیا کے انسانوں کا بھلا ہو سکتا تھا، ان انسانوں کیلئے جن کیلئے اس دنیا اور سماج میں کوئی جگہ نہ ہو، جنکی مصیبتیں لاعلاج مرض کی مانند ہوں، جنہیں کوئی راستہ نہ ملتا ہو۔ جن کا دم متعفن بھرے رسم و رواج کے گڑھے میں گھٹ رہا ہو ان سب کیلئے وہ فرشتۂ رحمت تھے۔ سرچشمۂ ہدایت تھے۔ نجات کے پیامبر تھے اور سچے رہبر تھے، میرا کیا تھا ایک زندگی بنتی یا بگڑتی...... مگر ان کی وفات سے تو دنیا سیاہ ہوگئی۔ ہزاروں مستحق انسان سچی زندگی سے محروم اور ناامید ہوگئے اس بات کا مجھے زیادہ قلق تھا۔

ایک روز بھائی جی نے مجھ سے کہا کہ "بہن اسطرح کبتک گھلتی رہوگی اب تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا چاہئے اور والد صاحب کے مشن کو پورا کرنے میں لگ جانا چاہئے، ان سے تمہاری محبت کا یہی تقاضا اور ان کی شفقتوں کا یہی صحیح جواب ہے، ورنہ اس طرح افسردہ و غمگین رہنے سے ان کی روح بے چین رہیگی۔ ماں باپ سدا کسی کے زندہ نہیں رہتے، پھر تمہارے باپ تو تمہارے لئے اتنا چھوڑ گئے ہیں کہ ساری عمر تمہیں کسی بات کی تکلیف نہیں ہو سکتی"

جب کوئی تسلی دیتا ہے کچھ اور بھی رونا آتا ہے

کے مصداق میں اور بھی رو پڑی اور جواب دیا "بھیا! اب مجھے تو ایک پائی کی بھی ضرورت نہیں، جب ایسی مہربان ہستی کے سایۂ شفقت سے ہی محروم ہوگئی تو اب میں دولت دنیا اور روپیہ جیسی حقیر چیز کو لیکر کیا کروں—؟

میں نے روپیہ لینے سے انکار کر دیا مگر بھائی جی نے میرے نام سے بنک میں جمع کرا دیا لیکن مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا، بھائی جی میری ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ ضرورت کا احساس مجھے بعد میں ہوتا تھا جبکہ ضرورت پوری ہو چکی ہوتی —— میں اپنے ان محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کیلئے الفاظ نہیں پاتی انہوں نے مجھے پھولوں کی طرح رکھا۔

میں نے پہلے سے ہی پارٹی کا لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا تھا، اب میں نے اخباروں میں مضامین لکھنا شروع کر دیئے، اور عملی کام بھی کرنے لگی، میرے مضامین سے پارٹی کے لوگوں کا جوش و خروش اور بڑھ گیا اور کام زور و شور سے شروع ہوگیا، میری قوم کے لوگ اس سے بری طرح بھڑک گئے۔ اور دھمکیوں کے خطوط مجھے بھیجنے لگے ساتھ ہی اخباروں میں میرے خلاف مضامین لکھنا شروع کر دیئے، میری باتوں کا کوئی معقول جواب تو دیتا نہ تھا البتہ مجھے بری بری گالیاں، میرے کیرکٹر پر حملے کرنا ان کا کام تھا۔ میرے چند خطوط جو میں نے کسی وقت علیگڈھ والے صاحب کو لکھے تھے اس

مفہوم کے کہ " مجھے اس جہنم سے نجات دلاؤ " اخباروں میں چھاپے گئے ، ان پر حاشیہ آرائیاں کی گئیں ۔

اپنی پارٹی میں میری قدر و منزلت بڑھتی گئی مگر شہر میں میری قوم کی میرے خلاف سرگرمیاں بڑھ گئیں ، اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے پارٹی کا وہ شرارت پسند ، حاسد اور میرا مخالف عنصر ابھرنے لگا بالخصوص عورتیں مجھے تیز تیز نظروں سے گھورا کرتیں اور کہتیں کہ اسکی وجہ سے پارٹی کو پریزیڈنٹ صاحب کی موت کا عظیم نقصان اٹھانا پڑا اگر یہ نہ ہوتی تو اتنا بڑا حادثہ ہرگز نہ ہوتا ۔ دو ایک حاسد عورتوں نے تو جاکر بھابی صاحبہ سے یہ بات بھی کہی کہ " اب تم اپنے سہاگ کی خیر مناؤ " باپ کو تو دشمن محض اس لڑکی کی وجہ سے مار ہی چکے اب چونکہ یہ لڑکی تمہارے پاس رہتی ہے ہم نے سنا ہے کہ دشمن تمہارے شوہر کو بھی مارنے کی فکر میں ہیں ، اس بات سے بھابی بیچاری گھبرا اٹھیں ، اگرچہ انہیں مجھ سے بہت محبت تھی مگر بالآخر شوہر کی محبت بچوں کا خیال گھر کی تباہی کا خوف اسپر غالب آیا ۔ اب میرے لئے اسکے سوائے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ بھائی کے گھر کو چھوڑ دوں ، مگر مصیبت یہ تھی کہ بھائی نہ مانتے تھے اور وجہ پوچھتے تھے اب میں بھلا انہیں کیا بتاتی ؟ —— بھابی ، بھائی کے مزاج سے خوب واقف تھیں اسلئے انہوں نے بھائی سے تو کچھ کہا نہیں مگر مجھ سے اکثر اپنی تشویش کا ذکر کیا کرتیں ۔ بہرکیف صلاح یہ ٹھہری کہ میں سب کام چھوڑ کر تھوڑے دنوں کے لئے اس تعلیمگاہ میں چلی جاؤں جو خاص پارٹی کے اصولوں کے مطابق بنائی گئی ہے ۔ یہ تعلیمگاہ پریزیڈنٹ صاحب نے اپنی نگرانی میں تیار کرائی تھی ، ہمالیہ کے دامن میں گنگا کنارے گھنے جنگل میں منگل بنا دیا تھا ۔ اس تعلیمگاہ کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا چودہ چودہ میل تک کوئی شہر نہ تھا ۔ ہاں کہیں کہیں گاؤں نظر آجاتے تھے چاروں طرف گنگا کی مختلف دھارائیں تھیں ۔ یہ جگہ بہت پر فضا اور خوبصورت تھی ۔ اور پارٹی کا قلعہ مانی جاتی تھی ۔ اسکول اور کالج کی شاندار عمارتیں بورڈنگ ہاؤس ۔ ہسپتال ۔ میڈیکل کالج ۔ لائبریری مطبخ ۔ گودام ۔ تفریحگاہیں ، گنگا میں نہانے کے گھاٹ ، ورزشگاہیں ۔ اسکے علاوہ کچھ دور پر ماسٹروں اور پروفیسروں کے مکانوں کا سلسلہ غرضکہ چاروں طرف بل کھاتی لہراتی ہوئی گنگا ، گھنے جنگل اور ہمالیہ کی اونچی اونچی چوٹیاں اور بیچ میں یہ پربہار اور بارونق چھوٹی سی بستی تھی ۔ اور بڑے امن و امان کی جگہ مانی جاتی تھی ۔ کیونکہ طلبار ، پروفیسروں اور تعلیمگاہ کے ذمہ دار حضرات کی نیکی ، بہادری اور عظمت کا چاروں طرف شہرہ تھا ۔ مجھے بھی بھائی جی اس جگہ لیکر پہنچے اور میڈیکل کالج کے پرنسپل کے ساتھ والے بنگلے میں میرے رہنے کا انتظام کر دیا ۔

اس جگہ بھی میری بڑی آؤبھگت ہوئی ، یہ ماحول خاص علمی ماحول تھا ، یہاں پہنچکر مجھے اپنی علم کی کم مائیگی کا احساس ہوا ۔ یہاں کے فلسفہ کے پروفیسر سے میں نے فلسفہ پڑھنا شروع کر دیا اور انگلش کے پروفیسر سے انگلش پڑھنا شروع کی

بھائی جی تو مجھے ان لوگوں کے سپرد کر کے دو دن بعد واپس چلے گئے ۔ میں بچے اور ایک ماما اپنے بنگلے میں رہتے ۔ مہینہ بھر تو یہاں دعوتیں کھاتے گذرا اسکے بعد مطبخ سے ناشتہ اور کھانا وغیرہ آجاتا ۔ اور ہم دن بھر پاس پاس کے جنگلوں کی سیر کرتے گنگا میں نہاتے اور کتابیں پڑھا کرتے ۔ اس موقع پر میں اپنے ان محترم پروفیسر کا ذکر ضرور کر دینا چاہتی ہوں جن کے ذمے مجھے انگلش پڑھانا تھا ۔ یہ ڈبل ایم اے تھے اور فرشتہ صفت انسان تھے ۔ نہایت سادہ زندگی کو پسند کرتے اور اپنے شاگردوں کو بھی سادہ زندگی بسر کرنیکی نصیحت کیا کرتے ۔

گھر چھوڑنیکے بعد اگرچہ میری شوقینی اور تکلف کی عادت کم ہو گئی تھی اور میں اپنے آپ کو بہت سادہ انسان سمجھتی تھی صرف ایک عادت نہیں چھٹی تھی وہ یہ ایک سینٹ (Seent) بہت لگاتی تھی اور پھول پہنتی تھی ، بچپن سے لیکر اسوقت تک خوشبو سے مجھے عشق رہا ہے ۔

لاکھ رنج و غم میں گرفتار ہوں میرا کھانا پینا چھوٹ جاتا ہے مگر خوشبو لگانا نہیں چھوٹتا ۔ فطری طور پر میں اسے زندگی کی سب سے زیادہ ضروری چیز سمجھتی ہوں ۔

جب میں پروفیسر صاحب سے ملنے گئی اسوقت چونکہ سردیوں کا موسم تھا میں ساڑھی کے اوپر اوورکوٹ (Over Coat) اور موزے بوٹ پہنے ہوئے تھی ، اس زمانہ میں چشمہ بھی لگاتی تھی ، ہندوستان میں نہ جانے کیوں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں چشمہ لگانے کو کوئی بہت اچھی بات سمجھتے ہیں میں بھی اُن میں سے ایک تھی حالانکہ چشمہ یا تو بینائی خراب ہونے کی صورت میں لگایا جاتا ہے یا بڑے بوڑھوں کی چیز ہے ۔ یہ تو مجھے یاد نہیں رہا کہ چشمے کی ضرورت میری آنکھوں کو تھی یا نہیں اتنا مجھے یاد ہے کہ زبردستی اپنی آنکھوں میں خرابی سوچ سوچ کر میں نے شوقیہ لیا تھا ۔ چونکہ چشمہ کا سنہرا فریم چہرے پر مجھے بھلا لگتا تھا اور چشمے سے چہرہ ذرا باوقار بھی معلوم ہوتا تھا ۔

پروفیسر صاحب کا کہنا تھا کہ میرے آنے سے دو تین منٹ پہلے انہیں اس خوشبو کی مہک آ گئی تھی جو میں لگائے ہوئے تھی میں پروفیسر صاحب کے کمرے میں پہنچی ۔ اور آداب کر کے بیٹھ گئی پروفیسر بہت خاموش سے تھے انہوں نے اگرچہ تواضع کے طور پر ایک گلاس دودھ کا منگوا کر پیش کیا مگر کافی بے رخی سے پیش آئے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ تمہارے بھائی نے مجھ سے کہا ہے میں تمہیں "انگریزی ادب" پڑھاؤں ۔ لیکن قبل اس کے کہ میں تمہیں پڑھاؤں چند شرائط پیش کروں گا اگر تمہیں منظور ہوئیں تو پڑھائی شروع ہو جائیگی

شام کو میں تمہیں شرطیں لکھ بھیجوں گا ، دو دن تم اس پر غور کر لینا اتر سوں صحیح جواب دیدینا تمہارے جواب پر پڑھائی منحصر ہے۔

میں بہت اچھا کہہ کر وہاں سے چلی آئی ، شام کو پروفیسر صاحب کا رقعہ آیا ۔ اسمیں لکھا تھا کہ "علم کے متلاشی انسان کو بالکل سادہ زندگی بسر کرنا چاہئے ، اس لئے سب سے پہلے تمہیں اپنا موجودہ طرز زندگی بدلنا ہوگا ۔ جب تم پڑھنے آؤ تو بے کناری کی کھدر کی ساڑی اور کھدر کا پوری آستینوں اور بند گلے کا کرتا ہو ، پیروں میں سادہ سی چپلیں ، کھڑاؤں یا سلیپر ہوں تاکہ تم کمرے میں آتے وقت انہیں باہر اتار کر آسکو ۔ اس روز تم بوٹ پہنے ہوئے میرے کمرے میں آ گئی تھیں حالانکہ میرا کمرہ بہت صاف تھا اور تمہارے پاؤں میلے نہیں ہو سکتے تھے ، دوسری بات یہ کہ تم خوشبو لگانا بالکل چھوڑ دو ۔ سر پر پھول بھی مت لگاؤ ، پھولوں کو توڑنا گنوارپن ہے ، یہ شاخ پر لگے ہوئے زیادہ اچھے معلوم ہوتے اور دیر تک تر و تازہ رہتے ہیں اور فضا کو معطر بنائے رکھتے ہیں ۔ انہیں شاخ سے توڑ کر انکی مختصر سی عمر کو اور بھی کم کر دینا کہاں تک مناسب ہے ؟ انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ تمہاری زندگی میں مغرب کی تقلید نمایاں طور پر دیکھتا ہوں یہ مجھے پسند نہیں ۔ میں تمہیں ایک سچی ہندوستانی دیوی دیکھنا چاہتا ہوں ، کئی ایسے الفاظ بھی تھے جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا : کہ پروفیسر صاحب اس امر سے میری عزت اتنی نہیں کرتے جتنی کہ کرنا چاہئے کہ میں اپنے شوہر کو کیوں چھوڑ آئی ۔ ان کا خیال تھا کہ ہر عورت کو ستی ساوتری بننا چاہئے ۔ ویسے تو میں بھی پاکیزہ زندگی ، کی دل سے قدردان تھی مگر شوہر پرستی اور ان معنوں میں ستی ساوتری بننا گناہ سے کم نہ سمجھتی تھی چونکہ میں تو شوہر کی دشمنوں میں سے تھی ، شوہر کے روپ میں مرد سے مجھے اتنی نفرت تھی جتنی کے سانپ بچھو سے بھی بھی نہیں ہو سکتی ۔ میں نے پروفیسر صاحب کی اور تو سب باتوں کو بلا چون و چرا آمنا و صدقنا کہا مگر اس بات پر بگڑ گئی ۔ اور صاف لکھ دیا کہ ہندوستانی عورتوں میں سے "شوہر پرستی" کو بیخ و بنیاد سے

اکھاڑ دینا میں نے اپنی زندگی کا مقصد قرار دے رکھا ہے۔
ایک مجھے خوشبو چھوڑنا بہت شاق گزرا۔
"شوہر پرستی" اور "شوہر دشمنی" پر میری اور پروفیسر صاحب کی تحریری بحث بھی چل گئی۔ مگر چونکہ میں نے ان کی سب نصیحتیں مان لی تھیں لہٰذا انہوں نے مجھے پڑھانا منظور کر لیا۔
چوتھے دن میں انکی ہدایت کے مطابق موٹے کھدر کا لباس پہنکر گئی خوشبو بھی نہیں لگائی۔ پھر بھی پروفیسر صاحب نے کہا کہ خوشبو آتی ہے۔ میں نے کہا صابون کی آتی ہوگی، اس پر انہوں نے مجھے کھلی سے نہانے کی ہدایت کی، اور پوچھنے لگے کہ چشمہ کیوں لگاتی ہو، میں نے کہا آنکھیں کمزور ہیں، انہوں نے چشمہ لیکر دیکھا تو چشمہ کے شیشے برائے نام یا ورکھتے تھے انہوں نے کہا کہ تمہاری آنکھوں کو چشمے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(باقی)

ریویو

بھروسہ

پروڈیوسر ——— منروا موویٹون

افسانہ۔ مکالمے اور گانے ——— ایل۔ سی۔ بسمل

ڈائرکشن ——— مسٹر سہراب مودی

حاز نمائش ——— منروا ٹاکیز

اداکار:— چندر موہن۔ سردار اختر۔ مظہر خان۔ شیلا۔ مایا ایرچ تارا پور نول وغیرہ۔

منروا موویٹون کی یہ فلم بلاشبہ سنہ ۴۰ء کا شاہکار کہی جا سکتی ہے، چونکہ اسمیں پڑی ہوئی لکیر کو نہیں پیٹا گیا بلکہ کہانی ایسی منتخب کی گئی ہے جسمیں انسان اور اسکے جذبات، جذمات کے بے راہروی اور لغزش ضمیر کی سرزنش اور عقل کی ناکام رہبری دکھائی گئی ہے۔ انسان جرارت کر کے گناہ کر بیٹھتا ہے، جذبات کے طوفان اتر جانے کے بعد ضمیر کی ملامت اسے بےچین کر دیتی ہے۔ سوسائٹی کے سخت قوانین کیوجہ سے اعتراف گناہ کی سکت نہیں۔ ایسے موقعہ پر عقل ضمیر کے مطالبہ کو ٹھکرا کر راستہ دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر ضمیر کے خلاف چلکر عقل کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔
اس فلم کا افسانہ بہترین افسانہ ہے۔ مکالمے شستہ اور برجستہ ہیں گانے بھی اچھے ہیں۔ منروا کی فلموں میں سب سے زیادہ خصوصیت زبان کی ہوتی ہے، مسٹر سہراب مودی چونکہ اردو زبان سے خاص شغف رکھتے ہیں اسلئے اپنی فلموں میں بھی اچھی اردو پیش کرتے ہیں۔ اس کیلئے ہم مسٹر سہراب مودی کو مبارکباد دیتے ہیں کہ بمبئی بھر کے نگار خانوں کی فلموں سے بحیثیت زبان خاص طور پر انکی فلمیں ہمیشہ بہتر ہوتی ہیں۔ اور اسی لحاظ سے کامیاب رہتی ہیں چونکہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں سمجھی جاتی ہیں اور اسی لئے لوگ شوق سے دیکھتے ہیں چونکہ اس فلم کی بنیاد یعنی اسٹوری میں جدت ہے اسلئے ساری فلم میں جدت پائی جاتی ہے جو باعث دلکشی ہے۔
ڈائرکشن اعلیٰ درجہ کی ہے۔ فوٹو گرافی اور صدابندی عمدہ ہے۔
چندر موہن کی اداکاری فلم کی جان ہے۔ مظہر خان کی اداکاری حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ سردار اختر۔ ایرچ تارا پور۔ مایا۔ شیلا کی اداکاری بھی قابل داد ہے۔ یقین ہے کہ یہ فلم سارے ہندوستان میں اور ہر طبقے کے لوگوں میں بے حد پسند کی جائیگی۔

(بقیہ مضمون الجھن) ———

کچھ سمجھ میں نہیں آتا   آخر یہ حسن و محبت   کیا ہیں؟ کیا ہیں؟! ہاں کیا ہیں؟!؟
نیلگوں آسمانوں کے اس پار جگمگاتے عرش پر رونق افروزیاں کرنیوالے معبود!
مجھے بتا؟   مجھے بتا میں کیا کروں؟؟
اس دل کی "الجھن" کو کسطرح دور کروں؟؟
اس بےچین خواہش" کو کس طرح تسکین دوں؟
کیا کوئی ایسی صورت ہے کہ میں "ان کے جلوے بے نقاب" دیکھ سکوں؟!؟
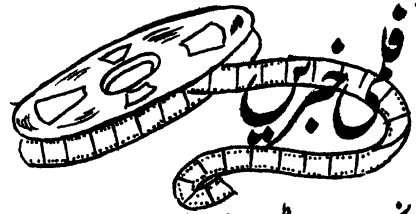
رنجیت مووی ٹون کی فلم " پاگل " بہت کامیاب رہی ۔ اب رائل اوپیرا ہاؤس میں رنجیت کی نئی فلم " مسافر " بڑے زور شور سے چل رہی ہے ۔ سٹوڈیو میں فلم " دیوالی " بالکل تیار ہے ۔

بمبئی ٹاکیز کا " بندھن " راکسی ٹاکیز میں نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے ۔ اسمیں لیلا چٹنس اور اشوک کمار کام کرتے ہیں ، یہ فلم " کنگن " سے یقیناً بازی لیجائیگی ۔ سٹوڈیو میں فلم " نارائنی " جس میں دیویکا رانی کام کرتی ہیں طیار ہو رہی ہے ۔

نویگ چترپٹ کا " لینڈو " ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں بڑی کامیابی سے چل رہا ہے ۔ اسٹوڈیو میں " امرت " نام سے مسٹر ونائک کی زیر نگرانی ایک فلم تیار ہو رہی ہے ۔ اس کے ہندی مکالمے اور گانے پنڈت اندر لکھ رہے ہیں ۔

نیشنل سٹوڈیوز کی " عورت " اسوقت تک یعنی سولھویں ہفتہ میں بھی بڑے زور شور سے پانچ سینما میں چل رہی ہے ، اسٹوڈیو میں مسٹر کاردار کی پکچر " پوجا " جس میں سردار اختر ، ظہور راجہ ، اور ستارہ کام کرتے ہیں ۔ قریب قریب تیار ہے ۔ ڈائرکٹر دریندر ڈیسائی " سنسکار " کی تیاری میں مصروف ہیں ، یہ ایک بہت ہی اہم سوشل پکچر ہوگی ۔ ڈائرکٹر دریندر " رادھکا " فلم بھی تیار کر رہے ہیں ، انہوں نے ایک سوسائٹی گرل مس نلنی جے ونت کا انتخاب کیا ہے ۔

پربھات فلم کمپنی کا " سنت گیانشور " سنٹرل ٹاکیز میں بڑی کامیابی سے چل رہا ہے ۔ اسٹوڈیو میں مسٹر شانتارام " پڑوسی " کی تیاری میں مصروف ہیں ۔ اس میں مظہر خاں اور داتے کام کرتے ہیں ۔ " سنت سکھو " بھی طیار ہو رہا ہے ۔ اسے مسٹر ڈاملے ڈائرکٹ کر رہے ہیں ۔ " عمر خیام " کی طیاری بھی بڑے اہتمام سے ہو رہی ہے ۔

واڈیا مووی ٹون کی " ڈائمنڈ کوئین " بڑی شان و شوکت سے امپیرئل ٹاکیز میں دکھائی جا رہی ہے ۔ " راج نرتکی " کی طیاری ہو رہی ہے ۔

پرکاش پکچرز کے " نرسی بھگت " کا ٹریلر کئی سینماؤں میں دکھایا جا رہا ہے ٹریلر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلم " تکارام " کی یاد تازہ کردیگی ۔ خیال ہے کہ یہ فلم ستمبر کے پہلے ہفتہ میں کرشنا ٹاکیز میں نمائش کیلئے پیش کیجائیگی ۔ " نرسی بھگت " میں وشنو پنت پاگنس اور درگا کھوٹے کام کرتے ہیں ۔ کمپنی نے " مالا " اور " راکھی " دو اور فلمیں طیار کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے ۔ مسٹر مغنی " نرسی بھگت " کی پبلسٹی بڑی جدت ، محنت اور قابلیت سے کر رہے ہیں ۔

منروا مووی ٹون کا تازہ شاہکار " بھروسہ " منروا ٹاکیز میں بڑے زور و شور اور کامیابی سے دکھایا جا رہا ہے ۔ اسکی اسٹوری مسٹر سہراب مودی کی ڈائرکشن ، اور چندر موہن کے کام کی خاص طور پر تعریف کیجا رہی ہے ۔ اسٹوڈیو میں " شہید ناز " کی شوٹنگ جاری ہے اسکے لئے مسٹر مودی نے حیدرآباد دکن سے ایک نہایت اعلیٰ اردو بولنے والی اداکار کا انتخاب کیا ہے ۔ اسکے بعد " سکندر اعظم " فلم بنائی جائیگی ۔

کلکتہ فلم ایکسچنج نیو تھیٹرز کی " ہار جیت " کا ٹریلر کئی سینماؤں میں دکھایا جا رہا ہے ۔ پکچر بالکل طیار ہے ، اس میں کنن بالا ، پہاڑی سانیال نیمو کام کرتے ہیں ، ڈائرکشن امر ملک کی ہے ، یہ پکچر عنقریب بمبئی میں دکھایا جائے گا ۔

برٹش مووی ٹون نیوز ۔ آجکل بمبئی کے تقریباً ہر ہندوستانی سینماؤں میں جنگی خبروں کی تصاویر دکھائی جاتی ہیں یہ خبریں اسی انداز میں پیش کیجاتی ہیں جیسا کہ انگلش سینماؤں میں برسوں سے دکھائی جا رہی ہیں ۔

اِن نیوز کی فوٹوگرافی تو اعلیٰ ہوتی ہی ہے ، چونکہ یہ کام ماہرین کے ہاتھوں سر انجام پاتا ہے مگر یہ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ اسکی ساؤنڈ ریکارڈنگ جو ہندوستانی میں طیار کیجاتی ہے بہت ہی اچھی اور صاف ہوتی ہے ۔ ان خبروں کی زبان بھی سلیس ، شستہ اور بامحاورہ ہوتی ہے ۔

منروا موویٹون کی شاندار پیشکش
MINERVA PRODUCTION
۲۵ اگست ۱۹۴۰ء سے دکھایا جارہا ہے، اور جس نے ایکبار دیکھا بار بار دیکھنے کیلئے مجبور ہوا!
زندگی کی کشتی "بھروسہ" کے پتوار سے چلتی ہے۔ اگر یہ پتوار ٹوٹ جائے تو؟............؟
زندگی کی مکمل ترجمانی چلتی پھرتی تصویروں کی زبانی
۱۹۴۰ء کا سوشیل پکار
بھروسہ
نیا افسانہ
نرالا اسلوب بیان
ڈائرکٹر:-
سہراب مودی
اداکاران:-
چندر موہن - سردار اختر
مظہر خان - شیلا
مایا دیوی
نول - گلاب - ایچ تاراپور
منیکا رام آپٹے - ابو بکر
غلام حسین
اس فلم کے تمام گانے
"ہز ماسٹرس وائس" ریکارڈوں پر
مل سکتے ہیں!
منروا ٹاکیز
اوقات روزانہ:- ۴ - ۷ - ۱۰ بجے شب
سنیچر اتوار اور تعطیل کے دن ۱ بجے زائد کھیل۔

تب
اُف - اوہ!
"بدہضمی نے مجھے مار ہی ڈالا تھا - میں گھر میں نہایت افسردہ اور مضمحل
رہا کرتی تھی اور اپنے بچوں سے بھی بے پروائی برتتی تھی - میں اپنے آپ کو
اتنا بیمار سمجھتی تھی کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟"
اب
آہا - ہاہا
"جب سے میں نے کروشن سالٹ کا استعمال شروع کیا ہے ہر چیز بدل گئی ہے،
میری پرانی بدہضمی اب مجھے بالکل پریشان نہیں کرتی، اب مجھ میں اتنی
طاقت اور تازگی ہے کہ میں گھر کا سارا کام کرتی ہوں اور بچوں کیساتھ
ہنسی خوشی کھیلا کرتی ہوں اور زندگی بھلی معلوم ہوتی ہے — کروشن کا شکریہ"
کروشن سالٹ جسم کو صحیح حالت میں رکھنے کا قدرت کا اپنا طریقہ ہے،
اس میں جگر اور گردوں کو طاقت دینے کے لئے چھ قسم کے نہایت ضروری
نمک ہیں جس سے جگر اور گردے باقاعدہ کام کرتے ہیں - کروشن اندرونی
طور پر تمام جسم کی صفائی کرتا ہے اور سارے جسمانی نظام کو قاعدے میں رکھتا ہے -
آپ کو صرف تھوڑی سی مقدار میں اسے روزمرہ استعمال کرنا چاہئے۔
کروشن سالٹ آپ کو تمام بڑے کیمسٹوں، اسٹورز، اور بازار میں مل سکتا ہے۔
کروشن سالٹ کا شکریہ
KRUSCHEN SALTS
A PERFECT DIURETIC APERIENT
SUITABLE FOR PERSONS SUFFERING THE PAINS OF RHEUMATISM AND GOUT AND FOR HABITUAL CONSTIPATION WITH INACTIVE LIVER.
E. GRIFFITHS HUGHES LTD
MANCHESTER, ENGLAND
KRUSCHEN
SALTS
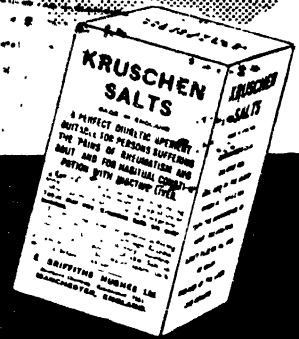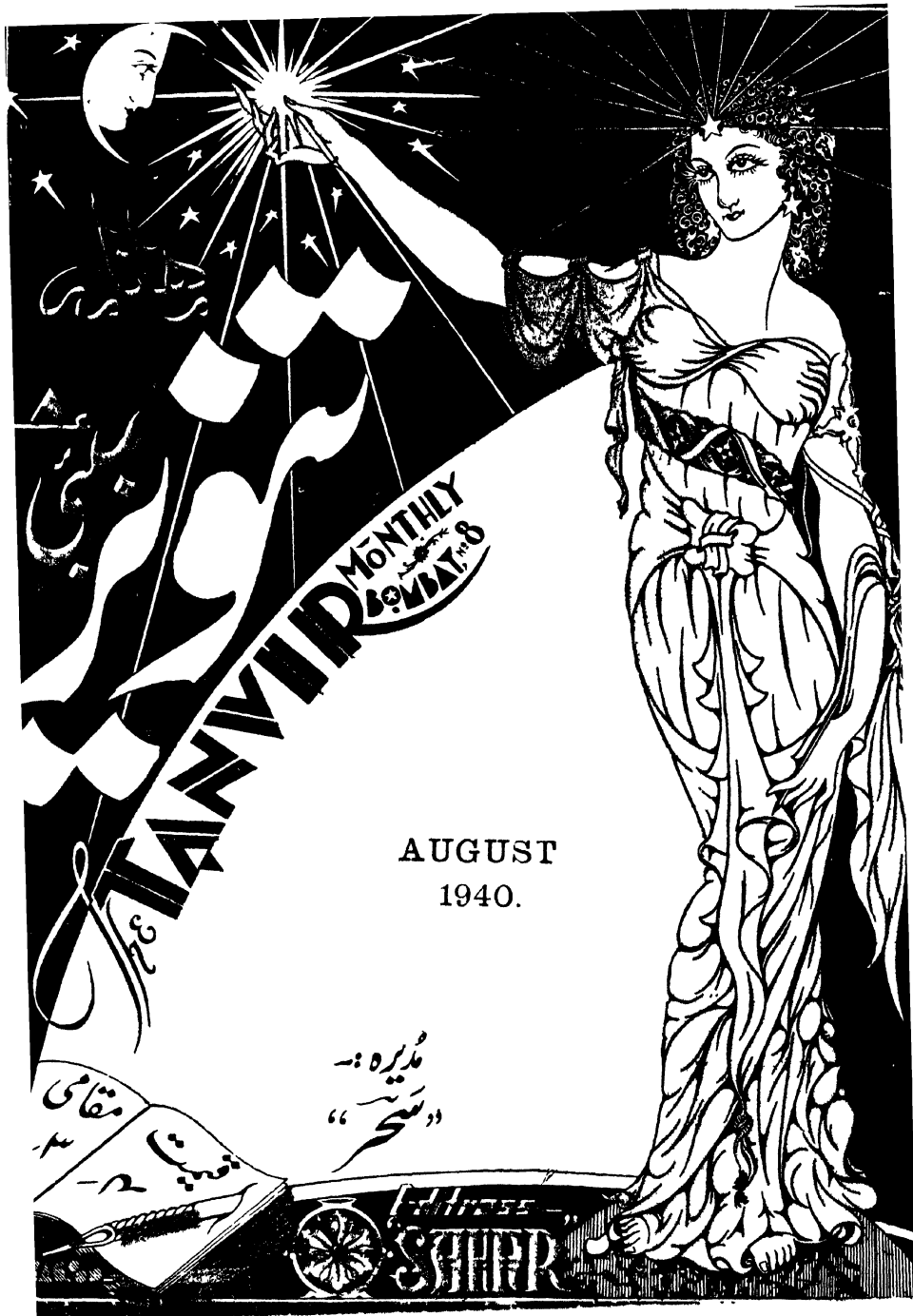
The TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, No 8
AUGUST
1940.
مُدیرہ :-
"سحر"
Address —
"SEHER"

(Congress President).

Millions of freedom loving Muslims respect & love him, but in the eyes of "Qaid-e-Azam" he is only a "showboy".

مدیرہ:- سحر
نائب مدیرہ:- انوری خانم
ماہنامہ تنویر بمبئی
جلد ۴
شمارہ ۸
سالانہ معہ محصول ڈاک وی پی خرچ ... ۵ روپیہ
قیمت فی پرچہ
ممالک غیر سے ... دس شلنگ
Tanvir

فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۱۹۴۰ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی نمبر ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ "تنویر" نمبر ۸ ساکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا۔

غزل

از جناب سید علی اصغر نظامی صاحب

تیرے بیمار محبت سے بسر ہو نہ سکی
رات اس ظلم کی آئی کہ سحر ہو نہ سکی

التجا کا ہمیں انداز نہ آیا افسوس
کیا کہیں! اُن سی عنایت کی نظر ہو نہ سکی

میری حسرت کیلئے وجہ ندامت ہی رہی
وہ دعا، جو کبھی ممنون اثر ہو نہ سکی

ہم کو حسرت ہی گناہوں کی جوانی میں رہی
رات اسطرح سی بھیگی تھی کہ تر ہو نہ سکی

دم آخر، وہ ہمیں پوچھنے آئے تھے ضرور
بات ہی ہم سے کوئی وقت سفر ہو نہ سکی

ایسے دیوانوں قسمت پہ کوئی کیا روئے
خاک اڑایا کئے اور خاک بسر ہو نہ سکی

ہاں وہی، جسکو محبت بھی کہا کرتے ہیں
یہ وہ بازی تھی کہ سر دیکے بھی سر ہو نہ سکی

تیرے بالیں پہ کوئی آیا، گیا بھی، لیکن
مرنیوالے، تجھے اتنی بھی خبر ہو نہ سکی

کیا کروں تھی جو میری بات میں قسمت حائل
تھی انہیں بھی وہی منظور، مگر ہو نہ سکی

ہم سے سیکھے کوئی آئینِ وفا اے اصغر
دل کے زخموں کی جگر کو بھی خبر ہو نہ سکی

بمیر تا برہی اے حسود کیں رنجیست
کہ از مشقت او جز بمرگ نتواں زیست

حسد وہ بری بلا ہے کہ اسمیں مبتلا ہو کر انسان دوسرے کو نقصان پہنچانیکی بجائے خود اپنا ہی نقصان کر بیٹھتا ہے اور پھر بھی اس بیماری اور بلائے بے درماں سے نجات نہیں پاتا۔

کچھ دن ہوئے امام الاحرار حضرت مولینا ابوالکلام آزاد نے پرائیوٹ طور پر قائم اعظم مسٹر جناح کو ایک تار کے ذریعے ملنے اور تبادلہ خیال کی دعوت اس غرض سے دی تھی کہ خواہ عارضی طور پر سہی کانگریس اور مسلم لیگ میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے۔ اور اس سے قبل سمجھوتے کیلئے خود مسٹر جناح اور ذمہ دار مسلم لیگی حضرات چیخ و پکار کرتے رہے ہیں۔ کانگرس سے انہیں سب سے بڑی شکایت یہی رہی کہ "وہ مسلم لیگ کو نظر انداز کرتی رہی ہے" پنڈت جواہر لال نہرو اور مہاتما گاندھی۔ سبھاش بابو وغیرہ سے مسٹر جناح کی کئی بارنا کام ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ مگر اس بار جبکہ کانگریس کے مسلمان صدر "مولنا ابوالکلام آزاد نے خود مسٹر جناح کو ملنے کی دعوت دی اسپر مسٹر جناح ایسے آپے سے باہر ہو گئے کہ انہیں اس بات کا بھی خیال نہ رہا کہ اگر کوئی شخص کسی پر اعتماد کرکے کوئی پرائیوٹ بات کہے تو دوسرے کا یہ اخلاقی فرض ہو جاتا ہے کہ بغیر اسکی اجازت کے اس بات کو کسی پر ظاہر نہ کرے۔

قائد اعظم خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت مولنا ابوالکلام آزاد کی سیاسی پوزیشن سے بڑھکر مذہبی پوزیشن ہے۔ وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام کی ایک تسلیم شدہ عالم و برگزیدہ ہستی ہیں۔ سیاسی معتقدین کے علاوہ ہندوستان میں اُن کے مذہبی عقیدتمندوں کی بھی کمی نہیں، وہ مفسر قرآن ہیں، مذہبی علم و فضل میں مسٹر جناح کو ان سے کوئی نسبت ہی نہیں، اگر چیلنج کیا جائے تو مسٹر جناح قرآن کی کوئی ایک سورت بلا لکان اور صحیح پڑھکر اسے نہیں سمجھ سکتے۔ نہ اس کے معنی بیان کرسکتے اور تشریح کرسکتے ہیں۔ کسی مذہبی اسلامی مسئلہ کے متعلق اگر ان سے استفسار کیا جائے تو وہ منہ تکنے کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

اپنی کمتریت اور مولانا کی فوقیت نے ہمارے قائد اعظم کو جھنجلا دیا، بدقسمتی سے وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا لیڈر بھی سمجھتے ہیں اسلئے جذبۂ رقابت بھی بھڑک اٹھا۔ اور آپنے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ مولنا آزاد کا تار اور اپنا جواب اخبار میں شایع کرا دیا۔ اپنے تار میں جو گلفشانیاں کی ہیں اسکے متعلق ہم کیا لکھیں، صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرینگے کہ یہ تار ایک ایسا آئینہ ہے جسکے الفاظ اور لہجے میں مسٹر جناح کے اخلاق اور پوزیشن کو بہت اچھی طرح سے دیکھا جاسکتا ہے۔ حسد اور رقابت کے اندھے جوش میں یہ تیر انکی کمان سے ایسا نکل گیا ہے جو واپس نہیں آسکتا۔

بڑے آدمی کی پگڑی اچھالکر یا اسے گالیاں دیکر

خود بڑا بننے کی کوشش آج سے پچاس سال پہلے کا حربہ تھا
آج کی دنیا اتنی بیوقوف نہیں ہے کہ وہ ان شرارتوں کو نہ سمجھ
سکے۔ آج بڑا بننے کے لئے علم و فضل تحمل اور جرأت نیکی اور
قربانی کی ضرورت ہے۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی
کچھ تعداد جو مذہب کی شیدا بھی ہے انہوں نے اپنی باگ ڈور ایک
ایسے انسان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے جو کسی طرح اسلام کی
تعلیم و تہذیب سے واقف نہیں ہے۔ مسلمانوں کی سیاست
مذہب سے علیحدہ نہیں۔ مذہب اسلام سے ناواقف لیڈر
مسلمانوں کا سیاسی لیڈر بھی نہیں بن سکتا۔ ایک سچا مذہبی رہبر عالم دین
ہی مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کرنیکا مستحق ہوسکتا ہے۔

کاش مسٹر جناح اسلام اور مسلمانوں کے محافظ
بننے اور اسلامی تہذیب و تمدن کی دہائی دینے سے پہلے
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا اچھی طرح مطالعہ
کر لیتے کہ وہ کس طرح اپنے مخالفین، اور کفار مکہ سے ہمکلام
ہوتے تھے اور انکے ساتھ ان کا کیا سلوک ہوتا تھا۔

نشہ بندی اور قانونی موشگافیاں:—

کانگریس گورنمنٹ نے اگست ۱۹۳۹ء میں غریب
ہندوستانیوں کی مفلسی کو کچھ حد تک کم کرنے کے لئے بندش
شراب کا جو قانون نافذ کیا تھا اسے کانگریس گورنمنٹ کے
مستعفی ہوجانے کے بعد موجودہ گورنمنٹ نے دس گیارہ
ماہ بعد ناقص قرار دیکر لوگوں کو اس بات کی مکمل آزادی
دیدی ہے کہ وہ جتنا روپیہ چاہیں شراب پی کر برباد کرسکتے
ہیں قرض کی تباہیوں کا شکار بن سکتے ہیں۔ اخلاق و
آداب سے نجات حاصل بدتمیز و بداخلاق بن سکتے ہیں۔
مگر اس روپیہ سے صرف ولایتی یا غیر ملکی شراب ہی
خریدی جاسکتی ہے تاڑی اور دیسی شراب وغیرہ نہیں۔

موجودہ گورنمنٹ نے کانگریس گورنمنٹ کے
فیصلے کے مقابلے میں اپنے ہائیکورٹ کے سپیشل ججوں کی
کی بنچ کے فیصلے کو مان کر یہ قدم اٹھایا ہے۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ آج سے ڈیڑھ سو برس
پہلے آبکاری ایکٹ کیا تھا اور اس میں کتنی دفعات تھیں وغیرہ
ہم تو یہ جانتے ہیں کہ کانگریس نے غریبوں کی مفلسی دور کرنے
اور ان کے اخلاق سدھارنے کیلئے نشہ بندی کا قانون پاس
کیا تھا، موجودہ گورنمنٹ نے مالدار ٹھیکیداروں، ہوٹلوں کے
مالکوں اور ولایتی شراب کے تاجروں کو فائدہ پہنچانے کیلئے
اس قانون کو توڑ دیا اور عوام کے مفاد پر خواص کے مفاد کو ترجیح دی
اپنی اور پرائی گورنمنٹ کا یہ فرق دنیا آسانی سے دیکھ سکتی
ہے ایک تو عوام کو شراب پینے کی تباہیوں سے بچاتی ہے
اور دوسری اس کے برعکس شراب پینے اور تباہ ہونے
کے لئے آسانیاں پیدا کرتی ہے۔

(بقیہ مضمون سرگذشت)

میں بہت مضمحل اور افسردہ رنجیدہ رہنے لگی۔ اور بہت
کمزور اور ناتوان ہوگی۔ پتاجی اور بھائی جی کو اس سے
فکر ہوئی وہ ہر طرح میرا خیال رکھتے تھے۔ اپنا کام چھوڑ کر
دو ایک مہینے کے لئے مجھے پہاڑ پر بھی لے گئے، انہوں نے
بہت کوشش کی کہ میں بحال ہوجاؤں۔

(باقی)

(افسانہ)

عورت

از:- جناب عثمان صحرائی

بڑے ہال کے ریشمی پردے یکبارگی جھلملا گئے،

یہ ہوا کا جھونکا تھا یا ارتعاش حسن! ہیجان یا منطقی اصطلاح میں "مجبور محض" مقاومت کی نفسی تحلیل ہے ارتعاش حسن، ہو یا التہاب جمال، کسی کی پذیرائی لطافت خیال سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتی، قطعًا! یہ ہوا کا خفیف جھونکا ہی تھا۔

پردوں کے پیچھے یعنی ہال کے اندر وہ دونوں

بہت دیر سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

باورچی نے خانساماں کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

شاید آج بیگم نے باہر جانے سے انکار کیا تھا

بالکل یہی بات!

متعجب اور منفعل شوہر نے ایک لمحہ کے لئے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کسقدر زرد پڑ گیا۔ ارتعاش حسن کی تاب جاندار نہیں لاتے، انسان بالکل نہیں۔

بڑی بڑی آنکھیں، لمبے لمبے بال ممکن ہے حسن و خوبصورتی کے اجزا رہوں لیکن اجزائے ترکیبی نہیں ہو سکتے بیگم بھی کسی ایسے جزو خاص کی بنا پر خوبصورت نہ تھی، اسکے کسی عضو کو اس سے علحدہ کر کے اسکی کوئی تعریف نہیں کیجا سکتی تھی۔ مثلًا اسکی آنکھیں اسقدر بڑی نہیں تھیں کہ بجائے خود کسی روایتی معیار کی حامل ہوں لیکن ان حلقہائے چشم میں ایسی پھبتیں کہ چشم ملائک بھی شرما جائے۔

اصنام یونان اور سودنیل کی دوشیزگان کے ثمرات شباب کی بدنام زمانہ خودسری، دلدادگان ہوس کے لئے ایک خطیر لالچ تو ہو سکتی ہے لیکن اہل بینش اس سے متاثر نہیں ہوتے۔ یہ قناعت نقہ نہیں، ذوق صحیح ہے۔ اور بیگم صاحبہ بھی جسکے پیکر جمیل کا ایک ایک نقطہ اپنی جگہ پر موزوں تھا،

۲

مرکز شباب پر تل رہی تھی

بیوی کا حسن ایک "مسلسل قیامت"

شوہر کے جذبات "ایک متلاطم سمندر"

لیکن یہ وقار و تمکنت کا ایک ساکت مجسمہ،

وہ کیف و مستی کی بولتی ہوئی تصویر۔

اس نے دست شوق آگے بڑھایا اور شانے کو اسطرح چھو گیا جیسے اتفاقًا ہاتھ لگ گیا ہو۔ وہ اس انداز سے سمٹ گئی جیسے اسے کسی بھاری خطرے کا احساس ہو گیا ہو

"بیگم!"

"کیا چاہتے ہیں آپ؟"

"تم بہت خوبصورت ہو"

بیگم نے کوئی جواب نہیں دیا وہ اپنی کرسی پر دراز ہو گئی جیسے کوئی شہزادی افسردہ ہو گئی ہو۔

"کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ تمہاری پرستش کیجائے،

آج تم بہت خوبصورت ہو ، بہت ۔ "

"میری بدقسمتی ! "

" تمہاری ، کیا ؟ "

" میری بدقسمتی ، بدنصیبی ، اور یہ بھی سن لیجئے کہ اب مجھے آپ سے کوئی سروکار نہ ہوگا ۔ "

شوہر ہمیشہ سے زیادہ متعجب تھا اور کسی قدر مجروح بھی " کیا مطلب ہے تمہارا ؟ " وہ جھلایا ۔

" کیا مطلب ہے میرا ! سمجھے نہیں ؟ " بیگم بھی تیز ہوگئی تھی ۔ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیکر کہا۔

" اب پھر تم ، ہاں ہیں " تم " ہی کہوں گی ، اپنی پرانی چالوں پر آگئے ہو ! "

مارے حیرت کے اس کا چہرہ فق ہوگیا ۔

وہ قد آور خوبصورت جوان تھا اور عام طور پر ایک بہتر شوہر اور بہترین باپ تصور کیا جاتا تھا " لیکن بات کیا ہے " ؟

" بات یہی ہے " وہ جوش میں آگئی تھی ۔

" آج میں کسی سے نہیں ڈروں گی ۔ خصوصاً تم سے ۔ "

بیگم نے پہلو بدلا اور مقابل ہوکر پہلی مرتبہ اسکی

آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں ، ایسی آنکھیں جن میں صداقت کی چمک تھی ، سچائی کا نور تھا ۔

نظریں تلواروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرائیں ۔ اور اعلان جنگ قبول کرلیا گیا ۔

" اپنی نفس پرستیوں کو یاد کرو ، اپنی ہوسناکیوں کو یاد کرو " وہ پھٹ پڑی " آٹھ سال سے زندگی کے اس عذاب کو بھگت رہی ہوں ، لیکن اب یہ ناقابل برداشت ہوگیا ہے ۔ اس بوجھ کو جسے تم نے زبردستی لادا ہے اور جس کے نیچے میں دبی جارہی ہوں ، اتار پھینکنا چاہتی ہوں ۔ میری سماجی حیثیت ، میری شخصیت ، میرے حقوق ، میری صحت کون سی چیز پر تم نے ڈاکہ نہیں ڈالا ؟ "

وہ دوبارا زرد پڑگیا ۔

" میں نہیں جانتا کہ تم کیا چاہتی ہو ! "

" تم جانتے ہو ! تمہارے ارادے ، تمہارے خطرناک ارادے ، عورت کی زندگی کے لئے ایک مستقل خطرہ ہیں تین مہینے ، صرف تین مہینے پہلے میرے آخری بچہ ہوا تھا ۔ تمہاری مخالفانہ جدوجہد کے باوجود حتی الامکان اپنی صحت اور جیسا کہ تم نے ابھی کہا تھا اپنی خوبصورتی قائم رکھنے میں کامیاب ہوں اور اب .... تمہارے خیال میں پھر ابتدا کرنے کا وقت آگیا ہے ؟ "

" پاگل تو نہیں ہوئی ہو ؟ "

" بالکل نہیں ! آٹھ سال پہلے ہماری شادی ہوئی تھی اسوقت ہمارے سات بچے ہیں ۔ اور تم مزید دس سال تک غالباً اسی رفتار سے چلنا چاہتے ہو ، جس کے بعد دنیا کے عام قاعدے کے مطابق مجھے سپرد خاک کرکے تم حج کو چلے جاؤ گے "

اس نے کسی قدر بیدردی سے اس کا بازو پکڑا ۔

" دیوانی ہوئی ہو ؟ "

" ابھی تک تو نہیں ہوئی ، لیکن ہوجاؤں گی ۔ "

" میں تم سے ایسی باتیں سننا نہیں چاہتا ۔ "

— ۴ —

"تم سنو گے، تمہیں سننا پڑے گا، میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے کہہ لینے دو۔ جب مجھے تمہارے پہلو میں جھونکا گیا تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ چلو زندگی کا ایک ساتھی مل گیا وہ غمگسار بھی ہوگا اور وفاشعار بھی، لیکن میرے تصورات کی دنیا، میرے تخیلات کی دنیا جو مجھے بیحد عزیز تھی تم نے برباد کردی، تم تم اس پر بادل بنکر چھا گئے، میں تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں ساحل کو ڈھونڈھ رہی ہوں، منزل کو پوچھ رہی ہوں، لیکن تم ناخدا بنکر پھر اسی بحر ظلمات میں ڈھکیل دیتے ہو، خضر راہ بن کر بار بار بہکا دیتے ہو، تمہارا کھیل کسقدر خطرناک ہے تم میری زندگی سے کھیل رہے ہو۔

"میری وضعداری اور رکھ رکھاؤ کی ہر جگہ تعریف ہوتی ہے تم جل جاتے ہو مجھے نہیں معلوم کہ تم نے۔ زبردستی کی رقابت مول لی ہے یا تعصبات سے تمہاری آنکھیں اندھی ہوگئی ہیں۔ تم کو میرے حسن وشباب سے دشمنی ہوگئی ہے۔ اسکو تباہ وبرباد کرنے کے درپے ہوگئے ہو........ میں نہیں جانتی کہ دنیا کے اور مرد بھی تمہاری طرح گم کردہ راہ ہیں یا تم ہی ایسے ذہنی ابتذال میں مبتلا ہو، بہر حال تم نے سوچا کہ میری ساری زندگی کو مسلسل افزائش نسل کے عذاب میں مبتلا کیا جائے تا آنکہ میں تھک کر گر پڑوں۔ اوہ! تم کو احتجاج کرنے کی ضرورت نہیں، ——— ہر سال تمہاری سوچی ہوئی تدبیر کے خلاف میں بھرہ رعنائی "زچہ خانے" سے واپس ہوتی اور اس تمنا کے ساتھ واپس ہوتی کہ کچھ دن امن وچین سے گزاروں گی، لیکن پھر تم جلنے لگتے، تمہارے نفس کے جہنم میں آتش وبارود کا ایک طوفان اٹھتا اور مجھے سزا ملنی شروع ہوجاتی

"مجھے پا جانے، مجھ سے مل جانے، مجھے اپنانے کا ذرا بھی شائبہ تمہاری خواہشوں کے اس بے پناہ سیلاب میں ہوتا جسمیں ایک تنکے کی طرح میں بھی جاری ہوں تو جانتے ہو میں کیا کرتی؟ ——— میں اس سیلاب کی سب سے اگلی رو کے ساتھ ہوتی جو پتھروں اور چٹانوں سے اپنا سر ٹکراتی چلی جاتی ہے۔"

— ۵ —

"بچوں سے تمہیں انس ہوگیا ہے، تم ان کو عزیز رکھتے ہو، دعوتوں میں سیر وتماشوں میں اپنے ساتھ لے جاتے ہو، اس لئے نہیں کہ وہ تمہاری اولاد ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ میری شکست اور تمہاری فتح کے نشانات ہیں، تم ان کو دیکھ کر مسرور ہوتے ہو اسلئے نہیں کہ وہ تمہارے بچے ہیں بلکہ اسلئے کہ میری رگوں اور شریانوں سے سینچا ہوا گوشت وخون ہیں۔"

اس نے تیزی سے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"بخدا مجھے اپنے بچوں سے بیحد محبت ہے"

"چھوڑ دیجئے، چھوڑ دیجئے میرے ہاتھ!"

"پاگل!"

———

"تم مجھے مذہبی عورت سمجھتے ہو؟" بیوی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں کیوں؟"

"اور اس کا بھی تمہیں یقین ہے کہ میں خدا اور اسکی کتاب کو مانتی ہوں؟"

"ہاں ہاں"

"کیا میں خدا کو گواہ کرکے کتاب پاک کی کبھی جھوٹی قسم کھا سکوں گی؟"

"غالباً نہیں"

"ذری دیر کے لئے میرے کمرے تک چلو گے؟"

"کیوں"

"معلوم ہو جائے گا ، چلو گے ؟"

"اچھا اگر ایسا ہی ضروری ہے ۔"

ملکوتی نظارہ تھا ۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے صحیفۂ آسمانی تھامے ہوئے جانماز پر قبلہ رو بیٹھی تھی اسکے بدن پر لرزش طاری تھی ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ سسکیوں کے طوفان میں گھر گئی ہے ۔ جب کافی دیر ہوگئی تو شوہر نے آگے بڑھ کر اسکے شانے کو چھوا ، وہ ایک دفعہ کانپ گئی ۔ پھر انتہائی رقت کیساتھ کہنا شروع کیا ۔

"میرے معبود ! تیری زمین کی پہنائیاں ، تیری دنیا کی وسعتیں مجھ پر تنگ کردی گئی ہیں ۔ وہ جابر کم تھا اور میں لاچار و مجبور ، میرے قدم ڈگمگا رہے ہیں مجھے استقامت دے اور چلنے کی طاقت ــــ میری کمزوریاں

— ۶ —

ایک عورت کی کمزوریاں اپنی آپ سزا ہیں ــــ تمہارے" اس نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا ۔ "تمہارے سات بچے ہیں آج خدا کے حضور میں کھڑی ہوں اور اس کے کلام کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ان میں سے ایک بچہ تمہارا نہیں ہے ۔ وہ کونسا بچہ ہے یہ تمہیں کبھی معلوم نہ ہوگا ــــ میں نے اپنے آپ کو جس شخص کے حوالے کیا تھا اس سے مجھے محبت تو کیا انس بھی نہ تھا ۔ محض انتقام کی خاطر یا بدلہ لینے کے واسطے میں نے اپنا جسم ایک اجنبی کے سپرد کیا تھا ۔ اب تم ساری دنیا کو مشتبہ سمجھ لو ۔ لیکن تمہیں کبھی معلوم نہ ہوگا کہ وہ کون تھا ۔

میں عزم گناہ لے کر نہیں آئی اور نہ گناہوں کا کفارہ دینے آئی ہوں ۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ کر چکی اور اب اسپر قطعی نہیں پچھتاتی ــــ تم اسطرح میری طرف آنکھیں پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو ، کیا مجھے مار ڈالوگے ؟ نہیں تم ایسا نہیں کرسکتے ، تم مہذب ہو ، تعلیمیافتہ ہو ، اونچی کرسیوں پر بیٹھتے ہو ، تمہاری رگوں میں مہذب خون ہے ، تم کو اپنے ناموس سے زیادہ تہذیب کا پاس ہونا چاہیئے ایسی باتوں پر جاہل اور اور گنوار کٹ مرتے ہیں ــــ آؤ ، ہم مہذب اس معاملہ کو یوں طے کرلیں ۔ طلاق نہ خلع ، صرف مستقل علحدگی " نہ تہذیب پر کوئی خطرہ نہ عزت پر کوئی آنچ "

وہ ہر گزرنے والے لمحے میں اپنے گلے کے قریب مضبوط اور سخت انگلیوں کی گرفت کا انتظار کر رہی تھی ۔ کم ازکم ایک تیز اور سخت گھونسے کی اسے بہرحال توقع تھی ۔ لیکن لمحات بدستور خاموشی کے ساتھ گذرتے گئے ۔ اور وہ ــــ دفعتاً کمرہ سے باہر نکل گیا ۔

کس قدر مہذب انسان !

بیگم کا ایک اندیشہ بالکل غلط نکلا اور دوسرا بالکل صحیح ۔

اسکی روحانی اذیتیں اسکی تہذیب کا تاوان تھیں وہ ایک عذاب میں مبتلا ہوگیا تھا ۔ اس کے بچے اسے بہت عزیز تھے بیگم سمجھ نہ سکی ، شاید مائیں سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ ایک باپ کو اپنے بچوں سے کسقدر محبت ہوسکتی ہے ۔ لیکن ایک بچہ اس کا نہیں ہے ۔ یہ کس قدر المناک حقیقت تھی ۔

— ۷ —

وہ جس بچہ کی طرف بڑھتا بیم و اندیشے "محبت پدری" پر غالب آجاتے ، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا ۔ کیا روح فرسا واقعہ تھا ، کس قدر الم انگیز سانحہ ۔ وہ گھر چھوڑ رہا تھا ، شہر

چھوڑ رہا تھا، لوگ کہتے ہیں وہ ایک طویل سفر پر جا رہا ہے۔ کام
کی یکسانیت سے اکتا کر، مسلسل مصروفیت سے گھبرا کر جسطرح ہر
بڑے آدمی کا دستور ہے۔

ازدواج کو زندگی کا ایک "لطیف حادثہ" تصور
کیا جاتا ہے جو میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔ زندگی "ہجوم
حوادث" کا دوسرا نام ہے۔ اگر حادثات زندگی سے "ازدواجی
ممکنات" خارج کر دیئے جائیں تو ساری زندگی ایک
"سکوت مطلق" ہو جائے۔

لوگ ہنگاموں کو "گھر کی رونق" سمجھتے ہیں اور
سکوت کو "خانہ ویرانی" لیکن میں سکون کا متلاشی ہوں،
سکوت کی جستجو کر رہا ہوں۔ مجھے حرکت سے نفرت ہو گئی ہے
ہر اس شے سے نفرت ہو گئی ہے جو جنبش کرتی ہو ——
مجھے اس دنیا سے، اس کے چاند اور سیاروں سے،
راتوں کی تاریکی سے دن کے اجالے سے تنفر ہو گیا ہے کہ
یہ سب گردش کرتے ہیں میں پہاڑوں کے جمود پر دریا کی روانی
.... قربان کرتا ہوں اور آبادی کے ہنگاموں کو
ویرانے کی خموشی پر نثار! بلکہ مجھے تو اب اپنے قلب کی
دھڑکن سے بھی وحشت ہونے لگی ہے۔

لوگ کہتے ہیں حرکت میں برکت ہے۔ میں کہتا ہوں
حرکت موت ہے حرکت سے کسی کے عضویات میں طاقت نہیں
پہنچتی بلکہ وہ بقدر حرکت موت کی طرف بڑھتا اور فنا کیطرح
کھنچتا ہے۔ ذرا ہماری آس پاس کی چیزوں پر غور کرو،
پتھر گھس کر فنا ہو جاتا ہے، پانی گرم ہو کر فضا میں ملتا ہے
شرارے اپنی جگہ سے جنبش کرتے ہیں موت کے منہ میں چلے
جاتے ہیں پتھر اپنی جگہ ساکن، پانی منجمد اور شرار سینۂ سنگ
نہ چھوڑتا تو یقیناً ان کی زندگی طویل ہو جاتی وہ عمر خضر پا جاتے
تم جسقدر غور کرو گے اتنا ہی حقیقت سے قریب ہوتے
جاؤ گے اگر آج دنیا ساکن ہو جائے تو کیا ہو گا؟ انسان
وہ سب کچھ پالے گا جو اب پا نہیں سکتا اور منشا ایزدی
پورا ہو جائے گا۔

انسان نے خدا سے بغاوت کی یہ ہو سکتا تھا کہ
اسے جہنم میں پھینکدیا جاتا خلائے عظیم میں ہمیشہ کے لئے گم
کر دیا جاتا لیکن مشیت اسے انتہائی سزا دینا چاہتی تھی۔ اسے
کرۂ ارض پر پھینکدیا گیا جس کے ایک ایک ذرے کے دامن
میں سو سو جہنم چھپے ہوئے ہیں۔

یہ دنیا جسے اب ہم ہماری دنیا کہنے کے عادی
ہو گئے ہیں، قطعی ہماری نہیں ہے۔ کم از کم ہمارے لئے
نہیں بنائی گئی ہے۔ یہاں کے جمادات اور نباتات، یہاں کے
موسم و سال، یہاں کی آب و ہوا اور یہاں کے سارے طبعی
تغیرات انسان کے لئے کسقدر غیر موزوں اور حیوان کیلئے
کسقدر مناسب ہیں۔

پہاڑوں کے غار، جنگلوں کے کچھار اور دشت و
صحرا کی تعمیر کے بعد قدرت کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ گویا قدرت
نے آسائش مخلوق کے لئے محل اور کاشانے تعمیر کر دیئے
انسان ان غاروں اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔
دشت و صحرا کی خاک چھانتا ہے اسکو کہیں امان نہیں ملتی
وہ مجبوراً پہاڑوں پر ڈاکہ ڈالتا ہے، جنگلوں کو لوٹ
لیتا ہے اور اس مال غنیمت سے جو کچھ پتھر، مٹی اور
لکڑی پر مشتمل ہوتا ہے اپنے رہنے کے لئے بڑی محنت

اور جانفشانی سے ایک حقیر مسکن تعمیر کر لیتا ہے (اسے
حقیر ہی کہنا چاہیئے ورنہ دشت وکوہ کی عظمت اسمیں
کہاں ؟) پھر بھی انسان اپنے نام نہاد محلات میں کسقدر
غیر مطمئن رہتا ہے اور حیوان اپنے مسکن میں کسقدر مطمئن !

انسان کی بد مذاقی دیکھو وہ مولی، گاجر،
پتے پلے اور انتہا یہ کہ پیاز اور ادرک تک کھا جاتا
ہے ، حالانکہ یہ بکریوں ، خرگوشوں اور ایسے ہی
دوسرے جانوروں کی غذا ہے ۔ ذرا اناج کے
کھیتوں پر غور کرو، یا یہ چھوٹے چھوٹے پرندوں کی
چونچ کے لئے کسقدر موزوں ہیں ۔ جب انسان گیہوں
اور چاول کھاتا ہے تو یقیناً ان پرندوں کا حق تلف
کرتا ہے ۔ پھر اس چھینے ہوئے مال کو اپنی "خوراک"
بنانے کے لئے غریب کو کتنی زحمتیں اٹھانی پڑتی ہیں ۔
کتنی محنت اور مشقت ، کتنی کوشش اور جد وجہد ۔

— ۹ —

کتنا صبر اور توقعات ، کتنی ہوشیاری اور لیاقت صرف ایک
"لقمہ غذا" کے لئے اسے صرف کرنی پڑتی ہے ——
انسان کے آرام اور ضرورت کی کونسی چیز قدرت کی طرف سے
اسکو مہیا ملی ، ایک معمولی الپن سے لیکر ہوائی جہاز تک غور کرو ۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان ساکن ہو جائے قدرت کو
اس کے لئے "من وسلویٰ" اتارنے میں دیر نہیں لگے گی ۔

وہ چھ سال کے عرصہ میں بہت بڑا شاعر ہو گیا تھا
بہت بڑا فلسفی ہو گیا تھا ۔ بین الاقوامی شہرت کا مالک
ہو گیا تھا ۔ اس کے جدید نظریوں سے دنیا تہہ وبالا ہو ہی
تھی اور اس چھ سال کے عرصہ میں اس کے اعتقادات
کے لحاظ سے دنیا چھ سو سال آگے بڑھ گئی تھی ۔ مگر وہ اپنی
جگہ سے نہ ہلا ۔ اس کا "دماغ" فضل وکمال کی برکت
سے آسودہ اور "دل" فقدان وسکون سے مضطرب
اس کے دماغ سے دلائل وبراہین کا ایک سیلاب دل کی
تسکین کے لئے بڑھتا اور دل بیک جنبش اسکو رد کر دیتا ۔
وہ کبھی سوچتا کہ قدرت اسکے ساتھ تمسخر کر رہی ہے اور
ساری دنیا کسی نامعلوم مقصد کے لئے اس کے خلاف سازش
کر رہی ہے جسمیں اسکی بیوی اور بچے بھی شامل ہیں ۔

"بچے ، یعنی میرے بچے ، یعنی بچے"

"کون کہہ سکتا ہے کہ کونسا بچہ کس کا ہے ؟"

آج وہ پورے چھ سال کے بعد پہلی اور آخری مرتبہ گھر
جا رہا تھا اور اس ارادے کے ساتھ کہ یا تو کانٹے کو نکال کر
رہے گا یا اس حصہ جسم کو کاٹ کر پھینک دے گا ۔

ملکوتی نظارہ تھا ، بیگم اپنے دونوں ہاتھوں
سے صحیفۂ آسمانی تھامے ہوئے جا نماز پر قبلہ رو بیٹھی ہوئی
تھی "میرے معبود !" اس نے ابتدا کی "میں درماندہ ہو ہی
تھی تو نے مجھے استقامت عطا کی ، اور چلنے کی طاقت بخشی
آج میں منزل پر پہونچ گئی ہوں اب میرا سفر ختم ہوتا ہے اور
تم !" اس نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : ——
"تم سن رہے ہو ! آج میں ہمیشہ سے زیادہ ارادت

— ۱۰ —

وعقیدت کے ساتھ خدائے بزرگ وبرتر کی قسم کھا کر
کہتی ہوں کہ میں نے چھ سال پہلے جھوٹی قسم کھائی تھی ۔"

"بیگم" وہ پکار اٹھا ۔

"اگر میں ایسا نہ کرتی تو اس چھ سال کے عرصہ میں اور چھ بچے مجھ پر لد نہ جاتے"

"لیکن نہ تھا —" "ضبط تولید کا ایک شیر بہدف نسخہ"

"لیکن کسقدر خطرناک —" "ایک درجن بچوں سے زیادہ خطرناک تو نہیں!" اس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا ۔ واقعی اسے سکون ہو گیا تھا ۔ ایسا سکون جو ساری دنیا کے علوم نہ دے سکے اور ایک "عورت نے دیدیا"۔

(ماخوذ از مو لپان)

حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ آرام فرمائے دہلی کی درگاہ مبارک میں یہ جملہ گوارا لکھا ہوا دیکھکر کہ

"عورتوں کو اندر آنا منع ہے"

(از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ لودیانوی)

گو میری عقیدت میں کمی آ نہیں سکتی
لیکن میں شکایت نہ کروں یہ بھی ہے دشوار!

اے تجھ پہ عیاں نازکئی فطرت انساں
کیا تیری اجازت سے ہے یہ حکم دل آزار؟

عورت کوئی آئے نہ تیری لوح کے نزدیک!
یہ نوع بشر پائے نہ قدموں میں ترے بار!

مانا کہ ہے مظلوم بہت طبقۂ نسواں
لیکن نہیں ہرگز کسی ذلت کی سزاوار

کیوں خون کرے حسرت دیدار کا کوئی!!
گر تو کسی مشتاق زیارت سے ہے بیزار!

سائل ہوں، مگر جذب خودی سے نہیں خالی!!
اس شکل میں کچھ مانگنا تجھ سے ہے مجھے عار!

کیجائے کسی در پہ میری ذات کی توہین!
کرتی نہیں برداشت میری فطرت خوددار

(از محترمہ مسز سنتوکھ بائی بجوشی)

بچہ یہ قدرت کی طرف سے ملی ہوئی انمول بخشش ہے۔ اسکی تعلیم ماں کے پیٹ ہی سے شروع ہوتی ہے۔ پڑھی لکھی اور سنسکاری ماں کے سنسکار بچوں پر پڑتے ہیں۔ اور اگلے جنم کی سنگتی سنسکار اور کرما لیکر ہی بچہ اس دنیا میں داخل ہوتا ہے۔

بچہ ڈھائی سال کا ہو تب تک اسکی تربیت کا دارومدار اسکی ماں پر ہے۔ اس دوران میں اسکی جسمانی عمارت کی بنیاد مضبوط ہوتی ہے اسکے بعد اسکو نرسری سکول جیسے بچوں کے مدرسہ میں رکھنا چاہئے کہ جہاں اس کے آتما کو کھلنے اور ساتھ ہی دماغی طاقتوں کے بڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ اسکے ساتھ بچے کو اپنی ذات پر بھروسہ کرنا، صفائی ستھرائی، عادات اطوار وغیرہ باتوں کا چھ سال کی عمر تک تجربہ ہوتا ہے۔

بچے بڑے نقل اڑانے والے ہوتے ہیں۔ اسلئے وہ فوراً بڑوں کی نقل کرتے ہیں اور وہی کام خود کرکے اپنی خوشی بتلاتے ہیں۔

ہر ماں باپ کا فرض ہے کہ بچوں ہی کو اپنی دولت سمجھیں اور ان کی حفاظت کریں اور انکی تربیت ایسی کریں کہ وہ کاروبار میں فائدہ مند ثابت ہوں۔ ماں باپ کا فرض ہے کہ اسی نظر سے اپنے بچوں کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ استادوں کے ہاتھ میں بچہ صرف پانچ گھنٹے رہتا ہے لیکن زیادہ وقت تو ماں باپ کے سایہ تلے گذارتا ہے۔

تعلیم کا انتظام اس ڈھب سے ہونا چاہئے کہ ہر ایک بچے کو دماغی اور جسمانی قابلیت کے موافق ہی تعلیم ملے۔ زیادہ اور کم ہوشیار یعنی مختلف طبقوں کے بچوں کے لئے ایک ہی کلاس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ کلاس کے ساتھ چلنے کی خاطر کئی بچوں کو زبردستی پیچھے رہنا پڑتا ہے۔ اسی واسطے کس بچے میں کتنی طاقت ہے اور وہ کس پیشہ کے لائق ہوسکیگا یہ دیکھنا چاہئے اور ان باتوں کی تعلیم دینے میں خاص خیال رکھنا چاہئے۔

بچے کی بھلائی سب باتوں سے بڑھکر ہے۔ اسلئے استادوں کو لازم ہے کہ اپنی زندگی ان ہی کی خدمت میں گذار دیں۔

بچوں کے ساتھ ماں باپوں اور استادوں کو محبت کیساتھ برتاؤ کرنا چاہئے۔ اور سمجھنا چاہئے کہ "بچہ گو چھوٹا ہے پھر بھی ایک آتما ہے"۔ محبت سے بچوں میں جسقدر شوق، خوشی ایمان اور طاقت آتے ہیں اتنے کسی اور ذریعہ سے نہیں آتے۔ اس واسطے ان وصفوں کو پیدا کرنے کی خاطر محبت کے ہتھیار سے کام لینا چاہیئے۔

ماں باپ یا استادوں کو بچوں کو سزا دینے کا خیال کرنا سراسر غلطی ہے۔ بچوں کو دھمکی دے کر کام کرائیں تو وہ ہماری موجودگی میں ہی ہمارے حکم کے تابع ہونگے۔ لیکن نفرت کی وجہ سے ہماری غیر حاضری میں جو ان کے دل میں آئیگا وہ کر گذریں گے

یوں کرنے میں نہ صرف وہ ماں باپ یا استاد کے حکم کے تابع نہیں ہوتے بلکہ اس قسم کی نافرمانی کی خوشیاں منانے لگتے ہیں۔

اس کے بدلے اگر ان کی طرف محبت سے حکم دیں تو وہ شوق اور امنگ سے کام کرینگے اور آگے بڑھیں گے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ بچوں کے سامنے کسی کی بھی غیبت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ یہ بہت ہی ذلیل عادت ہے۔ اسکے بجائے ان کو اچھے تاریخی لوگوں کی کہانیاں سنا کر حوصلہ بڑھانا چاہیئے۔

ہر ایک انسان کی طرح، بچہ بھی خدا ہی کا جزو ہے تو اسکی آتما کو ہر ایک نیک خصلت سے سنوارنا یہ ماں باپ اور استاد کا فرض ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ تن کی، من کی اور گھر کی صفائی بھی سکھانی چاہئے اور ادب، نرمی، اور دوسروں کی بھلائی کرنے کا خوب شوق دلانا چاہئے کہ آگے چلکر وہ اپنا، اپنے عزیزوں، اپنی قوم اور اپنے ملک کا بھلا کرسکیں اور اسی طرح دنیا کے لئے مفید ثابت ہوکر اپنا انسانی فرض ادا کرسکیں۔

سکول کے دروازہ میں داخل ہوتے ہی رنج و فکر کے تمام خیالات کو "خدا حافظ" کہنے کی عادت استاد کو ڈالنی چاہئے۔ کیونکہ سکول تو پھول جیسے بچوں کے کھلنے کی جگہ ہے۔ اس لئے سکول کی فضا جسقدر ہوسکے خوشی اور امنگ بھری ہونی چاہئے "خوشی سے زندگی بڑھتی ہے اور رنج سے زندگی گھٹتی ہے"

اس واسطے ہر بچے کو گھر میں اور اسکول میں خوش رہنے کی عادت ڈالنی چاہئے کہ جس سے اسکے دل میں ہمیشہ خوشی کا چشمہ بہتا ہے۔ یوں کرنے سے بچہ ہمت والا اور بہادر بنے گا اور ہر ایک کام فتحمند نکلے گا اور اپنا فرض اعلیٰ طریقے سے ادا کرتا رہے گا۔

اس وقت تعلیم کی قدر معلوم ہوگی کہ "صحیح تعلیم کتنی مفید ہے۔

لہریں

زندگی اور سمندر کی لہریں! ——

میں ساحل سمندر پر کھڑا سمندر کی آغوش میں ڈوبتے ہوئے سورج اور پانی کی تملاتی لہروں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

سورج ڈوبتا جارہا تھا۔

سمندر کی لہریں بن اور بگڑ رہی تھیں۔

میری لشت پر زندگی بھی لہریں لے رہی تھی ——

پانی میں کسی نے کھایا ہوا ناریل پھینکا، ناریل ایک دو ڈبکی لگا کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ گیا۔ لہریں تیزی سے پیدا ہوئیں۔ ایک دائرے کی شکل میں پھیلکر پھر اسی نکتہ پر آکر ختم ہوگئیں۔

اسی وقت پیچھے سے کسی کی چیخ سنائی دی!

'تارول' کی شفاف سڑک پر ایک جھلملاتی ہوئی لانبی سی موٹر کے مڈگارڈ میں ایک انسانی ڈھانچہ پھنسا ہوا تھا، ایک بوڑھی فقیرنی کا ڈھانچہ ——

تماشائیوں کا ہجوم ایک دائرے کی شکل میں موٹر کے گرد جمع ہوگیا۔

اسی وقت کسی پوجاری نے پوجا کے پھول سمندر کے بھینٹ چڑھائے، پھول ایک دو چکر لگا کر سمندر میں بیٹھ گئے۔ لہریں ایک دائرہ بنا کر غائب ہوگئیں ——

پانی کی سطح پر صرف چند ننھی ننھی سی لہریں تھیں اور سڑک پر خون کا ایک بڑا سا دھبہ دکھائی دے رہا تھا۔

زندگی اور سمندر کی لہریں اسی طرح بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں ——

(شاکر علی رامپوری)

"عجیب بھکاری"

(از جناب سلام مچھلی شہری)

(اُس بوڑھے بھکاری نے صرف یہ کہا تھا۔ "اچھا بابا اللہ تیرا بھلا کرے" مگر میں نے جانے کیا محسوس کر لیا..... آج اس نظم کے ذریعہ بھکاری کا صاف جواب میں "بابوجی" تک پہونچائے دیتا ہوں) سلام

یہ کیسا بھکاری ہے۔ کیا گا رہا ہے؟!:-

....

میں منت کش غم گساری ہوں بابا!\
امیروں کے گھر کا پجاری ہوں بابا!\
مصیبت زدہ ہوں، بھکاری ہوں بابا!!! —— خدا تم کو تا حشر مسرور رکھے!\
زمانے کی تکلیف سے دور رکھے!!\
تمہارے چراغوں کو پُر نور رکھے!!!

—— یہ مانا کہ سرکار فرصت نہیں ہے\
یہ فریاد، سازِ مسرت نہیں ہے\
امیری کو احساس غربت نہیں ہے —— مگر اپنی حالت بتاؤں تو کس کو؟!\
میں اپنی مدد کو بلاؤں تو کس کو؟!\
یہ افسردہ دیپک سناؤں تو کس کو؟!

—— یہ اب میں نے جانا، ترانہ سنیں گے\
حضور آپ کوئی فسانہ سنیں گے\
کہ روداد دور زمانہ سنیں گے ——

——— مجھے آپ کو شاد کرنے سے مطلب
میرے دل کو چاندی کی ٹھوکر سے مطلب
بھکاری کو بس پیٹ بھرنے سے مطلب!!!

——— زمانے میں ایک ملک جنت نشاں تھا
جدھر بھی نظر اٹھ گئی گلستاں تھا
ہر اک خوش تھا، آزاد تھا، شاداں تھا ——— وہاں آج رقصاں ہے صہبا کی مستی
وہاں آج عریاں ہے انساں کی ہستی
وہاں آج خنداں ہے دولت پرستی

وہیں کا سنوارا ہوں، پالا ہوں میں بھی
اسی گھر کا مدھم اجالا ہوں میں بھی
اسی ملک کا رہنے والا ہوں میں بھی ——— سنا ہے تغیر قریب آرہا ہے
کوئی قصر ظلم و ستم ڈھا رہا ہے
جبھی تو بھکاری بہت گا رہا ہے

"——— بہت خوب سرکار خاموش ہوں میں!
یہ مانا کہ فاقوں سے مدہوش ہوں میں
بھکاری ہوں لیکن شرر پوش ہوں میں ——— ڈرو، میری فریاد آتش فزا ہے
ڈرو، ایک درویش شعلہ نوا ہے
ڈرو، تم غریبوں کی آہ دبا ہے

وگرنہ محلات جل جائیں گے سب
غرور امارت نکل جائیں گے سب
حکومت کے ایام ڈھل جائیں گے سب ———
کہاں تک فلک بوس محلوں میں رہنا
کہاں تک طلائی سفینوں میں بہنا ———
میں جاتا ہوں ظالم! مگر پھر نہ کہنا: ———

یہ کیسا بھکاری ہے۔ کہ اگا رہا ہے؟!

آزادی

از حضرت امام اکبرآبادی

اہل علم و دانش جانتے ہیں کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے - اور اس لئے آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے - لیکن جب وہ سن شعور کو پہنچتا ہے اور حالات سے باہوش و باخبر ہوتا ہے - تو وہ اپنے تئیں بے بس و مجبور اور پابند دیکھ کر مایوس و رنجیدہ ہوتا ہے - وہ چاہتا ہے - اور کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح اس عذاب الیم سے رہائی حاصل کرے لیکن جب وہ شدائد و مصائب کے مقابلہ کے باوجود بھی مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا - تو اکثر اوقات وہ گھبرا کر جی چھوڑ دیتا ہے - اور اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے جس طرح گزرے گزار لیجائے - پست خیالی اور پست ہمتی کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جہاں انسان تھک کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر کبھی نہیں ابھرتا - لیکن سطحی نظر رکھنے والوں کے دماغ آگے نہیں چلتے - اور اس نوع کے کمزور خیالات سے وہ متاثر ہو کر بیکار ہو جاتے ہیں - مگر دقیقہ رس نظر اس حال کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی - وہ سمجھتی ہے کہ جس طرح تندرستی ہزار نعمت ہے - اسی طرح آزادی ہزار عزت ہے - اولاد، مال اور ذاتی وجاہت و عزت ہوتے ہوئے بھی انسان آزاد نہیں ہوتا - انفرادی وقار اور انفرادی شان و شکوہ بھی باعث آزادی نہیں - اگر کسی ایک قوم کے چند افراد خوشحال، متمول اور ذی مرتبت ہیں - تو اس سے پوری قوم آزاد نہیں ہوتی - ذاتی راحت و آرام، اور عیش و تنعم بھی آزادی کا مفہوم اپنے اندر نہیں رکھتا - مثال کے طور پر اس کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب ہندوستان کا کوئی صاحب دولت، صاحب عزت اور امیر و رئیس کسی آزاد ملک میں جاتا ہے اور جب وہاں کے آزاد لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ہندوستانی ہے - تو پھر اس کی نفرت و حقارت کی انتہا نہیں رہتی - وہ اس سے ملتا ہے بولتا ہے - ذاتی طور سے حسن معاشرت کا برتاؤ بھی کرتا ہے - لیکن ہر ہر قدم پر اس کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخص غلام ہے - اور اس لمحۂ محسوسہ کے بعد سے وہ ذلت کی نظر خفی سے اسے دیکھتا ہے -

آزادی میں خلل انداز ہمیشہ وہ مختصر گروہ ہوتا ہے - جو اپنی فراوانیٔ دولت کے ذریعہ راحت و آرام کی زندگی بسر کرتا ہے - اور موجودہ حکومت کی سرپرستی کے زعم سے اس کی بصارت زائل ہو جاتی ہے جیسا کہ آج ہندوستان کا ایک گروہ آزادی میں حائل ہے - جو آزادی کا دشمن اور غلامی کا دوست ہے - اور جس کو نفس پرستی و بوالہوسی سے فرصت نہیں - بظاہر یہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ جس گروہ کو حکومت کے ذریعہ ہمہ قسم کی نعمت حاصل ہے - اس کو کیا ضرورت ہے کہ زوال آمادہ گروہ کی مصیبت کا ساتھ دے کر اپنے تئیں مصیبت میں ڈالے ہر شخص راحت و آرام کے واسطے کوشش کرتا ہے - ہر خاندان اور ہر قوم خوشحالی کے لئے قدم بڑھاتی ہے - لیکن جب اس گروہ کو یہ سب کچھ میسر ہے تو پھر وہ کیوں تکلیف و اذیت میں پڑے ؟ کیوں اور کس لئے خونریزی کرے ؟ اور کیوں دار و رسن پر چڑھے ؟ کہ اپنے لہو و لعب کی وجہ سے اس کے پاس اتنا وقت کہاں ؟ اس کو اپنے حجلۂ ناز سے سر نکالنے کی فرصت کہاں ؟ کہ اس کا فرق ناز تو پہلوئے دوست سے جنبش ہی نہیں کر سکتا - جس کا ہر روز روز عید، اور ہر شب شب وصال کی لذتوں میں غرق ہو - وہ جوع و عطش کے عذاب الیم کی سختیوں

کیونکر وہ شفقت ہو سکتا ہے۔ کہ

نیند اسکی ہے، دماغ اسکا ہے، راتیں اسکی ہیں
جسکے شانوں پر تیری زلفیں پریشاں ہو گئیں

لیکن کیا بستر استراحت کا آرام کرنیوالا۔ اپنے ایک بھائی کو بستر مرگ پر کراہتے ہوئے دیکھکر سکون حاصل کر سکتا ہے؟ اگر کر سکتا ہے تو یقیناً وہ ایک پتھر کی مورت سے کسی طرح کم بحیس نہیں۔ اگر جسم کا کوئی عضو بیکار ہو جائے، اور اسکے بعد وہ گلنے اور سڑنے لگے، تو کیا سارا جسم موت کی طرف نہیں جا رہا ہے؟ پھر اس کا علاج نکرنا، حیات کا مرادف ہو سکتا ہے؟ کیا انفرادی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دینا دانشمندانہ فعل ہو سکتا ہے؟

بہر حال اسیکا نام غلامانہ ذہنیت ہے۔ اور ہمیشہ دنیا میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باوجود ہزارہا سال گزر جانے دنیا کا معیار ابھی اسدرجہ پر نہیں، جہاں مساوات انسانی کی تصویر نظر آئے۔ اس کرہ ارض کا انسان مساوات کی منزل میں اسیوقت سانس لیگا، جبوقت وہ خود غرضی، اور نفس پرستی کی قید تنگ سے رہائی حاصل کر لیگا، اور سمجھے گا کہ آدم کی اولاد کم وبیش برابر کی حقدار ہے۔ لیکن یہ احساس اسیوقت ہوگا، جبکہ متمول گروہ، اپنی دولت کا خود امین ہوگا۔ اور سمجھے گا کہ میری دولت ملک کی امانت ہے۔

یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ دنیا میں مساوات انسانی کا دور کب آئیگا؟ البتہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ضرور آئیگا جبکہ دنیا کی اس کشاکش میں سے ایک جماعت ایسی پیدا ہوگی جو آزادی کی طلبگار ہوگی، جو صحیح اور سچی آزادی کے مفہوم سے باخبر ہوگی، اور جو آزادی کی نعمت کا وسیع ترین مطالعہ کر چکی ہوگی۔ یعنی جو عدل و انصاف کی حامل ہوگی، جو ذاتی غرض اور ذاتی مفاد کو ایک ڈاکہ سے زیادہ سمجھتی ہوگی، پھر ایسی قوت بھی ہوگی جو ساری دنیا کے انسانوں کو ایک ہی سطح پر کھڑا کر سکے۔ اسوقت کو سمجھنا چاہئے کہ وہ آدم کی اولاد کے لئے بڑا ہی مبارک وقت ہوگا۔

آج یہ خیال دیوانہ پن، اور جنون ساز معلوم ہوتا ہے اور یہ اسلئے کہ آجتک دنیا کی تمام سلطنتیں اور تمام حکومتیں اسباب میں ناکامیاب رہی ہیں۔ دنیا کے بعض ایسے بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں نے خواہش کی کہ تمام دنیا پر قابض ہو جائیں لیکن وہ نامراد ناکام رہے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ وہ انسانوں پر حکومت کرنا چاہتے تھے، خدمت کا جذبہ انمیں بھی نہ تھا۔ نپولین نے تمام یورپ پر حکومت کی تھی، اسی چیز سے آخر میں وہ متنفر ہو گیا، اور شہنشاہیت کو پسند کیا۔ سکندر اعظم نے مغرب و مشرق پر حکومت کی۔ لیکن اسکے ساتھیوں میں خود غرضی پیدا ہو گئی، اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا البتہ عربوں نے صحیح آزادی کا علم بلند کر کے تقریباً پون دنیا کو فتح کر لیا تھا لیکن دو وجوہ سے انکی سلطنت بھی غارت ہو گئی۔ ایک خود غرضی، دوسرے مساوات اسلامی۔ انہوں نے مساوات انسانی کی بجائے مساوات اسلامی کو ترجیح دی۔ اور اس لئے چالیس پچاس برس تک انکا زور رہا، اس کے بعد یہ زور ختم ہو گیا، آج اس کرۂ ارض پر برٹش حکومت اتنی وسیع ہے کہ جسکی سلطنت پر کسیوقت سورج غروب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ حکومت عدل و انصاف کی بنا پر مستحکم نہیں بلکہ قوت استبداد پر قائم ہے۔ اگر آج یہ قوم دوسری قوموں کے لوگوں کو اپنی قوم کے مساوی درجہ دیدے تو یقیناً یہ ساری دنیا کی مالک بنجائے۔ بڑے بڑے ملک جو

اسکے قبضۂ اقتدار میں ہیں، جان نثاری کرنے لگیں - اور پھر
ممکن ہے کہ اسی میں سے ایک مختصر جماعت ایسی پیدا ہو جائے
جو عدل وانصاف اور قوت کی حامل ہو۔

انصاف وعدل اس کا نام ہے کہ ایک بار نوشیروان
عادل شکار کے لئے باہر نکلا۔ کچھ وقفہ کے بعد جب شکار
اسکے ہاتھ آیا تو اسنے باورچی کو کباب بنانے کا حکم دیا۔ باورچی
نے عرض کیا کہ حضور نمک نہیں ہے۔ بادشاہ نے اپنے نوکر کو
اشارہ کیا کہ قریب کے گاؤں میں جاکر نمک لائے۔ اسکے
ساتھ یہ تاکید کی کہ قیمت دیکر نمک لائے۔ نوکر نے عرض کیا کہ
حضور والا ذرا سے نمک کی قیمت دنیا سمجھ سے باہر ہے،
خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ گاؤں والوں کو یہ علم ہوگا کہ اس
نمک کی ضرورت شان والا کو ہے، میرا خیال ہے کہ وہ ہرگز
قیمت نہ لینگے۔

نوشیروان نے فرمایا کہ تا وقتیکہ وہ قیمت نہ لیں، نمک
ہرگز نہ لانا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر کوئی بادشاہ حکم دے
کہ فلاں کاشتکار کے باغ میں سے ایک پھل توڑ لاؤ، تو شاہی
نوکر بغیر اسکی اجازت کے سارا باغ اجاڑ دیں - اور اگر ایک
بادشاہ کو ایک انڈے کی ضرورت پڑ جائے تو شہر کے
غریبوں کی ہزار ہا مرغیاں ذبح کر ڈالیں۔ اس لئے میں اس
مہلک رسم کو اپنے ہاتھوں سے قائم نہیں کر سکتا۔ اور ظلم کی
یہ رسم نہیں ڈال سکتا۔ اول اول دنیا میں ایسے ظلم کی رسم
مطلق نہ تھی، لیکن رفتہ رفتہ اسکی بنیاد اسی طرح پڑ گئی، جو طرح
تیری رائے ہے۔ ایک بادشاہ کی سلطنت کبھی زوال پر
آمادہ نہیں ہوسکتی، اگر رعیت کی آزادی، آرام وراحت،
اور اس کے عدل وانصاف کی خبر رکھی جائے۔ رعیت کی
آزادی اسکا پیدائشی حق ہے، ہم اسکے چرواہے ہیں، اور
خدمت گزار ہیں۔ ہم پر بس اتنا فرض ہے کہ بھیڑوں کے اس گلے کو
کوئی شیر نہ کھا جائے۔

کسی نے سکندر اعظم سے پوچھا کہ آپ نے مشرق ومغرب
کے تمام ملک کسطرح اور کیونکر فتح کئے؟ اکثر بادشاہوں کے
پاس بے شمار خزانے، لاتعداد سپاہ، اور کافی سے زیادہ طاقت
تھی، لیکن اتنی وسیع سلطنت کسی کی نہیں ہوئی۔ جواب دیا کہ
گذشتہ بادشاہوں کی تمام اچھی رسمیں، اور بہترین قانون کو
میں نے زندہ رکھا، رعیت کی آزادی کو قائم رکھا، اور ظلم کو
دفن کر دیا۔ جو ملک میں نے فتح کیا، وہیں کے باشندوں کو آزادانہ
اسپر حکمران کیا۔ یہی سبب ہے کہ میری سلطنت وسیع تر ہے۔

غزل

از شہزادہ اسلم

وعدہ فردا سے دل بہلا گئے — عمر بھر کے واسطے تڑپا گئے
اللہ اللہ حسن کا جوش حیا — خواب میں وہ آئے تھے شرما گئے
سرد بھر آہوں کی تاثیر الاماں — گرم گرم آنسو ڈھلک کر آ گئے
کسکی آہ گرم سے اے باغباں — نوشگفتہ پھول تھے مرجھا گئے
اللہ اللہ عشق کی دشواریاں — درد وغم رنج والم یاد آ گئے
صبر کھو بیٹھی نگاہ اولیں — جانے وہ آنکھوں میں کیا سمجھا گئے
ترکِ الفت کیا اسی کا نام ہے — ہم انہیں بھولے وہ پھر یاد آ گئے
ہائے احساس شباب خفتہ ساز — دیکھتے ہی آئینہ شرما گئے

تم بھی پی لو پھر کہاں اسلم نصیب
خم بدوش ابر سیہ فام آ گئے

باغ میں جتنے پھول تھے سب کے سب باغی ہوگئے، گلاب کے سینے میں بغاوت کی آگ بھڑک رہی تھی ۔ اس کی ایک ایک رگ آتش جذبہ کے تحت پھڑک رہی تھی۔ ایک روز اس نے اپنی کانٹوں بھری گردن اٹھائی اور غور وفکر بالائے طاق رکھکر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا :-

"کسی کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ ہمارے پسینے سے اپنے عیش کا سامان مہیا کرے ہماری زندگی کی بہاریں ہمارے لئے ہیں اور ہم اس میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرسکتے ؛"

گلاب کا منھ غصہ سے لال ہورہا تھا ۔ اسکی پنکھڑیاں تھرتھرا رہی تھیں ۔

چنبیلی کی جھاڑی میں تمام کلیاں یہ شور سنکر جاگ اٹھیں اور حیرت میں ایک دوسرے کا منھ تکنے لگیں ۔ گلاب کی مردانہ آواز بلند ہوئی ۔

"ہر ذی روح کو اپنے حقوق کی نگرانی کا حق حاصل ہے اور ہم پھول اس سے مستثنےٰ نہیں ہیں ۔ ہمارے قلوب زیادہ نازک اور حساس ہیں ۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا ہماری دنیائے رنگ و بو کو جلاکر خاکستر کرسکتا ہے اور شبنم کا ایک بے مقدار قطرہ ہماری پیاس بجھا سکتا ہے ۔ کیا ہم اس کانے مالی کے کھردرے ہاتھوں کو برداشت کرسکتے ہیں جسپر موسموں کے تغیر وتبدل کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا ؟"

موتیا کے پھول چلائے "ہرگز نہیں" لالہ کی آنکھوں میں خون اترآیا اور کہنے لگا "اس کے ظلم سے میرا سینہ داغدار ہورہا ہے ۔ میں پہلا پھول ہونگا جو اس جلاد کے خلاف بغاوت کا سرخ جھنڈا بلند کرے گا ۔

یہ کہکر وہ غصہ سے تھرتھر کانپنے لگا ۔

چنبیلی کی کلیاں متحیر تھیں کہ یہ شور کیوں بلند ہورہا ہے ۔ ایک کلی ناز کے ساتھ گلاب کے پودے کی طرف جھکی اور کہا "تم نے میری نیند خراب کردی ہے ۔ آخر گلا پھلا پھلا کر کیوں چلا رہے ہو؟"

گلنیر جو دور کھڑا گلاب کی قائدانہ تقریر پر غور کررہا تھا بولا :-

"قطرہ قطرہ ملکر دریا بنتا ہے ۔ گو ہم ناتوان پھول ہیں لیکن اگر ہم سب مل جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی جان کے دشمن کو پیس کر نہ رکھدیں ہماری پتیاں اگر خوشبو پیدا کرتی ہیں تو وہ زہریلی گیس بھی تیار کرسکتی ہیں ـــــ بھائیو! گلاب کا ساتھ دو اور اپنی فتح سمجھو"

یہ کہکر اس نے اخوۃ کے جذبہ کیساتھ ہر پھول کیطرف دیکھا ۔

گلاب کچھ کہنے والا ہی تھا کہ چنبیلی کی کلی نے اپنے مرمریں جسم پر

ایک تھرتھری پیدا کرتے ہوئے کہا "یہ سب بیکار باتیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔ آؤ تم مجھے شعر سناؤ، میں آج تمہاری گود میں سونا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔ تم شاعر ہو، میرے پیارے آؤ ہم بہار کے ان خوشگوار دنوں کو ایسی فضول باتوں میں فضول باتوں میں ضائع نہ کریں۔ راتیں دنیا میں جیسلیں جہاں نیند ہی نیند ہے۔۔۔۔۔۔ میٹھی اور راحت بخش نیند!"

گلاب کے سینے میں ایک ہیجان برپا ہوگیا۔ اسکی نبض کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اتھاہ گہرائی میں اتر رہا ہے۔

اس نے کلی کی گفتگو کے اثر کو دور کرنیکی سعی کرتے ہوئے کہا۔
نہیں میں میدان جنگ میں اترنے کی قسم کھا چکا ہوں۔ اب یہ تمام رومان میرے لئے مہمل ہیں"

کلی نے اپنے لچکیلے جسم کو بل دیکر خواب گوں لہجہ میں کہا:۔

"آہ میرے پیارے گلاب ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے دہشت ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ چاندنی راتوں کا خیال کرو۔۔۔۔۔۔ جب میں اپنا لباس اتار کر اس نورانی فوارے کے نیچے نہاؤں گی تو تمہارے گالوں پر سرخی کا اتار چڑھاؤ مجھے کتنا پیارا معلوم ہوگا اور تم میرے سیمیں لب کس طرح دیوانہ وار چومو گے۔۔۔۔۔۔ چھوڑو ان فضول باتوں کو میں تمہارے کاندھے پر سر رکھ کر سونا چاہتی ہوں"

اور چنبیلی کی نازک ادا کلی گلاب کے تھراتے ہوئے گال کیساتھ لگ کر سوگئی ـــــ گلاب مدہوش ہوگیا چاروں طرف سے ایک عرصے تک دوسرے پھولوں کی صدائیں بلند ہوتی رہیں مگر گلاب جاگا۔۔۔۔ ساری رات وہ مخمور رہا۔

صبح کا مالی آیا۔ اسنے گلاب کے پھول کی ٹہنی کیساتھ چنبیلی کی کلی چمٹی ہوئی پائی۔ اسنے اپنا کھردرا ہاتھ بڑھایا۔ اور دونوں کو توڑ لیا۔

(ہند)

عمل

از محترمہ نزہت لکھنوی

عمل سرچشمۂ عالم کلید کامرانی ہے
عمل کا فیض دنیا پر عمل ہی جاودانی ہے

عمل مردِ مجاہد کی بدل دیتا ہے تقدیریں
عمل کی سارے عالم پر نظر آتی ہیں تنویریں

عمل کے زور پر ہے سب نظام عالم فانی
عمل قوموں کا رہبر ہے عمل ہے جزو ایمانی

عمل مردہ دلوں کو خواب سے بیدار کرتا ہے
عمل کرنے سے انساں زندگی کے ساتھ مرتا ہے

عمل پیغام آزادی دلیل کامرانی ہے
عمل تائید غیبی ہے ترقی کی نشانی ہے

عمل بنکر نمایاں ہوتی ہیں دنیا کی تدبیریں
عمل کے پائے خودداری میں کب پڑتی ہیں زنجیریں

عمل کے فیض سے ہر قوم پر رحمت برستی ہے
عمل کھونے سے دنیا دانے دانے کو ترستی ہے

عمل جہد مسلسل بن کے رہتا ہے شراروں میں
عمل درس روانی دے رہا ہے آبشاروں میں

عمل کا درس ملتا ہے قمر سے اور تاروں سے
عمل کی مہر بھی تسلیم دیتا ہے اشاروں سے

عمل سے واسطہ رہتا ہے دریا کے کناروں کو
عمل کا شوق ہے برسات کی ہلکی پھواروں کو

عمل وہ شے ہے جس سے روح بھی تنظیم پاتی ہے
عمل میں آکے دنیا زندگی کے گیت گاتی ہے

نتیجہ جہد کا ناکام ہونے سے نکلتا ہے
یہاں نزہت ہر انساں چوٹ کھا کر ہی سنبھلتا ہے

نوشتہ مسٹر شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم اے ایل ایل بی علیگ ایم آر اے ایس ایڈوکیٹ و مدیر خیاباں لکھنؤ

ریاضؔ کو تہہ خاک ہوئے ابھی نہ قرن گزرے نہ صدیاں ہوئیں۔ دو چار برس کی بات ہے۔ ابھی تو آنکھوں میں ان کی تصویر پھر رہی ہے۔ ابھی تو کانوں میں ان کی آواز گونج رہی ہے ؎

یہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

اہلِ کمال کی موت فنائے عناصر تک محدود نہیں، یہ کیا کہ مٹی میں مٹی مل گئی اور ہوا ہوا میں؟ ایسے شعبدے تو فطرت روز دکھایا ہی کرتی ہے، ان کی حقیقی موت ان کے کلام، ان کے ملفوظات، ان کے کارناموں کے گرد آلود ہونے میں مضمر ہے، اہلِ کمال کے سکے دھرے پر گمنامی و نسیان کی خاک نہ ڈالو ورنہ زمانہ انکو ان کی موت سے بہت پہلے خاک میں ملا دیگا۔

ریاضؔ ہماری قدیم اسکول شاعری کی ایک قابل قدر یادگار تھے۔ اور مرتے دم تک اپنے رنگ کو نبھا گئے۔ انہوں نے دور جدید بھی دیکھا تھا اور جدید اسکول شاعری سے متاثر ہو کر اپنے کلام کے رجحان کو بدلا بھی تھا اور یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ وہ کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے۔ اس اعتبار سے اگر انکو دور جدید کا شاعر لکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعرانہ زندگی کا بیشتر حصہ قدیم اسکول شاعری کی آغوش میں کٹا ہے۔ اس خیال سے وہ قدیم شاعری کے زیادہ اور جدید اسکول شاعری کے کم مخصوص تھے۔

ابتدائی تعلیم اور شعر و سخن سے دلچسپی

ریاضؔ کی ولادت قصبہ خیرآباد ضلع سیتاپور میں ہوئی تھی اور وہیں ایک عربی مدرسہ میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ہنوز درسیات تکمیل نہ کر پائے تھے کہ شعر و شاعری کا سودا سر میں سما گیا وہ بھی عجیب زمانہ تھا۔ ان کی آنکھوں نے کس کو نہیں دیکھا تھا۔ مظفر الدولہ نواب مظفر علی خاں اسیرؔ، حکیم ضامن علی جلالؔ، منشی امیر احمد امیرؔ مینائی اور فصاحت جنگ نواب مرزا داغؔ، سب ہی تو زندہ تھے۔ اور یہی سبب

نواب کلب علیخاں والیٔ رامپور کے دامن دولت سے وابستہ تھے۔ ریاض نے تعلیم کو تو خیر باد کہا اور شعر گوئی پر بل پڑے۔ عنفوان شباب اور شوخ طبیعت سونے پر سہاگا۔ قسمت کی خوبی منشی امیر احمد امیر ایسا استاد بھی مل گیا۔ پھر کیا تھا جو لڑکا "ایک" "اول فول" بکتا تھا، ایک پختہ مشق خوش فکر استاد کی سرپرستی میں سر مشاعرہ دھڑ دھڑ غزلیں پڑھ ڈالنے لگا۔ عمر کے ساتھ ساتھ فکر بھی نکھرتی گئی۔ اور سبب منظر عام پر ان کا کلام آنے لگا تو اس میں اگر ایک طرف زبان کی چاشنی تھی تو دوسری طرف تخیل کی بلند پروازی بھی، ایک طرف قدامت پرستی تھی تو دوسری طرف جدت و ندرت طرازی بھی۔

ریاض رامپور میں

اب ریاض کی شہرت چار دانگ ہو چکی تھی۔ اور اس زمانے کے کمال نواز امرا جو اہل کمال کے لئے آنکھیں بچھائے رہتے تھے، ان کیلئے چشم براہ تھے۔ کچھ منشی امیر احمد امیر مینائی کی سعی سے اور کچھ ان کے کلام کی غیر معمولی مقبولیت و شہرت سے اور سچ پوچھئے تو طالع کی یاوری سے ریاض آخرکار رامپور پہنچ گئے۔ نواب کلب علیخاں کا عہد ہے۔ اور ہندوستان بھر کے چوٹی کے سخنوروں کا جھرمٹ۔ ایسی بزم سخن میں بڑے بڑے کہنہ مشقوں کی روح لرزتی ہے کہ اللہ آبرو رکھے! نوک جھونک چل رہی ہے۔ منیر اکبرآبادی کی طوطی بول رہی ہے۔ روز دشوار سے دشوار اور سنگلاخ سے سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائیاں ہیں۔ ہر شخص اپنے کمال کو ختم کئے دیتا ہے۔ اس میں نوعمر ریاض کا کس میں شمار؟ لیکن خدا کو ریاض کی عزت رکھنا تھی لہذا وہ خلعت فاخرہ اور انعام و اکرام شاہانہ سے مالا مال ہو کر لوٹے۔ نواب مرحوم کو ریاض کا کلام بہت پسند آیا اور انہوں نے ان کی حوصلہ افزائی اور قدردانی کی۔ یہ سچ ہے کہ ریاض رامپور میں مستقل قیام نہ کر سکے۔ اور یہ اچھا بھی ہوا کیونکہ قدرت جو خدمت ادب ان سے لینا چاہتی تھی شاید وہ پھر رامپور میں رہکر اس کو انجام نہ دے سکتے۔

ادبی خدمات

اب ریاض خانہ نشین ہو گئے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ انہوں نے شعر و سخن کے شغف کو ترک کر دیا بلکہ نہیں، انہوں نے ایک ماہنامہ گلدستہ "شعر و سخن" جاری کیا۔ شعر و سخن بہت مقبول ہوا اور اس نے ریاض کے کلام کو ہندوستان کے ہر گوشہ میں پہنچا دیا۔ "شعر و سخن" زیادہ دنوں نہیں جیا۔ مگر جبتک زندہ رہا شعر و سخن کی گرانقدر خدمات انجام دیتا رہا۔ پھر ریاض الاخبار کا اجرا ہوا۔ اس کی بھی عمر کم تھی لیکن اس کم عمری میں، وہ کام کر گیا جو ریاض کے نام کو بہت دنوں تک زندہ رکھے گا۔ منشی امیر احمد امیر مینائی کے اور ان کی لغت "امیر اللغات" پر جو اعتراضات ہوئے اس کے جوابات دو سال تک ریاض الاخبار میں شائع ہوتے رہے۔ ریاض الاخبار کے علاوہ ریاض نے چند رسائل و جرائد مختلف مقامات "فتنہ" "عطر فتنہ" کے نام سے اور شائع کئے۔ لیکن یہ بھی بہت کم عمر پا کر فنا ہو گئے۔ ان رسائل نے اہل نظر کو بتلا دیا کہ ریاض نہ صرف ایک خوشگوا شاعر تھے بلکہ قدرت نے انکو تنقید کی بھی زبردست قوت ودیعت کی تھی۔

آخر عمر میں ۱۹۳۰ء میں بارہ بنکی سے ایک ماہنامہ رسالہ "اعجاز" جاری کیا یہ بھی غالباً ۱۹۳۲ء یا ۱۹۳۳ء میں دو ڈھائی سال کی عمر پاکر بند ہوگیا۔

تنگدستی اور عسرت ہندوستان کے اہل کمال بالعموم اور شعراء و ادباء بالخصوص تنگدستی وعسرت کے ہمیشہ رہین منت رہے ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو یہ تنگدستی وعسرت ہی ہے جس نے اہل کمال بنایا فکر فردا نے دل پر ہجوم غم سے سامعہ سوز وگداز پیدا ہوگیا شاعرانہ مبالغہ سے طبیعت کو نفور ہوا تخیل کا سیلان صداقت وحقائق شعاری کی طرف ہوا پھر کیا تھا۔ کوئی میر تقی میر ہوگیا تو کوئی خواجہ آتش کسی نے پند ونصائح میں اردو میں سعدی شیرازی کا رنگ اڑایا اور کسی نے فاقہ کشی پر قناعت کرکے خدا سے لو لگائی تو معرفت میں فارس کے بڑے بڑے شعرائے صوفیا کے کلام کو اپنی ہرزہ گوئی سے ٹکرا دیا۔ آپ اس کو مبالغہ سمجھیں یا جو جی چاہے تصور کریں مگر میں اس کا قائل نہیں کہ اردو شاعری کی مایہ بساط کچھ نہیں، اردو شاعری کے پاس سب کچھ ہے مگر کم۔ آپ ان جواہر ریزوں کو منتخب کرکے جمع کیجئے پھر دیکھئے اگر گلستان و بوستان، نہیں تو اس کا نمونہ ضرور ملیگا۔ خیر تنگدستی کا رونا تو ہمارے ہر شاعر کو رہا ہے۔ ریاض کیوں اس سے مستثنیٰ رہتے سنئے کیا کہتے ہیں ؎

رہا تقدیر کا رونا ہمیشہ
ہماری عمر تو گذری اسی میں

کلام میں شوخی باوجود تنگدستی کے ریاض کے کلام میں شوخی کبھی نہیں گئی دو شعر ملاحظہ ہوں،

ذرا سے درد نے ڈھائی ہیں آفتیں کیا کیا
پٹک دیا ہے زمیں پر اٹھا اٹھا کے مجھے
وہ آرہا ہے عصا ٹیکتا ہوا واعظ
بہادے اتنی کہ ساقی کہیں تہا دے

خمریات اردو کے شعراء کا کمال ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے باوجود شراب کو کبھی آنکھ سے نہ دیکھے ہوئے اپنی فکر رسا سے وہ شعر نکالے ہیں کہ شعر سننے والے کو ان پر ایک بہت بڑے میخوار کا شبہ ہوتا ہے۔ ریاض پرانی وضع کے ایک مقدس بزرگ تھے لیکن اپنے پیشرو اساتذہ کی طرح شیشہ ومے پر طبع آزمائی کئے بغیر نہ رہے۔ ملاحظہ ہو! ؎

ہم جانتے ہیں لطف تقاضائے مے فروش
وہ نقد میں کہاں جو مزا ہے ادھار میں

قرض مقراض المحبت ہے، لیکن قرض پینے اور پھر تقاضائے مے فروش سہنے میں اور ہی لطف آتا ہے۔

قرض کی پیتے تھے ایک دوکان سے آج
نیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی!

گویا نیچی داڑھی ایک ضمانت ہے۔ کیا خوب طنز ہے؟ دوسرے شعر میں اسی مضمون کو اور بلند کیا ہے۔ قرضخواہ کو اختیار ہے کہ وہ نیچی داڑھی کی ضمانت کو قبول کرے یا مسترد کردے اسکے بعد میخوار کے لئے سوائے اسکے اور کوئی چارہ نہیں کہ وہ مے فروش کی منت وسماجت کرے میخوار کے لئے مے کی خاطر منت و سماجت باعث ننگ وعار نہیں ؎

دیدے دیدے مرے ساقی ترے صدقے دیدے
دست سیمیں سے چھلکتے ہوئے پیمانے سے

دست ساقی میں اور چھلکتے ہوئے پیمانے سے پینے میں جو کیف ہے وہ دوسرے مصرع میں خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی مے نوشی کی کیفیات کی تمنا ہے ؎

کھلیں نہ قبر میں جنت کی کھڑکیاں رندو
دماغ میں جو بسی ہے اسی کی بو آئے

میخوار بغل میں شیشہ دبائے نظر بچا کر بیچ سا جاتا ہے ریاض کی تصویر اس شعر کے آئینہ میں دیکھئے ؎

نظر بچائے بغل میں دبائے شیشہ مے
کہیں ریاض بھی پینے پلانے جاتے ہیں

دوسری تصویر! ؎

ہے ریاض ایک جوان مست خرام
نہ پیئے اور نہ جھومتا جائے

تیسرا مرقع! کیا کہنا ہے؟ ؎

ریاض ہائے رے ترا وہ خواب کا انداز
سبو تو سر کے تلے دست شوق ساغر پر

جبتک انسان کو کسی نشے کی کیفیت سے واقفیت نہ ہو وہ اسکی حقیقی خیالی تصویر نہیں پیش کر سکتا۔ لیکن یہ شاعر ہی کا کمال ہے کہ وہ اپنی قوت تخیلہ سے اس کیفیات کی تصویر کھینچتا ہے جس سے وہ کبھی آشنا نہیں۔ ریاض کا آخر الذکر شعر ہی صاحب کمال ہونے کا بین ثبوت ہے ؎

جام مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اٹھے کبھی گھبرائے تو میخانے میں ہو آئے
پی آئے تو پھر بیٹھ رہے یاد خدا میں

توبہ سے بوتل کا تقابل، آسمان و ریسمان کا موازنہ، مگر نہیں اس میں بھی ایک بات ہے ملاحظہ ہو کیسی نازک خیالی ہے ؎

توبہ سے ہماری بوتل اچھی
جب ٹوٹی ہے جام بنگئی ہے

میخوار کو کائنات میں سوائے مے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا میں مستی کا کیا خوب سبب بتاتا ہے!

کس غضب کی ہوا میں مستی ہے
کہیں برسی ہے آسمان سے آج

میخوار کا تعلق مرنے کے بعد بھی میخانہ سے باقی رہتا ہے۔ ؎

مرگیا ہوں یہ تعلق ہے جو میخانہ سے
مرے حصہ کی چھلک جاتی ہے پیمانہ سے

عجب لطیف شعر ہے۔

ریاض نے خمریات میں بڑے نام کئے۔ اور یہ کہنا کسی طرح بیجا نہو گا کہ انکی شاعری کی شہرت کا زیادہ دارومدار ان کے خمریات پر ہے۔ سنتے ہیں کہ بعض نے انکو "خیام ہند" کا خطاب دیا تھا لیکن یہ بڑا ظلم ہے کیونکہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اگر اردو کے تمام شعراء کے کلام کا مجموعہ خمریات مرتب کیا جائے تو بھی وہ حکیم عمر خیام نیشاپوری کے

ایک شعر کی بلندی و کیفیت کو نہیں پاسکتا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ ریاض کے خمریات میں ایک کیف ضرور ہے مگر چونکہ ان کی زبان بہت ہلکی و سبک ہے اسوجہ سے شعر نظروں میں نہیں جچتا۔ بس ایک کیفیت پیدا کرکے رہجاتی ہے۔ خیام کے تخیل و رفعت کو پانا کجا اسمیں کوئی وزن تک پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ ریاض پر منحصر نہیں یہہ نقص ہر اردو شاعر میں ہے کہ وہ خمریات میں اپنی زبان کو ہلکے پن اور رایل بہ سوقیت سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ نتیجہ اس کا یہہ ہے کہ وہی مضمون جو فارسی زبان میں بھاری بھرکم و پر اثر معلوم ہوتا ہے اردو شاعر کی زبان سے ہلکا اور سوقیانہ ہوجاتا ہے۔

حسن و عشق

غزل کا مدعا حسن و عشق ہے۔ لیکن عشق میں بھی ریاض کی شوخی طبع ان کو ہمارے قدیم اسکول شاعری کے اہل کمال میں نمایاں کیکر رہی ہے۔ معشوق کے ناز و نخرے سہنا عاشق کا کیش ہے۔ لیکن ریاض کے عشق میں عجیب بانکپن ہے۔ وہ فطرت عشق کے خلاف معشوق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں تامل کرتے ہیں۔ انداز کلام میں ایک اکھڑ پن ہے اور ایسا اکھڑ پن جو بقول مجنوں گورکھپوری " ایک انتقامی جذبہ لئے ہوئے ہے" گویا سلف سے آجتک جو ظلم و ستم معشوقوں نے عشاق پر ڈھائے تھے اسکے انتقام کے لئے صرف حضرت ریاض ہی پیدا کئے گئے تھے کیا جل کر فرماتے ہیں ؂

ابھی چپ ہوں محشر میں افشا کرونگا
حسینوں کے راز نہاں کیسے کیسے؟

دوسرا شعر بھی اسی اکڑ میں کہا ہے ؂

چھیڑ کیسی بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض
ایک حسیں ہر وقت ہو انکے منانے کے لئے

شیخ نوازی

شیخ، ناصح یا واعظ نوازی تو تھوڑی بہت ہر اردو شاعر نے کی ہے لیکن ریاض نے اس "مقدس ہستی" کی کچھ ایسی گت بنائی ہے کہ زبانیں خاموش ہوجاتی ہیں۔ ملاحظہ ہو ؂

ناصح کے سر پر ایک جمائی تراق سے
پھر ہاتھ مل رہے ہیں ابھی پڑی نہیں

یہہ تو ایک بے اختیار فعل تھا لیکن ابھی تک ناصح کے تدین و تقدیس پر کوئی حملہ نہ تھا۔ اب تدین کی حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے ؂

جیب سے غافل حرم والو نہیں رہنے کا وہ
آنے والا کچھ بہت ہی ہوشیار آنے کو ہے

منبر نہیں ہے تخت شہی ہے بہ وقت وعظ
واعظ نہیں ہے جھوٹوں کا یہ بادشاہ ہے

باغ و بہار!

عسرت و تنگدستی میں بسر کرنے والا شاعر کیونکر بہار کی ایک سچی تصویر کھینچ سکتا ہے؟ ذیل کے چند اشعار میں ملاحظہ فرمائیے اور ریاض کے اعجاز بیان کی داد دیجئے۔

(۱) گلوں کے بھیس میں شکلیں ہیں مہ جبینوں کی
یہ ڈالیاں ہیں کہ ہیں ٹولیاں حسینوں کی

(۲) دام اس رنگ سے گلشن میں بچھا صیاد
میں سر شاخ چلوں سایہ تہہ دام رہے

(۳) بہار آتے ہی پھولوں نے چھاؤنی چھائی

کہ ڈھونڈتا ہوں مجھے آشیاں نہیں ملتا

(۴) مزہ ہو کہ جھک جھک کے رہ جائے بجلی
گلوں سے چھپا ہو نشیمن کسی کا

(۵) عنادل میں صبا میں چل گئی تھی
اڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں

زبان پر قدرت ریاضؔ کو زبان پر قدرت حاصل تھی۔ جس کا ثبوت ان کے وہ مضامین ہیں جو جواہر اللغات پر اعتراضات کے ایزاد میں لکھے گئے ہیں۔ اشعار میں مناسب مواقع پر محاورات کو نظم کرنے کا بھی انکو بہت شوق تھا۔ ذیل میں چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

شمع کھل کھیلی ہے پروانوں سے آج
کچھ سنے گی یہ کب گلگیر سے

میں نے اے صیاد بھر پایا چمن میں رہ کے خوب
مجھے آزاد کریں اب مجھے آزاد کریں

اشک کے چلتے آہ کے مارے
آسماں بھی نہیں زمیں بھی نہیں

نازک خیالی ابتک جو کلام پیش کیا گیا ہے اس سے ریاضؔ کے کلام کے متعلق ارباب نظر بخوبی محاکمہ کر سکتے ہیں لیکن تبصرہ تشنہ رہ جاتا اگر اس میں انکی نازک خیالی اور معنی آفرینی کے چند ابیات کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ ملاحظہ ہو سے

سوکھے ہوئے مرجھائے ہوئے پھول لحد میں
آجاتے ہیں دو چار کبھی اڑ کے ہوا سے

اٹھاؤ پھول کہ بستر بنے گا بستر مرگ
نہ رات کچھ ہے نہ اب انتظار باقی ہے

کتنے کھبے ملے رستے میں کئی طور ملے
ان مقامات سے وہ ہمکو بہت دور ملے

شوخی سے ہر شگوفہ کے ٹکڑے اڑا دیے
جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

گل مرقع ہیں ترے چاک گریبانوں کے
شکل معشوق کی انداز ہیں دیوانوں کے

مجھ سے بے پردہ ملے مل کے کیا گم مجھکو
ایک اس ساری خدائی میں ملے تم مجھکو

محاکمہ جدید رنگ تغزل کے نشر و اشاعت سے پیشتر قدیم اردو شاعری کا آخری دور جو معیار مذاق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، پستی تخیل سوقیانہ طرز ادا اور عریانی جذبات کے لحاظ سے اسکا صرف ایک مزخرفات بلکہ اخلاق سوز ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی جدید مذاق ادب کے قواعد فن سے بیگانگی کیساتھ کورانہ تقلید نے جو ہنگامہ برپا کر دیا ہے وہ بھی ذوق سلیم کے لئے کچھ کم قابل تاسف نہیں گویا فی زمانا شعر ایک لفظی گورکھ دھندے کا نام ہے جسمیں چند خاص انداز سے پر شکوہ۔ رنگین اور ترنم خیز الفاظ کو کچھ فارسی دور از کار تراکیب کیساتھ مخلوط کر کے ایک طلسم فریب تیار کر دیا

جاتا ہے جسکی سطحی دلکشی عام منظر کو جاہے جسقدر مسحور کرے مگر جوہر شناس نگاہوں اسکا ہر لفظ میرزا غالب کی زبان میں اپنی بے مائگی معنویت پر اسطرح صرف صف ماتم بچھاتے نظر آتا ہے ؎

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

یہہ وہ کسوٹی ہے جسپر ہر اس سخنور کے کلام کو جس نے ہمارے قدیم اسکول شاعری میں آنکھیں کھولیں اور جدید اسکول شاعری کی آغوش میں نشو ونما پائی کسکر دیکھئے اسکا کلام دور قدیم اور عہد جدید کی آلودگیوں سے پاک وصاف ہے تو وہ ضرور خراج تحسین کا مستحق ورنہ اس دور ابتذال میں خود رو درختوں کی طرح ہزاروں شعرا پیدا ہوئے اور اپنے ہرزہ گوئی کی نوبت چند روزہ بجا کر ہمیشہ کیلئے ناپید ہوگئے۔ وہ اردو شاعری کے لئے قابل افتخار نہیں بلکہ باعث ننگ وعار تھے اور ہیں جیساکہ سطور بالا میں ہم نے کہیں تحریر کیا ہے ریاض نے دونوں عہد دیکھے۔ قدیم اسکول کے آخری دور میں آنکھیں کھولیں اور جدید اسکول شاعری کی آغوش میں نشو ونما پائی لہذا ان کا کلام ان تمام خصوصیات کا حامل پایا جائیگا جو گذشتہ وموجودہ تنزل کا طرہ امتیاز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا سا ذوق سلیم رکھنے والا سخنور زمانہ کی مسموم ہوا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا اور مقتضائے عہد نے ان سے متعدد ایسے شعر کہوا کے چھوڑے ہیں جو نقادوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتے ہیں لیکن وہ کیا کریں ہمارا مذاق سخن ہی بگڑا ہوا تھا اور زمانہ اس بے کیف رنگ شاعری پر سر دھن رہا تھا۔ میں نے ان کے ایسے کلام کو بالکل نظر انداز کردیا ہے اور اصل یہ ہے کہ یہ کلام انکے دامن شاعری پر ایک بدنما دھبہ ہے ان کا وہ کلام اس تبصرہ میں منتخب کرکے پیش کیا گیا ہے جو میری نظر میں اس دور ابتذال کی آلودگیوں سے پاک ہے اور جو صرف بلاکسی دوسری مجموعہ انتخاب کے مدد کے ان کو اس آخری عہد کی ایک قابل یادگار تسلیم کرانے کے لئے کافی ہے۔ ریاض کے کلام پر مختصر محاکمہ یہہ ہے کہ وہ مرتے دم تک اپنی وضع کو نبھا گئے۔ بہر نوع ریاض جو کچھ بھی تھے وہ غنیمت تھے اور ان کے اٹھ جانے سے ہم میں سے ایک پختہ کار کامل الفن۔ خوش گو شاعر اور قابل قدر سخن سنج و نقاد کم ہوگیا۔

از
پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق
(ایم۔ اے)

(۱)

تنہائی کا درد نہ پوچھ دن میں ہو یا راتوں میں
بڑھ جاتا ہے یہ احساس اور بھی برساتوں میں

اہل محبت غافل میں بھی انہیں میں ہوں لیکن
کوئی جاگ رہا بھی ہے گہری نیند کے ماتوں میں

تیری توجہ کے صدقے یہ تو بتا اے نرگس یار
مجھکو لگا کے باتوں میں آج یہ تو کن گھاتوں میں

عشق بار ہا رو دیا ہے ہنس بھی دیا ہے عشق کبھی
وصل کی سکھ بھری راتوں میں، ہجر کی دکھ بھری راتوں میں

یہ بھی ہے کوئی نام ایسا، عشق کو عشق کی نیت کو
تول لے آنکھوں آنکھوں میں جانچ باتوں باتوں میں

رات گئی اور بات گئی عشق اسے سمجھا ہی نہیں
رات نہیں وہ راتوں میں بات نہیں وہ باتوں میں

تو جب آیا رات ہوئی تیرے جاتے ہی پھر دن تھا
راتیں گذری ہیں دن میں، دن گذرے ہیں راتوں میں

عشق سے کدر رکھنے والے آدم کی اولاد نہیں
کوئی شرافت کا لچھن ڈھونڈ نہ ان بد ذاتوں میں

با سر و ساماں بے سر و ساماں رہتے ہیں عشاق
انقلاب ہوتے رہتے ہیں ایسوں کی اوقاتوں میں

سایۂ مژگاں میں جو پلی اور جو سکوت سے پیدا تھی
وہ رات وہی تھی راتوں میں بات وہی تھی باتوں میں

ہر اظہار وفا کے بعد مجھکو فراق یہ دھیان آیا
فرق بہت ہے عشق میں اور لمبی چوڑی باتوں میں

(۲)

کب خوش ہوں اور کب ہوں اداس محفل والے کیا جانیں
جیسا تیری نگاہ کہے، ہم دل والے کیا جانیں

ہوا چلی او وہ بند ہوئی خاک اُڑی اور بیٹھ گئی
منزل ان کو کہاں لائی منزل والے کیا جانیں

حسن ہے کتنے پانی میں عشق ہے کتنے پانی میں
ڈوبنے والے کیا جانیں ساحل والے کیا جانیں

مشکل کی آسانی کو پوچھ نہ سہل پسندوں سے
آسانی کی مشکل کو مشکل والے کیا جانیں

حُسن وعشق کے معرکہ میں اپنے بھی بیگانے ہیں
قاتل والے کیا جانیں بسمل والے کیا جانیں

رنج وخوشی کی کیفیت سب کو نصیب ہوئی لیکن
جو محفل پر گذری ہے محفل والے کیا جانیں

حسن ہی کیا اور عشق ہی کیا ہم سی فراق یہ بات نہ پوچھ
ہم دل والے کیا سمجھیں، ہم دل والے کیا جانیں

:: (۳) ::

پہلے بھی رو لیتے تھے کچھ دن کو کچھ راتوں کو
دل ہی ڈوبا جاتا ہے آگ لگے برساتوں کو

عشق کی پہلی غفلت ہی کھلتے کھلتے کھلیگی آنکھیں
کون ٹھوکے دیتا ہے کچی نیند کے ماتوں کو

آپس کے الزاموں سے کوئی نتیجہ نکلا ہے
ملے رہیں کہ بچھڑ جائیں؟ جانے دو ان باتوں کو

آج نگاہوں سی ظاہر غصہ بھی ہی لگاوٹ بھی
جانے دے ان باتوں کو رہنے دے اِن گھاتوں کو

ہر امکانی کوشش ہی دھر سی آج - مگر دیکھو
شاہد حُسن بنا پائے عشق کی بگڑی باتوں کو

گاہ وہ رخ چمکا گاہی رخ پر زلف سرک آئی
ایک رات میں دیکھ لے آج گھٹتی بڑھتی راتوں کو

جب شب ماہ میں اسکی نگاہ ایک کہانی ہوتی تھی
یاد نہ کر ان راتوں کو بھول بھی جا ان باتوں کو

جور وکرم کی شرط نہیں وصل فراق کی بات نہیں
دن کو دن کر دے اے دوست اپنی کر دے راتوں کو

وہ دل امڈے ہیں کہ فراق الٹی گنگا بہتی ہے
سیدھی راہ لگائے کون ان کافر برساتوں کو

رہی آپ کی اور میری شرط
پہ ثابت کیجیے کہ آپ نے کبھی "واڈیا برادرس" کے ڈائمنڈ تھریلر
WADIA
MOVIETONE
ڈائرکٹر
ہومی واڈیا
ڈائمنڈ کوئین
جیسی فلم دیکھی ہے، اور میں ثابت کرتی ہوں کہ آپ کیا کسی نے بھی نہیں دیکھی ہے؟ جی
یقین نہ آئے تو میں کیا کروں — پردہ سیمیں میری دعوے کو خود صحیح ثابت کردیگا" فقط
آپکی طالب دیدار ناڈیا
اداکار:- ڈائرکٹر ہومی واڈیا کا تمام ڈائمنڈ کاسٹ۔
جان کاوس نا فیرلیس ناڈیا۔ سردار منصور
رادھا رانی (جسکے تین مختلف ناچ آپکو مخمور کردینگے)
سایانی نظیرہ فہیمہ گھوڑا رنجی کا بیٹا ہوشم ردوس رائس کا بیٹی
لیمنگٹن ٹاکیز بمبئی

Leela Chitnis.

See her in "Bandhan" Bombay Talkie's latest hit coming at Roxy.

NADIA in Wadia's "Diamond Queen".

Sardar Akhtar & ☞ Vatsala Kumtekar. See them in National Studios "Woman."

Sardar Akhtar

See her in Minerva's latest hit "BHAROSA".

جنگ دور ہو سکتی ہے دنیا میں امن قائم ہو سکتا ہے
اگر انسان انسان کو اپنا دشمن نہ سمجھے
اگر قوت برداشت لوگوں میں پیدا ہو جائے
اگر سب لوگوں کے دل خدا کے نور سے روشن ہو جائیں
اگر انسانیت کا دور دورہ ہو
گیارھواں شاندار ہفتہ
प्रभात चित्र
ITS PRABHAT
پربھات کی شاندار پیشکش
سنت گیانیشور
ڈائرکٹرز فتح لال اور ڈاملے
نے اپنی بلند انسانیت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا
اداکار شاہو مودک یشونت
اداکار سماجی گھپے منجلا وغیرہ
سنٹرل ٹاکیز گرگام بمبئی
ہندوستانی زبان میں ہر روز ایک شو پونے دس بجے رات کو
سنیچر اتوار اور تہوار کو دو شو سات بجے اور پونے دس بجے
عشق ایک جذبہ ہے پاکیزہ اور ملکوتی
ہوس ایک جذبہ ہے کثیف اور شیطانی
MINERVA PRODUCTION
ڈائرکٹر سہراب مودی
منروا موی ٹون کا
بھروسہ
اداکاران خصوصی
چندرموہن — سردار اختر
مظہر خان — شیلا
مایا دیوی — نول
ایرچ تارا پور — گلاب
منیکا — ابوبکر — غلام حسین
ان دونوں کے درمیان حد امتیاز قائم کرنیوالا افسانہ ہے
بہت جلد منروا سینما (لیمنگٹن روڈ) پردہ سیمین پر پیش کیا جائیگا

بادشاہ اور فلسفی

(ٹالسٹائی)

از جناب اظہر احمد رضا صاحب (ارکوی)

زمانہ قدیم میں کرُوسس ایک جلیل القدر اور دولتمند بادشاہ کسی خطۂ ملک پر حکمران تھا۔ اتفاق سے ایک روز ایک عقلمند اور منصف مزاج گریکس فلسفی سولن اس سے ملنے کو آیا۔ تخت شاہی پر جلوہ افروز اور لباس فاخرہ میں ملبوس کروسس نے سولن سے پوچھا "کیا تم نے کبھی اس سے بھی زیادہ شاندار چیزیں دیکھی ہیں"

"بیشک!" سولن نے جواب دیا۔ "مور، مرغا، بیسیوں اور دوسرے حسین پرندوں کے سنہرے رنگ جیسے چمکیلے پر اس شان سے چمکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی آرٹ (ART) بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

تب کرُوسس نے اپنے سارے زر و جواہر اور دوسری قیمتی چیزیں سولن کو دکھائیں اور میدان جنگ کے اپنے بیش کارنامے بتائے اور اسے ان دشمنوں کی فہرست بھی بتائی جو خود اس کے ہاتھوں سے مارے گئے تھے اور پھر اپنے فتوحات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا "سولن تم ایک زمانہ سے دنیا میں ہو اور اب تک نہ معلوم تم نے کتنے ملکوں کی سیر کی ہوگی، ذرا بتاؤ تو سہی کہ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ خوش کون شخص ہے؟"

سولن :- میرے خیال میں اس وقت ایتھنس کا ایک غریب باشندہ ساری دنیا کے باشندوں سے زیادہ خوش ہے۔

"تم ایسا کیوں کہتے ہو؟"

سولن :- کیونکہ اس شخص نے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے ساری زندگی محنت اور جانفشانی سے کام کیا ہے تھوڑی سی چیز سے بھی وہ آسودہ اور مطمئن رہا اپنے بچوں کی اچھی طرح پرورش کی، عزت کے ساتھ اپنے شہر کی خدمت کی اور اسلئے اب اس کو ایک بلند مرتبہ حاصل ہے اور وہ شہرت کے اعلیٰ دور سے گزر رہا ہے۔

کروسس :- "سولن! تو کیا میں ایسا ہیچ اور ناکارہ ہوں کہ ایک غریب شخص کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا؟"

سولن :- "اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ امیروں کی بہ نسبت غریب زیادہ خوش رہتے ہیں"

بادشاہ کو فلسفی کی باتیں کڑوی معلوم دیں۔ اسنے اسے سامنے سے نکال کر دلیں کہا۔ اف! دنیا کے رنج و غم، فکر و تردد سب بیکار چیزیں ہیں۔ جبتک زندگی ہے انسان کو خوش رہنا چاہیئے۔"

کچھ دنوں بعد وہ فلسفی کو ایکدم بھول گیا۔

—— ۲ ——

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ یکایک بادشاہ کا لڑکا مرگیا اور ابھی اسے اس صدمہ سے نجات بھی نہ ملی تھی کہ اسنے شہنشاہ سیرس کے حملے کی تیاریوں کی خبر سنی۔

کروسس ایک عظیم الشان فوج لیکر مقابلہ کو گیا، لیکن

دشمنوں نے بازی جیت لی اور وہ کروسس کے سپاہیوں کو قتل کرکے دارالسلطنت میں گھس آئے ۔

غنیم نے سارے شہر کے اندر لوٹ اور غارتگری شروع کر دی ۔ جگہ جگہ آگ لگا دی ۔ بالآخر ایک سپاہی نے کروسس کو بھی گرفتار کر لیا اور وہ اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اسکے لڑکے نے سامنے آکر کہا اسے چھوڑ دو یہ شاہ کروسس ہے دشمن کے سپاہی اسے پکڑ کر اپنے بادشاہ کے پاس لے گئے لیکن وہ چونکہ اپنی فتحیابی کی خوشی میں مصروف تھا اس لئے بلا اس سے بات کئے اسے مار ے جانے کا حکم جاری کر دیا

شہر کے بیچ کے چورا ہے پر سپاہیوں نے ایک چتا تیار کر کے کروسس کو اس پر بٹھا دیا ۔ کروسس نے حسرت بھری نگاہ سے چاروں طرف دیکھا ۔ اس وقت اسے فلسفی کی باتیں یاد آنے لگیں ۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور نہ سسکتی آواز میں صرف اتنا کہہ سکا سولن ! سولن !! سولن !!! ۔

سپاہی چتا کو ڈھانپ ہی رہے تھے کہ شہنشاہ سیرس بھی اس موت کے نظارہ کو دیکھنے کو آیا ۔ اس نے کروسس کے الفاظ کو سنا لیکن انکا مطلب نہ سمجھ سکا ۔

سیرس نے فوراً سپاہیوں کو کروسس کو چتا سے باہر لانے کو کہا ۔ اور جب وہ اس کے سامنے لایا گیا تو سیرس نے ان الفاظ کا مطلب دریافت کیا جو اس نے ابھی ابھی بڑ بڑائے تھے ۔

کروسس :۔ میں ایک دانشمند فلسفی کے نام کو دھرا رہا تھا ـــــ اس شخص کے نام کو جس نے مجھے نہایت سچی بات کہی تھی ۔ ایک ایسی حقیقت جو اس دنیا کے سارے زر وجاہ سے اور ساری شان وشوکت سے زیادہ قیمتی ہے "۔

کروسس نے پھر تفصیل کے ساتھ سیرس سے اس گفتگو کا حال بیان کیا جو اس کے اور سولن کے درمیان ہوئی تھی ۔

سیرس نے یہ سنکر دل میں یہ خیال کیا کہ وہ کچھ بھی ہو کروسس بھی تو آخر انسان ہی ہے ۔ اسے کیا خبر تھی کہ اسکی قسمت میں کیا ہے "۔

ان باتوں پر غور کر کے اسے کروسس پر رحم آگیا اور اس نے کروسس کو اپنا دوست بنا لیا ۔

(آزاد ترجمہ)

(بقیہ گوہر منتب چراغ)

تلاش میں سرگردان ہے اور تجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا تو سن ! ـــــ تو ہی کسی کا مخلص دوست بن جا پھر دیکھ کر ضرور تو اپنے مقصد میں کامیاب ـــــ ہوگا ـــــ جب تو خود کسی کا مخلص دوست نہیں بن سکتا تو پھر یہ کیسے امید رکھتا ہے کہ تجھے کوئی مخلص دوست مل جائے ؟ (ریاض جنیدی)

نیکی :ــــــــــ

کسی نے پوچھا حقیقی نیکی کیا ہے ؟

مدرسہ نے کہا ـــــ علم

مذہب نے کہا ـــــ عبادت و تقویٰ

حکومت نے کہا ـــــ قانون و سیاست

خدا پرست نے کہا ـــــ سچائی اور حق پرستی

دولتمند نے کہا ـــــ روپیہ

بیوقوف نے کہا ـــــ عیش و عشرت

ـــــ (ریاض جنیدی)

تاثرات

از محترمہ زبیدہ زرّیں صاحبہ

شیطان کو آمادہ شر دیکھ رہی ہوں
میں قید مقامی کا اثر دیکھ رہی ہوں

وہ مرد مسلمان جو شرقی تھا نہ غربی
میں اب اسے پابستہ گھر دیکھ رہی ہوں

اس جنگ کے شعلوں سے پرے میری نظر ہے
مزدور کی میں فتح و ظفر دیکھ رہی ہوں

حق غلبۂ باطل سے تو ہے خائف و لرزاں
باطل کو مگر حق سے نڈر دیکھ رہی ہوں

یہ دور غلامی ہے کہ دم توڑ رہا ہے
میں اس کو بانداز دگر دیکھ رہی ہوں

شمشیر پلٹ سکتی ہے تقدیر امم کو
میں وسعت کردار بشر دیکھ رہی ہوں

ہونے کو ہے کچھ پردۂ مشرق سے ہویدا
تابندگیٔ نور سحر دیکھ رہی ہوں

پاکستانی تحریک

غزل

از جناب سید ابن حسن صاحب برق دہلوی

حسن خود بیں کو شرمسار نہ کر
جذبۂ شوق آشکار نہ کر

اپنا رخسار داغدار نہ کر
سرمئی چشم اشکبار نہ کر

یوں ہی تیر نظر قیامت ہے
اور بھی اس کو آبدار نہ کر

زیست کو خود ہے شکوۂ خالق
شکوۂ زیست زینہار نہ کر

شاخ طوبیٰ پہ آشیاں ہے ترا
خاکساری کو اختیار نہ کر

اپنی قسمت بدل سکے تو بدل
پر گلہ اس کا بار بار نہ کر

او قناعت کے چاہنے والے
اپنی اشرافیت کو خوار نہ کر

تیرے نخچیر ماہ اور پرویں
اپنی ہستی کا خود شکار نہ کر

خاص برائے "تنویر"

البم

(مختصر افسانہ)

از حساس ادیب — جناب دکھی پریم نگری

آپنے البم تو ضرور دیکھا ہوگا شاید آپکے پاس بھی ہو؛ جس میں آپنے اپنی محبوب ترین تصاویر چسپاں کر رکھی ہوں اور جب ہجوم افکار سے آپ کا دل پریشان ہوجاتا ہوگا تو آپ اس سے اپنا دل بہلاتے ہوں گے۔ کیوں ہے نا یہی بات آپنے بھی کئی اداس راتیں اور خاموش دوپہریں ایسے ہی البموں کے سہارے تو کاٹی ہیں ———

میرے پاس بھی ایک البم ہے ——— !

مگر نہ تو اسکی جلد ہی سنہری ہے اور نہ حاشیہ ہی پر سنہری و روپہلی بیلیں بنی ہوئی۔ اس لئے میرا مرقع آپکے البموں سے بہت کچھ مختلف ہے۔ میں نے بھی کچھ تصویریں رکھ چھوڑی ہیں کچھ نئی ہیں اور کچھ پرانی۔ چند کے نقوش نہایت گہرے ہیں اور چند کے نقوش امتداد زمانہ کے زیر اثر بہت مدھم پڑ گئے ہیں۔

دن تو چاہے مختصر ہو یا طویل لوہے کی خونخوار مشینوں کے درمیان کٹ جاتا ہے۔ پانچ بجے میل سے چھٹی ملتی ہے۔ ایک سنگل چائے ایک پان ایک سگریٹ ایسے آپ چاہے عیاشی کہہ لیجئے یا جو جی چاہے۔ اور پھر ہوٹل سے نکلکر نظارۂ حسن و شعر پھر آوارہ گردی کرتے ہوئے وہی ہوٹل کا کمرہ۔ کھانا کھا کر پھر تھوڑی سی عیاشی یعنی وہی چائے پان اور سگریٹ پھر میرے قدم خود بخود اپنی کوٹھری کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔

سنہ کے تیل کا چراغ ایک ہی پھونک میں گل ہو جاتا ہے اور میں آنکھیں بند کر کے اپنا البم کھولتا ہوں۔ سب سے پہلے جو تصویر نظر آتی ہے وہ ایک حسین بنگالی دوشیزہ کی ہوتی ہے۔ بادلوں جیسی سفید ساڑھی میں ملبوس۔ ایک کھجور کے درخت سے لگی کھڑی ہوتی ہے ایک سائکل پاس پاس ہی پڑی ہوتی ہے۔ نظروں سے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کسی کا انتظار کر رہی ہو کانوں کے سرخ آویزے ایک لطیف سی جنبش کے ساتھ جگمگا اٹھتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ملکوتی تبسم فردوسی لبوں پر رقص کرنے لگتا ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے "ہردے نگر کی رانی — سہاگنی"

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ورق الٹ دیتا ہوں دوسری تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ ایک فسردہ صورت نوجوان کی ہوتی ہے جسکے رخساروں پر آنسو تھمے ہوئے ہوتے ہیں پاس ہی ایک دوسرا نوجوان اسکے رخساروں سے آنسو پونچھتا ہوتا ہے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے غمگسار شہزادہ ——— میرا اسلم ! آہ کر کے پھر ورق الٹتا ہوں

اس دفعہ ایک نہایت حسین تصویر ہوتی ہے ——— ایک نہایت سندر لڑکی ایک کتاب پڑھتی ہوتی ہے اس کے کانوں میں جھمکے۔ ہاتھوں میں پہنچی و آرسی

آنکھوں میں کاجل ناخنوں پر مہندی ـــــــ بالکل جیسے دُلہن اس تصویر کے نیچے تحریر ہوتا ہے۔ مرنال۔ خدیجہ یا رادھا جسے سماج نے دیشیا بننے پر مجبور کر دیا" اس تصویر کو دیکھتے ہی میری مٹھیاں بندھ جاتی ہیں دانت ایک دوسرے میں پیوست ہو جاتے ہیں اور میں اپنے دل کو اپنی مٹھی سے بھینچ لیتا ہوں ـــ اسکے بعد جی گھبرا اٹھتا ہے میں جلدی جلدی تصویریں الٹنا شروع کرتا ہوں ماں باپ ـــــ بھائی بہن۔ دوست احباب یار ـــــ سب کی تصویریں نظروں سے گذر جاتی ہیں ـــــ آخری ورق پر میں ٹھہر جاتا ہوں ـــ اس ورق پر ایک سیاہ حاشیہ بنا ہوتا ہے کوئی تصویر نہیں ہوتی۔ نیچے چند لفظ لکھے ہوتے ہیں۔ بیکس۔ بدبخت۔ بروگی۔ دُکھی۔ غریب لاچار۔ دل کی ہوک سے میری آنکھیں کھل جاتی ہیں ـــــ نیند اچٹ جاتی ہے۔ میں کٹیا سے باہر نکل آتا ہوں اور ریل کی سیٹی کا انتظار کرنے لگتا ہوں ـــــ

ہاں وسنت کا دل البم ہی تو ہے جس کی ہلکی سی جھلک آپنے دیکھی!

افکار تازہ

(از جناب مولانا محمود اسرائیلی صاحب مدظلہ)

جو کبھی سبب تھا نشاط کا وہی آج وجہ ملال ہے
نہ یہاں خوشی نہ یہاں الم یہ جہاں جہانِ خیال ہے

وہ ہوں مجھ سے لاکھ کنارہ کش، انہیں ہے خیال نہیں تو کیوں
کہ رفیق جان وانیس دل دم حزن ان کا خیال ہے

ترے اک تبسم ناز سے مٹیں دل کی ساری کدورتیں
ہے نصیب لذت گفتگو نہ جواب ہے نہ سوال ہے

وہ چھپا رہے ہیں جو حال دل کوئی ہوگی اسمیں بھی مصلحت
مرے غم کا انپہ اثر نہ ہو یہ خیال خام خیال ہے

تری نکہتوں کا تو غم نہیں تری بے رخی ہی کا ہے گلہ
جو زوال کو تو سمجھ سکے تو زوال وجہ کمال ہے

ابھی آئے تھے کہ ابھی چلے ہوئے خاک، خاک میں مل گئے
یہی زندگی کو قیام ہے؟ یہی زندگی کا مآل ہے؟

تری بعد زیست ہے مرگ اور مری بعد مرگ حیات ہے
مگر اپنی اپنی تلاش ہے مگر اپنا اپنا خیال ہے

تری چشم شوق پڑے اگر تجھے عیب آئیں ہنر نظر
تری دلکشی نگاہ کا ہی جہاں میں نام جمال ہے

خدا کی مصلحتیں

(از چودھری اقبال حسین بی۔ اے)

خدا کی مصلحت ..... ان تین الفاظ کے جملے سے کسی کے کان نا آشنا نہ ہونگے۔ جن پر روزانہ کوئی نہ کوئی آفت پڑتی ہے۔ اُن کو دن میں کئی مرتبہ ان الفاظ کو سننے کا اتفاق ہوتا ہے۔ غرضیکہ دنیا میں جس پر سب سے زیادہ مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ اس کا مفہوم سمجھ سکتا ہے۔ اگر ایک شخص ظلم کے ہاتھوں شکار ہوتا ہے۔ تو اس کے خویش و اقارب۔ احباب۔ دوست۔ آشنا.. جن جن کو اُس کی مصیبت کی خبر ملتی ہے۔ یہاں تک کہ سلام علیک والے بھی اُس کے گھر پر جوق در جوق جمع ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اس میں خدا کی مصلحت ہوگی۔ پرسانِ حال میں سے کوئی یہ جملہ کہے بغیر واپس نہیں جاتا۔ لیکن جو اس کو زیادہ مرتبہ دُہراتا ہے وہ زیادہ اُس کا ہمدرد اور شریکِ غم تصور کیا جاتا ہے۔

بچپن سے ہی "اس میں خدا کی مصلحت ہے" سُنتا چلا آ رہا ہوں اور اب بھی کثرت سے سُننے کا اتفاق ہوتا ہے۔ لیکن صغر سنی میں مجھے اس پر جو تعجب ہوتا تھا وہ اب نہیں ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ اُس وقت میں اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔ جب کبھی والد صاحب پر کوئی مصیبت پڑتی یا اُن کو کوئی نقصان پہنچتا تو سب عزیز، بھائی، بہنیں، پڑوسی، دوست، آشنا ہمارے گھر پر جمع ہونے شروع ہو جاتے اور ہر ایک یہی کہتا اس میں خدا کی مصلحت ہوگی۔ اس واسطے گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

جب مجھے معلوم ہو گیا کہ ایسا کہنے کے بغیر کوئی نہیں رہتا تو پھر جب کبھی والد صاحب کو کوئی ایسا رنجیدہ موقع پیش آتا تو جب آنے والا باہر کے دروازہ کی دہلیز پر ہی قدم رکھتا میں اُس کے چہرہ پر وہیں سے ٹکٹکی باندھے تکنا شروع کر دیتا۔ کیونکہ مجھے اس کے چہرہ سے معلوم ہو جاتا کہ وہ ضرور آ کر کہے گا۔ اس میں خدا کی مصلحت ہے۔ جب تک وہ یہ الفاظ کہہ نہ لیتا۔ میرا دل دھڑکتا رہتا تھا نہ جانے کیوں ...

بعض اصحاب تو گھر ہی سے ہمدردی کا اظہار کرنے کی اس طرح ٹھان کر آتے تھے کہ دروازہ کے اندر ابھی قدم رکھتا ہی نہیں کہ کہنا شروع کر دیتے۔ اس میں فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ اس میں خدا کی مصلحت ہے اُن کے اس رویّہ سے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک شخص جس کی گردن بوجھ کی وجہ سے دبی جا رہی ہے۔ وہ دروازے پر پہنچتے ہی بوجھ کو زمین پر دے مارتا ہے۔ اسی طرح ان کو بھی ہمدردی کا بوجھ لگا ہوتا تھا جو آتے ہی پھینکنے کی فکر کرتے۔

جب میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ وہاں بھی مجھے طالبعلموں سے یہ تین الفاظ کا جملہ جس میں خدا کا راز پوشیدہ سمجھا جاتا ہے اکثر سُننے میں آتا تھا۔ ایک دفعہ ہمارے ایک اُستاد کی بیوی اس دنیا کو خیر باد کہہ گئی تو ہماری کلاس کے طلبا ماتم پرسی کے لئے اُس کے یہاں گئے۔ سب نے السلام علیکم کے بعد باری باری کہا۔ اس میں خدا کی مصلحت ہے۔ جو بھی ماسٹر صاحب سے گویا ہونے لگتا میں اُس کے

مُنہ پر نظر جما لیتا کہ ابھی وہ کہے گا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ سچ مچ یہ ایسا ہی ہوتا ۔ اس طرح سب نے باری باری کہا اس میں خدا کی مصلحت ہے لیکن میں نے نہ کہا ۔ اس دوران میں جب تک ہم وہاں بیٹھے رہے ہیڈ ماسٹر صاحب کی مغموم نظر کہیں اتفاقاً میرے چہرے پر پڑ جاتی تو میرے چہرے کا رنگ اڑ جاتا اور مجھے شک ہوتا کہ کہیں ماسٹر صاحب مجھ سے خفا تو نہیں ہو گئے ۔ کیونکہ سب نے کہا تھا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ لیکن میں نے نہیں کہا ۔ میں بہت بے چین تھا کہ میرے ہم جماعتی یہاں سے اٹھیں تاکہ آئندہ کے لیے میں بھی یہ الفاظ استعمال کرنے کا تہیہ کر لوں ۔ خدا خدا کر کے وہ سب اٹھے اور میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب جہاں بھی ایسے موقع پر جاؤں گا ضرور کہوں گا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ اس طرح موقع کا منتظر رہا ۔

ایک دفعہ ہمارا ایک دوست یونیورسٹی کے امتحان میں فیل ہو گیا ۔ بہت سے لڑکوں نے مشورہ کیا کہ سب مل کر افسوس کرنے کے لیے اس کے گھر پر جائیں گے ۔ میں نے بھی اسی موقع کو غنیمت جانا ۔ دل میں تو پہلے ہی سے ٹھان چکا تھا ۔ آخر ہم سب اس بدقسمت کے گھر کو چل دیئے میں نے ہم سے سنا تھا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ راستے میں جاتے جاتے میرے دل میں یہ خیال چٹکیاں لے رہا تھا کہ کب اس کے گھر پہنچیں گے جبکہ میں یہ تین الفاظ جو میرے سر پر بار گراں بنے ہوئے تھے ادا کروں گا جب ہم وہاں پہنچے سب نے باری باری کہنا شروع کیا دوست فکر کرنے کی ضرورت نہیں اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ میں نے بھی یہ کہنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھ سے نہ کہا گیا ۔ میں چپکے سے ایک موٹے سے لڑکے کی آڑ میں ہو رہا اور اونچی سانس بھی نہ لی ۔ اس لڑکے نے سب سے باتیں کیں ۔ لیکن میری طرف کسی نے دیکھا تک بھی نہیں ۔ سب باتیں کرنے میں ہمہ تن مصروف تھے ۔ لیکن میں اس خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ مجھ سے سب ناراض ہو گئے ہیں ۔ کیونکہ سب نے کہا ہے اس میں خدا کی مصلحت ہے لیکن میں نے نہیں کہا ۔ . . . میں دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا کہ آج یہاں سے چھٹکارا ملے تو اور کہیں ہرگز یہ کہنے سے باز نہ آؤں گا . . . . اس دن سے میں نے مصمم ارادہ کر لیا خواہ موقع ہو یا نہ ہو یہ کہنے کی ضرور پریکٹس کروں گا ۔ خدا خدا کر کے وہ سب وہاں سے اٹھے اور یہ مرحلہ بھی ٹل گیا ۔ راستے میں میں یہ جملہ یاد کرتا ہوا آ رہا تھا کہ اس قدر منہمک ہو گیا کہ بعض دفعہ ذرا اونچی آواز سے نکل جاتا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ دوسرے لڑکے میری طرف دیکھ کر پھر اپنی باتوں میں محو ہو جاتے کیونکہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کس چیز نے میرے میں تلاطم برپا کر رکھا ہے . . . . سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور میں موقع کا منتظر رہا ۔

آج سے میں نے یہ کہنے کی پریکٹس شروع کر دی ۔ ہر جگہ اس کو استعمال کرنا شروع کر دیا خواہ یہ برمحل ہو یا نہ ہو ۔ اگر کوئی لڑکا مجھے کہتا دوست آج میری پنسل گم ہو گئی ہے میں جھٹ کہہ دیتا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ اگر کوئی کہتا کہ میری سلیٹ ٹوٹ گئی ہے ۔ تو میں یہ الفاظ کہنے میں کامیاب ہو جاتا ۔ غرضیکہ میں یہ کہنے کا اتنا عادی ہو گیا کہ ہر موقع پر اپنے ارادے میں کامیاب رہتا ۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ماسٹر صاحب نے کلاس میں ایک لڑکے کو خوب پیٹا ۔ میں موقع کا منتظر رہا کہ کب کلاس سے باہر نکلیں گے اور میں اس کو کہوں گا اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ جب گھنٹہ ختم ہوا اور سب لڑکے کمرہ سے باہر نکلے تو میں نے اس لڑکے کو مخاطب کر کے کہا . . . دوست آج تو تجھے خوب سزا ملی ۔ اس میں خدا کی مصلحت ہے ۔ میرا یہ تین آخری الفاظ کہنا ہی تھے ۔ کہ اس نے میری کنپٹی پر مکا رسید کر دیا ۔ میں بھی برانگیختہ ہو گیا ۔ بس کیا تھا دونوں آن کی آن میں گتھم گتھا ہو گئے ۔ دوسرے لڑکوں نے ہمیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا اور ماجرا پوچھا لیکن میں ایک طرف کو چل دیا اور دل ہی دل میں کہا کہ میں بھی اپنے

ارادے سے باز نہ آؤں گا۔ جہاں بھی جاؤں گا ضرور کہوں گا اس میں خدا کی مصلحت ہے اور موقع کا منتظر رہا۔

یہ موقع آن پہنچا جب میرے ایک دوست کے گھر میں چوری ہوگئی اور بہت سا زر و مال لُٹ گیا۔ بہت سے لوگ اظہارِ افسوس کے لیے اس کے گھر گئے۔ مجھے بھی موقع ہاتھ آیا اور میں بھی وہاں جاکر یہ کہنے کے لئے تیار ہوگیا۔ چلتے وقت میں نے یہ ارادہ کیا کہ جب سب یہ کہنے سے فارغ ہوجائیں گے تو میں سب سے آخر میں ذرا اونچی آواز سے یہ کہوں گا۔ اس طرح ان کی نظروں میں زیادہ ہمدرد سمجھا جاؤں گا۔ جب ہم وہاں پہنچے سب نے اس جملہ کے ساتھ اظہارِ افسوس کیا۔ لیکن میں نے سب سے آخر میں کہا۔ اس میں خدا کی مصلحت ہے۔ وہ صاف گو آدمی تھا۔ اُس نے فوراً میرے مُنہ پر کہہ دیا کہ ہمارا گھر لُٹ گیا اور آپ کے لیے یہ خدا کی مصلحت ہے۔ میں دل میں بہت نادم ہوا۔ خیر! یہ وقت گذر گیا اور پھر جلدی ایسا موقع پیش نہ آیا۔ اس واسطے مجھ اس میں خدا کی مصلحت ہے کہنے کی عادت بھولی نہیں لیکن کم ہوگئی۔ اب کبھی کوئی اظہارِ افسوس کا موقع ہو تو اگر یہ جملہ اُس وقت یاد ہو تو فقدنی انداز میں کہہ دیتا ہوں۔ لیکن بھولا ہوا ہو۔ تو میں بھی اس کا استعمال کرنے سے بھولا رہتا ہوں۔

یہ ہیں خدا کی مصلحتیں۔ خواہ ایک بیچارہ آدمی تباہ ہو رہا ہو۔ دھن دولت، بال، بچّے۔ ماں باپ اور گھر بار سب تباہ ہوجائیں لیکن کہا جاتا ہے اس میں خدا کی مصلحت ہے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ مصیبت کا دوسرا نام خدا کی مصلحت ہے۔

بعض آدمی اس جملے کا استعمال ہی نہیں کرتے بلکہ تعبیر بھی کرتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح سچ کر دکھاتے ہیں۔ مثلاً ایک سال ایک طالب علم فیل ہوجاتا ہے تو اس کو اُس سال تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں خدا کی مصلحت ہوگی۔ لیکن جب دوسرے سال حُسنِ اتفاق سے وہ سیکنڈ یا فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوجاتا ہے۔ تو وہی لوگ اس کو کہتے ہیں دیکھا ہماری بات سچ نکلی۔ پہلے سال اگر تو پاس ہوتا تو تھرڈ ڈویژن میں ہوتا جو پاس نہ ہونے کے برابر ہے۔ لیکن اب ایک سال زیادہ خرچ ہوا تو کیا ہوا، پاس تو اچھی طرح سے ہوگیا۔ اسی طرح اور نقصانات کی تعبیریں بھی گھڑی جاتی ہیں۔ مثلاً کسی کا شیر خوار بچہ مرجاتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں خدا کی مصلحت ہے کیونکہ خداوند کریم اس کو دُنیا کے رنج والم سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اس واسطے پہلے ہی سے اس کو اپنے پاس بُلا لیا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کا روپیہ یا مال چوری ہوجاتا ہے تو اس سے ہمدردی ظاہر کرنے والے کہتے ہیں شکر ہے اللہ کا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ اس میں خدا کی مصلحت تھی کہ خدا آزار جان دینے کے بجائے روپیہ لے گیا۔ انسان کی زندگی ہو تو کافی روپیہ کما سکتا ہے۔ اس واسطے فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ علٰے ہذا القیاس . . . ۔ میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

میٹھے چہرے کی یاد

(از مسز وشترا ا م)

جب میں اپنی آنکھوں میں آفتاب کی دھیمی روشنی لیئے ہوئے اٹھتی ہوں تو صبح مجھے بہت ہی خوشنما اور آسمانی نظر آتی ہے۔ وہ دھیمی روشنی مجھے رات کے میٹھے خوابوں سے بیدار کرتی ہے۔ وہ خواب جو تیرے میٹھے چہرے اور گود کے ہیں۔ کاش کہ وہ میرے خواب سچ ہوتے۔ یا پھر میں خواب سے بیدار ہی نہ ہوتی۔
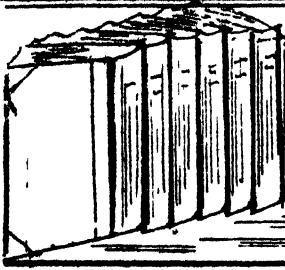
خدا پر بھروسہ

دریا کے دھارے پر دو کشتیاں بہی جا رہی ہیں۔
ایک وہ جس پر ملاح کی جگہ صرف خدا کا بھروسہ.......
بیوپاروں کو کشتی کے ایک گوشہ میں بکھرے ہوئے اسکی رحمت کی آس لگائے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے
... . دوسری کشتی پر کئی جانباز ملاح خدا کے بھروسہ پر اپنی ان طاقتوں سے کام لے رہے ہیں جو خدائے برتر نے ان کو عالم کون و فساد میں ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کیلئے ودیعت کی ہیں۔
.... کون کہہ سکتا ہے کہ پہلے کشتی ساحل مقصود تک پہنچے گی یا دوسری.........
اب ہمیں سوچنا چاہئے کہ ہم ان دونوں کشتیوں میں سے کس پر سوار ہیں ——

انسان و حیوان ——

جب "ان کے" سامنے آزادی کا نام لیا جاتا ہے تو وہ ایسے خوش ہوتے ہیں جیسے چھوٹے چھوٹے بچوں کی نانی جان کوہ قاف میں رہنے والی کسی خوبصورت پری کی جھوٹی کہانی سنا رہی ہوں۔ گویا آزادی وہ پری ہے جسکو انسانی آنکھ نہیں دیکھ سکتی اور نہ دستِ رسا اس کے دامن تک پہونچنے پر بھروسہ رکھتا ہو........
جب غلامانہ ذہنیت کی پستی کے ڈانڈے یہاں آملتے ہیں۔ تو کوئی کتنا ہی سمجھائے ہر غلام اپنی آزادی حاصل کرنے والے جوہر عمل سے اسقدر دور ہو جاتا ہے کہ وہ ہر کوشش کو اپنے بس کا روگ نہیں سمجھتا۔ کیا ایسے لوگوں سے وہ پرندے برتر و افضل نہیں جو مضبوط آہنی پنجرے میں آزادی کے لئے پھڑک پھڑک کر لہولہان ہو جاتے ہیں۔

(طاہرہ عارفی رامپور)

"وہ لفظ"

جیسے ہی پگڈنڈی پر ہم اس سے دوبدو ہوائیں تھے خیال کیا کہ مجھے اس سے کچھ کہنا ہے۔ لیکن پلک جھپکتے اس خیال کو سوچتا وہ چلی گئی!
وہ لفظ جسکو میں اس سے کہنا چاہتا تھا۔ دن اور رات یوں جھولا جھولتا رہتا ہے جیسے ایک کشتی، گھنٹوں کی ہر موج پر!
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ "وہ لفظ" خزاں کے گھرے ہوئے بادلوں میں چلا گیا ہے۔ اور شام کی چھٹکتی ہوئی کلیوں میں اور سورج کے آخری لمحوں میں

ڈھونڈتے ہوئے ایک نامعلوم تلاش کو!
وہ جگنو کی مانند میرے من میں جھلملاتا ہے!
اور اسکی روشنی میں اپنی ناامیدی کی خاک کو پانے کیلئے
کوشاں ہوتا ہے!
وہ لفظ جس کو میں اس سے کہنا چاہتا تھا!!!
(ٹیگور) مترجمہ سعید مظہر صاحب

ٹیگور کے تین گیت

(۱)

مئی کا مہینہ تھا اور سخت گرمی پڑ رہی تھی۔
دوپہر غیر معمولی طور پر طویل محسوس ہو رہی تھی اور خشک
زمین گرمی کی شدت سے پیاس کے مارے پھٹی جارہی تھی۔
اس وقت ندی کے کنارے میں نے کسی کے پکارنے کی
کی آواز سنی: "آؤ، میری پیاری"
میں نے کتاب بند کردی اور کھڑکی کھولکر باہر جھانکا
ایک موٹی سی بھینس، جسکی آنکھوں سے صبر و سکون مترشح
تھا، کیچڑ میں لت پت، ندی کے قریب کھڑی ہوئی تھی اور ایک
نوجوان گھٹنوں تک پانی میں کھڑا اسے نہلانے کیلئے بلا رہا تھا۔
میں مسکرایا اور مجھے اپنے دل میں ایک عجیب کیف
سا محسوس ہوا۔

(۲)

روزانہ وہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔
جا، اور میرے بالوں کا ایک پھول اسے دیدے سکھی۔
اگر وہ پوچھے، "یہ کس نے دیا ہے؟" میں تجھ سے التجا
کرتی ہوں کہ اسے میرا نام نہ بتانا
کیونکہ وہ صرف آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

وہ درخت کے زیرسایہ دھول پر بیٹھتا ہے۔
وہاں اسکے لئے پھولوں اور پتیوں کا فرش بچھا دے سکھی۔
اسکی آنکھیں مغموم ہیں اور اس سے میرے دل کو صدمہ
ہوتا ہے۔ وہ نہیں بتاتا کہ اسکے دل میں کیا ہے۔
وہ صرف آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

(۳)

اپنے دل کا راز چھپائے نہ رکھ میرے دوست!
اسے مجھ سے کہدے، صرف مجھ سے، رازدارانہ طور پر
تو، جو اسطرح نرمی سے مسکراتا ہے دھیرے سے،
سرگوشیوں میں کہہ دے۔ میرا دل سن لیگا اور میرے کان
نہ جان سکیں گے

رات تاریک ہے اور مکان خاموش۔
پرندوں کے آشیانوں پر خواب کا پردہ پڑا ہوا ہے۔
تو اپنے جھلملاتے ہوئے آنسوؤں، اپنے حسین
تبسم اور شرم و ڈر کے ذریعہ اپنے دل کا راز مجھ سے کہدے۔
(مترجمہ) ن، م، شیخ

گوہر شب چراغ

کہتے ہیں کہ دنیا میں دوست صادق کا ملنا دشوار ہے
— دوست آجکل کبریت احمر ہے — عنقا ہے —
وغیرہ — لیکن اے دوست اگر تو کسی سچے اور مخلص دوست کی
(بقیہ دیکھو صفحہ ۴۵)

(مسلسل)

سرگذشت

از ــــ سحر

پریذیڈنٹ صاحب فرشتہ سیرت انسان تھے، ان کی ساری عمر خدمت انسانی میں گذری ۔ ہزاروں دکھیوں کا وہ بڑا بھاری سہارا تھے ۔ کوئی انسان ایسا نہ تھا جو اپنی مصیبت لیکر ان کے پاس آیا ہو اور انہوں نے اسے مصیبت سے نجات نہ دلائی ہو ۔ چاہے پھر اس مصیبت کو رفع کرنے میں انہیں اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگا دینا پڑے وہ اپنے در سے کسی کو مایوس نہیں لوٹاتے تھے ۔

ایسے نیک اور برگزیدہ انسان کے قتل کے بعد مجھے اپنی قوم سے اور بھی نفرت ہوگئی ، کیونکہ اسی قوم کے ایک فرد نے یہ انسانیت سوز حرکت کی تھی کہ جس مقدس ہستی نے اسکی قوم کی ایک تباہ حال بیکس لڑکی کو بیٹیوں کی طرح پناہ دی اور مصیبت سے چھٹکارا دلایا اسی محسن کو اس بزدلانہ طریقے پر قتل کر دیا ۔ واقعہ یوں تھا کہ پریذیڈنٹ صاحب دو ہفتہ سے بعارضہ نمونیا شدید بیمار تھے ۔ دو دن سے انکی طبیعت ذرا ٹھیک تھی ۔ قاتل ان سے ملنے کے بہانے آیا ۔ ملازمین اُسے آنے نہیں دے رہے تھے مگر جب پریذیڈنٹ صاحب کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے کمال مہربانی سے بلوالیا اور اپنے پلنگ کے پاس کرسی پر بٹھالیا ۔

قاتل نے باتوں باتوں میں مذہبی بحث چھیڑ دی پر پریذیڈنٹ کے سکریٹری نے اسے روکا ، اور کہا کہ ڈاکٹر نے زیادہ بات چیت کرنے کی ممانعت کی ہے ۔ پریذیڈنٹ صاحب بھی یہ کہکر خاموش ہو رہے کہ صحت پانے پر ہم تبادلۂ خیال کرینگے اور آپکے اعتراضات کا جواب بھی دونگا ۔ تھوڑی دیر بعد قاتل نے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے ۔ پریذیڈنٹ صاحب نے اپنے سکریٹری کو کہا کہ وہ مہمان کے لئے شربت وغیرہ منگوائیں سکریٹری دروازے کے باہر نکلا ہی تھا کہ قاتل نے پریذیڈنٹ صاحب پر پستول سے لگاتار چار فائر کر دیئے ۔ فائر کی آواز سن کر سکریٹری پلٹ پڑا دوسرے ملازمین بھی دوڑ پڑے اور قاتل کو بھاگنے کی جد و جہد کرتے ہوئے پکڑ لیا ۔ اسپر بھی قاتل نے گولیاں چلائیں مگر وہ بھاگ نہ سکا بعد میں مقدمہ چلا ، قاتل نے جرم سے انکار کیا ۔ اس کے وکلاء نے اسے پاگل قرار دینا چاہا ۔ مگر کسی کی نہ چلی اور بالآخر اُسے پھانسی کی سزا ہوگئی ۔

میں اسبات پر جتنا بھی غور کرتی مجھے انسانوں کی

غلط روی پر سخت رنج و افسوس ہوتا۔ قطع نظر اس امر کے کہ پریذیڈنٹ صاحب میرے محسن اعظم تھے، میں ہی نہیں بلکہ ہر انسان اس بات کی مذمت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہیں دھوکے سے بیماری، بیچارگی اور تنہائی کے عالم میں قتل کیا گیا۔ اور انسانی خون بہایا گیا، مذہب کے نام پر۔ پھر طرہ یہ کہ اگر قاتل نے قتل کر کے اپنے مذہب کی خدمت ہی کی تھی تو بہادری سے اقرار جرم کیوں نہ کر لیا؟ او غلط یا صحیح اپنے کام کی عظمت کو کیوں گھٹایا؟ بہرکیف ان تمام ہولناک غلطیوں کے ذمہ دار نام نہاد مذہبی رہنما ہیں جو سراسر غلامی کی پیداوار اور نتیجہ ہیں ورنہ سچ پوچھو تو سچے مذہب اور مذہب کے پابند لوگوں کا خاتمہ تو اسی دن ہو چکا جس دن سے غلامی کے دور کا آغاز ہوا۔ چونکہ غلامی اور مذہب ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔

پریذیڈنٹ صاحب کی شہادت کی خبر سارے ہندوستان اور بیرون ممالک میں آناً فاناً پھیل گئی، اچھے اور سچے انسانوں کو اسکا بہت رنج ہوا چونکہ دنیا ایک سچے اور مفید انسان سے محروم ہو گئی تھی۔ بلالحاظ مذہب و ملت چاروں طرف سے تعزیت کے تار اور خطوط آنے لگے، اور ان کے معتقدین لاکھوں کی تعداد میں اس شہر میں آ آکر جمع ہونے لگے دو دن بعد جنازہ اٹھایا گیا، جنازے کے ساتھ کئی لاکھ کی تعداد میں مرد اور عورتیں تھیں۔

"ایسے اولوالعزم اور بڑے انسان کی موت بھی ایسی ہی شاندار ہونا چاہئے تھی" یہی بات سب کی زبان پر تھی

دوران بیماری میں انہوں نے ایک روز مجھے اور اپنے صاحبزادے کو بلایا تھا ان کے داماد اور چند ملنے جلنے والے بھی موجود تھے اس موقع پر انہوں نے اپنے لڑکے سے کہا تھا کہ "زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے میرا ضمیر اس بات سے بہت مطمئن ہے کہ میں نے اپنی زندگی اپنے خیالات کے مطابق گزاری اور کامیاب رہا۔ اس لئے میں مرنے سے نہیں ڈرتا، مگر اس لڑکی کی طرف سے مجھے البتہ فکر ہے۔ یہ روحانی طور پر میری بیٹی ہے۔ تم اسکے بھائی ہو میرے بعد اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے اسے اپنی حقیقی بہن سمجھنا۔ انسانیت کے خادموں کی نہ تو کوئی جائداد ہوتی ہے نہ دولت۔ تم کو میں نے اس قابل بنا دیا ہے کہ تم اپنی زندگی اچھی طرح گذار سکتے ہو۔ اور جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے اپنی تمام آبائی جائداد اور خود پیدا کیا ہوا دھن دولت انسانی خدمت کے لئے آج سے تیس سال قبل ہی وقف کر دیا تھا۔ لیکن گذشتہ ماہ میری فلاں فلاں کتابیں فروخت ہوئی تھیں، اس کے اتنے ہزار روپیہ ملا ہے جو میرے پاس اتفاقاً رکھا ہے اسمیں سے دو حصے اس لڑکی کے گزارے کیلئے ہیں اور ایک حصہ اس یتیم اور اچھوت لڑکے کے لئے ہے جو تعلیم پا رہا ہے جسکے تمام اخراجات کا میں خود کفیل تھا اور جو حرکات کر مضامین و کتابیں لکھ کر اسکی فیس وغیرہ دیا کرتا تھا۔ اسکی تعلیم ادھوری نہ رہ جائے۔ چونکہ یہ لڑکی ہے مرد کی طرح شدید محنت مشقت نہیں کر سکتی نہ ہمارے ملک میں عورتوں کیلئے اتنی سہولتیں ہیں اسلئے میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اس روپیہ میں سے دو حصے ملیں، اس روپیہ کو بنک میں جمع کرا دینا اسکے منافع سے اس لڑکی کی گذر آسانی سے ہو سکیگی۔

پریذیڈنٹ صاحب کی وفات کے بعد قدرتی طور پر

(بقیہ صفحہ ۵۱)

اچھا افسانہ — عام فہم مکالمے — رنگین گانے
بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ کی خصوصیات ہیں شامل ہیں
تازہ شاہکار
بندھن
اداکاران خصوصی
لیلا چٹنس
اور
اشوک کمار
۱۰ اگست سے شروع
راکسی ٹاکیز میں

تمام ہندوستان میں کامیابی کیساتھ چل رہا ہے
بمبئی میں، بارھواں ہفتہ
ناگپور، تیسرا ہفتہ
احمد آباد، پانچواں ہفتہ
مدراس پانچواں ہفتہ
شولاپور، چوتھا ہفتہ
دہلی پانچواں ہفتہ
باریا، چوتھا ہفتہ
حیدرآباد پانچواں ہفتہ
اندور، تیسرا ہفتہ
NATIONAL STUDIOS
عورت :- ماں۔ بہن۔ بہو۔ بیوی۔ ساس
زندگی ان پانچ لباسوں میں، خدا کی شاندار تخلیق
نیشنل اسٹوڈیو کا زندگی بھر افلم!
ڈائرکٹر۔ محبوب
عورت
اداکاران خصوصی :-
سردار اختر۔ سریندر۔ یعقوب
جیوتی۔ ہریش۔ کنہیا لال
عورت کے گانے ہز ماسٹر وائس کا ریکارڈ
سنئے ! برسات رانی۔ وتسلابائی کھمبکر
پاٹھے سینما
(لیمنگٹن روڈ بمبئی)
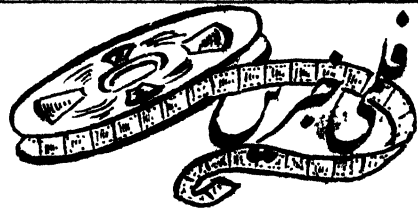
پربھات فلم کمپنی مسٹر شانتارام "پڑوسی" کو بڑے زور شور سے طیار کر رہے ہیں۔ اور فتح لال بھی "رام شاستری" کی تیاری میں مصروف ہیں۔ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ مسٹر شانتارام "عمر خیام" فلم تیار کرینگے۔

نیشنل سٹوڈیوز ڈائرکٹر محبوب کی "عورت" بڑے زور و شور سے پاتھے سینما میں چل رہی ہے۔ اس نے ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اسٹوڈیو میں ڈائرکٹر کاردار "پوجا" کی طیاری کر رہے ہیں۔

نو ینگ چترپٹ کی سوشل کامیڈی "لیڈر" نیو ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں بڑی کامیابی سے چل رہی ہے۔

بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ کا "بندھن" جسمیں اشوک کمار اور لیلا چٹنس کام کرتے ہیں عنقریب نمائش کے لئے راکسی سینما میں پیش کیا جائیگا۔ اسکے ڈائرکٹر مسٹر اچاریہ ہیں۔ سٹوڈیو میں "آزادی" فلم طیار ہوگی جسمیں دیوکا رانی کام کرینگی۔

رنجیت موویٹون: — "پاگل" امپیریل سینما میں بہت شان و شوکت سے چل رہا ہے پرتھوی راج کی اداکاری کی بہت تعریف ہو رہی ہے۔

رائل اوپیرا ہاؤس میں "مسافر" عنقریب پیش کیا جائیگا۔ "مسافر" کے ڈائرکٹر چتربھج دوشی ہیں۔ سٹوڈیو میں "دیوالی" اور "امید" بھی طیار ہو رہی ہیں۔

پرکاش پکچرز: — نرسی بھگت قریب قریب طیار ہے اسمیں درگا کھوٹے اور وشنوپنت پگنس کام کرتے ہیں۔ "رومیو جولیٹ" "راکھی" بنانے کے لئے منتخب ہوگئی ہیں۔ ایک اور فلم "ملا" بھی طیار ہو رہی ہے۔

پبلسٹی کا کام پبلسٹی کے مشہور و معروف ماہر مسٹر طیفی کر رہے ہیں۔

واڈیا موویٹون کا "وجے کمار" بہت کامیاب رہا۔ تین اگست سے لنگٹن ٹاکیز میں "ڈائمنڈ کوئین" چل رہی ہے۔ اسمیں "ناڈیا" کام کرتی ہیں۔ سٹوڈیو میں "راج نرتکی" کی شوٹنگ ہندی۔ بنگالی اور انگریزی میں جاری ہے۔ اس میں سادھنا بوس اور پرتھوی راج کام کرتے ہیں۔

گلگتہ فلم ایکسچینج کرشنا ٹاکیز میں "آندھی" بہت زور و شور سے چل رہی ہے۔ اس کے بعد نیو تھیٹرز کی "ہار جیت" پیش کی جائیگی۔

منروا موویٹون کا "بھروسہ" بالکل طیار ہے اسے منروا ٹاکیز میں نمائش کے لیے پیش کیا جائیگا۔ "بھروسہ" کے ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی ہیں۔

رنجیت کا زبردست کامیڈی ڈراما

ڈائرکٹر — چترنبھج دوشی

مسافر

اداکار

چارلی

خورشید

وسنتی

ایشور لال

عنقریب آرہا ہے

رائل اوپیرا ہاؤس (چوپاٹی) بمبئی

TANVIR Bombay

اگست ۱۹۴۷ء

تنویر بمبئی

آپ کے بچّوں کیلئے بہترین دودھ ہی اچھا دودھ ہے

پرانا طریقہ

معمولی دودھ بیمار اور کمزور گوؤں کا ہوتا ہے اسلیئے آپکے بچے کو زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

دودھ نکالنے کا پرانا طریقہ بڑا خراب اور گندا ہے اس سے اکثر جرمز پیدا ہوجاتے ہیں

معمولی دودھ غیر صاف برتنوں میں گرد و غبار میں کھلا پڑا رہتا ہے جو بچوں کیلئے بڑا خطرناک ہے۔

گلیکسو کا طریقہ

گلیکسو جیسا اچھا اور کوئی دودھ نہیں

آپکے چھوٹے بچے کی صحت اور طاقت دودھ پر منحصر ہے۔ اس لئے بہترین دودھ ہی اس کے لئے اچھی چیز ہے۔ اور دودھ کی بہترین غذا گلیکسو ہے دنیا میں تمام عقلمند مائیں گلیکسو سے ہی اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہیں کیونکہ گلیکسو خالص اور بہترین قسم کے دودھ پاؤڈر کی شکل میں اسطرح بنایا جاتا ہے کہ اسکی تمام خوبیاں موجود رہتی ہیں گلیکسو بچوں کو مضبوط اور طاقتور بناتا ہے یہاں تک کہ کمزور سے کمزور بچوں کو بھی ہضم ہوجاتا ہے۔ اگر آپ اپنے بچوں کی پرورش گلیکسو سے شروع کرینگے تو اچھا دودھ نہ ملنے کی پریشانیوں سے بچ جائیں گے اور ان کے حق میں بہت اچھا کرینگے۔ جب بھی آپ گلیکسو خریدیں اس بات کا یقین رکھیں کہ آپ کو ہر مرتبہ بالکل تازہ چیز ملیگی۔ بچوں کے لئے گلیکسو آدرش غذا ہے۔ ذرا بھی ضائع نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ جسقدر ضرورت ہوتا ہی آپ استعمال کرسکتے ہیں آئندہ جب آپ اپنے بچہ کے لئے غذا خریدیں تو گلیکسو طلب کریں۔

گلیکسو

گلیکسو بہترین چراگاہوں میں چرنیوالی اور انعام حاصل کرنیوالی گوؤں کے دودھ سے اعلیٰ انتظام کے ماتحت تیار کیا جاتا ہے

گلیکسو کی گوؤں کا دودھ ملکنگ مشینری سے نکالا جاتا ہے تاکہ جرمز سے مبرا اور خالص رہے۔

گلیکسو دوران تیاری میں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا اور سو فیصدی غذائیت سے پر ہر مشکل سیلڈ ڈبوں میں آتا ہے

ہندوستان میں کافی سٹاک موجود ہے اسلیئے سٹنڈرڈ قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

بچوں کی آدرش غذا ہے

Cover P nted at the Lakshmı Art Prıntıng Works Sankli Street Byculla Bombay 8

TANVIIR
MONTHLY
BOMBAY, No 8
JUNE
1940.
مدیرہ :-
''سحر''

THE RESTLESS ARTIST

MAY HIS SOUL REST IN ETERNAL PEACE !

فہرست مضامین ماہ جون سنہ ۱۹۴۰ع

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سائکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا۔

عقلمند مائیں ہمیشہ گلیکسو خریدتی ہیں

جو کہ بچوں کو مضبوط بناتا ہے، محفوظ اور خوش رکھتا ہے

گلیکسو کا طریقہ

گلیکسو ان گایوں کے دودھ سے تیار ہوتا ہے جنکی نگرانی کیجاتی ہے اور قابل انعام ہیں اور جو بہترین چراگاہوں میں پلتی ہیں

گلیکسو کی گائیں بذریعہ مشین دوہی جاتی ہیں تاکہ دودھ میں جراثیم نہ شامل ہوں اور دودھ بالکل صاف ہے

گلیکسو کو تیاری کے دوران میں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔ آپ اسے چاروں طرف سے مہر شدہ ڈبوں میں خرید کر محفوظ پائینگے

گلیکسو میں تازہ دودھ کی تمام ضروری خصوصیات موجود ہیں۔ اور ہر ڈبہ مکمل طور پر خالص ہونے کی گارنٹی ہے۔ گلیکسو نہ صرف محفوظ ہے جبکہ گائے اور بھینس کا دودھ مشکوک ہوتا ہے بلکہ اسمیں مزید فوائد بھی ہیں۔ گلیکسو سہولیت کیلئے پوڈر کی صورت میں ہے اور خاص طور پر بچوں کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ گلیکسو بچوں کو مضبوط اور خوبصورت بناتا ہے۔ انکو صحت مند اور خوش رکھتا ہے۔ ان کے جسم، ہڈیوں اور پٹھوں کو مضبوط بنا دیتا ہے اور لطیف سے لطیف معدہ کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔ تمام دنیا بھر میں مائیں اپنے بچوں کو گلیکسو پر پرورش کررہی ہیں جو کہ محفوظ ترین اور بہترین بچوں کی دودھ کی غذا ہے۔ آپ کے بچے کو بہترین دودھ کی ضرورت ہے اور بہترین دودھ گلیکسو ہے۔ اپنے آپکو تمام آئندہ کی پریشانیوں سے بچائیے اور اپنے بچوں کو گلیکسو جو کہ بہترین بچوں کی غذا ہے استعمال کراکے اس کی صحت کی حفاظت کیجئے۔

قدیم طریقہ

معمولی دودھ عموماً کمزور اور بیمار گایوں سے حاصل کیا جاتا ہے اسلئے یہ آپ کے بچے کو بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے

دودھ دوہنے کا معمولی طریقہ جو زمانہ قدیم کا ہے نہایت گندہ اور خطرناک ہے۔ جس کی وجہ سے دودھ میں جراثیم شامل ہوجاتے ہیں

معمولی دودھ گندے برتنوں میں رکھا جاتا ہے اور گرد و غبار میں پڑا رہتا ہے اسلئے یہ بچوں کیلئے خطرناک اور غیر محفوظ ہے۔

ہندوستان میں کافی سے زیادہ اسٹاک موجود ہے اسلئے اسٹنڈرڈ قیمتوں میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

بچوں کیلئے بہترین دودھ کی غذا

از پیغامبر حیات جناب قیصر امراوتی

جوانی غنیمت ہے اے نوجوانو جوانی میں ہر کام ہو جائیگا
نہ کل اسکو پائیگی پشتِ خمیدہ۔ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

بڑی پُرخطر راہ حسنِ عمل ہے۔ مگر ایسی راہوں کا رہبر ہے عشق — مصیبت میں پڑ کر چمک جسکی ہوتی ہے دونی جوانو وہ جوہر ہے عشق
مگر شرط یہ ہے کہ پُرجوش سینہ دفینہ رہے عشق کے راز کا — محبت کے نغموں سے معمور ہو دل مگر جیسے پردہ کسی ساز کا
کسی کے تصور میں باتیں ہوں دل سے بدل جائے دنیا ہمیں غم نہیں — زبانِ محبت میں یہ خود کلامی جو پوچھو تو الہام سے کم نہیں

جوانی کی راتیں۔ امنگوں کے دن ہیں۔ ابھی جوش ہے سرد ہو جائیگا
نہ کل اسکو پائیگی پشتِ خمیدہ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

جوانی کا زیور جوانی کا جوہر۔ جوانی کی گمراہ سرشاریاں — جوانی کی آنیں۔ جوانی کی تانیں۔ جنونِ محبت کی خودداریاں
کبھی بت پرستی میں اخلاص کامل کبھی مستِ مینا و صدانیت — کبھی رقص عریاں سزاوار ہے تو کبھی باعثِ ہیں نظمِ عمرانیت
لبوں پر تبسم نگاہوں میں بجلی جبیں صاف رفتار میں بانکپن — جوانی میں کانٹے ہیں پھولوں کا بستر جوانی کا ہے کھیل دار و رسن

کٹھن کام ہے عاشقی نوجوانو۔ جوانی میں آسان ہو جائیگا
نہ کل اس کو پائیگی پشتِ خمیدہ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

جنونِ جوانی ہے بدنام لیکن یہ دیوانگی نام کر جائیگی — جہاں ہوشیاری سپر ڈال دیگی وہاں بس یہی کام کر جائیگی
اگر سر میں سودا ہے۔ دلمیں تڑپ ہے تو بگڑے ہوئے کام بن جائینگے — مخالف جو آنکھیں دکھاتے کھڑے ہیں جو بڑھ جاؤگے تو یہ آپ ہٹ جائینگے

اگر دل قوی ہے تو تعمیر کر لو نئی رہگذر فکر اوہام کیا | دکھانیکو آتے ہیں پیا ہیں تو آئیں وگرنہ تمہیں خضر سے کام کیا

بڑھو نوجوانو۔ بڑھو نوجوانو جو قسمت میں ہونا ہے ہو جائیگا
نہ کل اس کو پائیگی پشت خمیدہ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

زمانے کے الزام سے ڈرنے والو زمانے کے الزام کا ذکر کیا | پرانے زمانے کا حربہ پرانا جواں ہمتیں ہیں تمہیں فکر کیا
رہیگا کہاں خوف داروں رسن کا اگر دل صداقت سے معمور ہے | رہ شوق میں سر ہتیلی پہ رکھے وہی نوجواں رشک منصور ہے
مبارک مبارک مبارک وہ ہستی جو چشم عدو کیلئے خار ہو | اسے دیکھکر مسکرادو ہمیشہ جو تم سے کہے قابل دار ہو

اگر صاف دل ہے تمہارا تو تم سے زمانے کا دل صاف ہو جائیگا
نہ کل اسکو پائیگی پشت خمیدہ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

جہاں بے مروت۔ فلک کینہ پرور یہاں کون راحت کا رہزن نہیں | مگر بدگماں ہو نہ آئین فطرت سے یہ اہل ہمت کا دشمن نہیں
ہمیشہ سر بزم موج طرب میں چمکتے دمکتے مہکتے ہوئے | مگر انکی وادی میں گھنگھور بادل کڑکتے گرجتے برستے ہوئے
اگر اسپ ہمت کو مہمیز ہوگی تو قسمت کا پانسہ پلٹ جائیگا | سلامت رہے ذوق تیغ آزمائی حریفوں سے میدان پٹ جائیگا

لہو بہے زخموں سے اے نوجوانو۔ گناہوں کے داغوں کو دھو جائیگا
نہ کل اسکو پائیگی پشت خمیدہ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

یہ آندھی کا طوفان یہ موجوں کے ریلے جو ہمکو ڈراتے ہیں گھٹ جائینگے | بڑھاؤ گے کشتی تو کائی کی صورت یہ سب ظاہری خوف چھٹ جائینگے
اگر بازوؤں میں ہے کس بل تمہارے تو دریا کا رخ ہی پلٹ جائیگا | بھنور میں اگر ناؤ آتی ہے اپنی تو کچھ حوصلہ ہی نکل جائیگا
مری قوم کی ناؤ کو کھینے والو۔ ذرا استقامت سے تم کام لو | وہ آندھی چلی اٹھ کھڑے ہو۔ اٹھاؤ وہ اٹھاؤ اٹھا بادباں تھام لو

جواں ہمتیں ہیں تو تھک کر سمندر بھی کشتی کے سایہ میں سو جائیگا
نہ کل اسکو پائیگی پشت خمیدہ۔ اگر آج یہ وقت کھو جائیگا

قیصر

لمعات
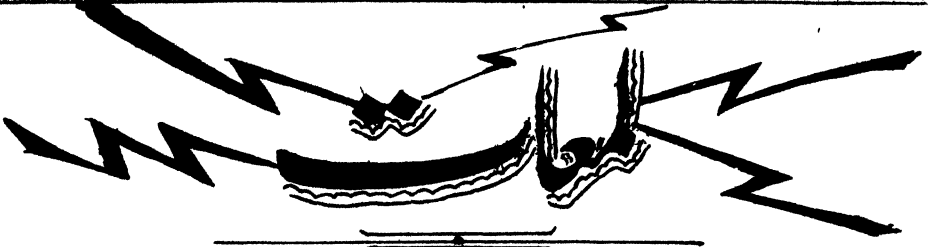
خاکساروں کو ایک مخلصانہ مشورہ

ملک کی سیاسی حالت اسلئے ابتر ہے کہ ہم لوگوں کی اخلاقی اور دماغی حالت پست ہے۔ چنانچہ اس پُرآشوب زمانے نے آکر ہمیں اپنی طاقتوں اور اہلیتوں کا بخوبی اندازہ کرادیا ہے، ہمیں اس پر افسوس یا مایوسی کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر قوم کی زندگی میں ایسے وقت آیا ہی کرتے ہیں۔ جبکہ وہ بالکل یتیم کی مانند ہو۔ رہبروں سے خالی ہو۔ حالات کسی کے قابو میں نہ آتے ہوں۔ لیکن ہم جو کچھ کرسکتے ہیں اُس سے باز نہ رہنا چاہیئے۔ اور ہمت ہار کر نہ بیٹھ جانا چاہیئے۔

خاصکر اُن انجمنوں کو جنہوں نے ملکی اور قومی خدمات کیلئے اپنے آپکو وقف کر رکھا ہو۔ ان انجمنوں کو چاہیئے کہ اپنا راستہ بدلیں۔ صرف قواعد پریڈ کرلینے سے قومی اور ملکی تعمیر میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہوسکے گی۔ انہیں چاہیئے کہ باقاعدہ اپنے ہموطنوں کی اصلاحی خدمات انجام دیں۔ ہندوستانی نوجوانوں بچّوں اور بوڑھوں عورتوں مردوں سب کی اصلاح پر کمر باندھیں۔ والنٹیروں کے گروہ باری باری گلیوں محلوں میں گشت لگایا کریں۔ مصیبت زدوں کی مدد کریں۔ لوگوں کو آپس میں لڑنے بھڑنے سے روکیں۔ کسی کو گالیاں بکتے دیکھیں تو اسے سمجھائیں اگر نہ سمجھے تو سختی سے روکیں۔ ایسی صورت میں نقصان نہ پہنچانے والا تشدد اصلاح کیخاطر جائز ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں غلاظت پھیلانے اور تھوکنے سے روکیں۔ صفائی کا سبق پڑھائیں۔ چھوٹے بچوں کو سگریٹ بیڑی پینے سے روکیں۔ گندے میلے خوانچہ والوں سے چیزیں نہ لینے دیں۔ تعلیم وحفظان صحت کے اصولوں سے لوگوں کو آگاہ کریں۔

ہمارے ملک میں نوجوانوں کی بے پناہ طاقتوں کو مخالفین نے دو بڑی بڑی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ "ترغیبات جنسی" اور "بیروزگاری" ان دو پھندوں سے نوجوانوں کو نکالنے کی تدبیریں سوچیں۔ ہر ملک کی زندگی اور ترقی کا انحصار اس ملک کے نوجوانوں پر ہوتا ہے۔ ملک وقوم کی ڈوبتی نیّا کا کھوّیا نوجوان طبقہ ہی ہوتا ہے۔ مگر ہندوستان کے نوجوان تو خود گرداب فنا میں غوطے کھارہے ہیں۔ وطن کا بیڑا کون پار کریگا۔ نوجوان طبقہ کی اس بدحالی کا ذمہ دار کون ہے؟ ماں باپ، اسکول کالج، بے روزگاری یا انکی غلط روی۔ بہرحال سب سے بڑی ذمہ داری گورنمنٹ پر عاید ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جن گھروں میں وہ پیدا ہوتے ہیں۔ گھر میں ماں سے غلامی اور کندخیالی، باپ سے مردہ دلی اور پست ہمتی کا اثر لیتے ہیں بہت سے بچوں کو تو اکثر ۶ — ۷ برس کی عمر میں ہی محنت مزدوری کرنا پڑتی ہے۔ ذرا پنپنے نہیں پاتے کہ انکی شادیاں کرکے اُنپر مزید ذمہ داری کا بوجھ ڈالدیا جاتا ہے۔ جو

خوشحال گھرانوں کے ہوتے ہیں وہ اسکول کالجوں کی ایسی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں جہاں انہیں سچے معنوں میں غلام بنایا جاتا ہے۔ ان کی روحیں کچلدی جاتی ہیں۔ جسم کمزور کرنیئے جاتے ہیں۔ اخلاق اور ضروریات زندگی کی طرف دھیان کم دیاجاتا ہے۔ صرف ایک پالیسی اور پروگرام کے ماتحت انہیں چند کتابوں کا کیڑا بنا دیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسکول کالجوں سے نکلکر متوسط طبقہ کے نوجوان یا تو کلرکی یا نوکری کو ہی مقصد زندگی قرار دیتے ہیں۔

اور امیر نوجوان لہو لعب اور عیش پرستی کا شکار بنجاتے ہیں۔ کیونکہ اس ملک کی فضا میں "جنسی جذبات"، اور "شکم پروری" کی دو لہریں پوری طاقت اور کوشش سے دوڑائی گئی ہیں۔ لٹریچر کو دیکھو، سینما اور تھیٹر کو دیکھو، ریڈیو اور رسم ورواج دیکھو سب میں انہیں دو جذبوں کی نشر و اشاعت پائی جائیگی۔ چنانچہ پیٹ بھرنا، شادی بیاہ کرنا۔ یا پھر یہاں کے نوجوان طبقہ کی اصلاح میں۔ رومانس۔ یہی دو بڑے مسئلے مانے جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان وباؤں سے یہاں کے نوجوانوں کو مخلصی دلائی جائے۔ اور انکو زندگی کے صحیح راستہ پر ڈالا جائے۔ کاش خاکسار آرگنزیشن اس معاملے میں مفید خدمات انجام دے۔

بی بی سی اردو براڈ کاسٹ

کچھہ مدت سے ہم بی بی سی سے ہر روز شام کو ہندوستانی میں خبریں اور تنقید وغیرہ سنتے ہیں۔ ایک دن بی بی سی کے ہندوستانی اناؤنسر نے نہایت ادنیٰ پیرایہ میں جرمنی کے ڈکٹیٹر کا مذاق اڑاتے ہوئے خود برٹش وقار کو صدمہ پہنچایا۔

ہٹلر غلط ہو یا صحیح ہمیں اس وقت اس بحث سے غرض نہیں۔ مگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ برطانیہ کے پروپاگنڈا کے اوپر دنیا چھچھورے پن کا الزام عائد کرے جبکہ انگریز آداب و اخلاق اور نہایت مہذب گفتگو کیلئے کسی قوم سے کم نہیں ہیں اس بات سے بھی ہمیں رنج ہوتا ہے کہ ہماری ہندستانی زبان اپنے آپکو اس قدر نیچے گرائے کہ اعلیٰ ذوق کے انسان ان باتوں کو سنتے ہوئے اپنے سر شرم سے جھکالیں۔ جنگ کی خبریں اور جنگ کے متعلق تمام پروپاگنڈا نہایت سنجیدہ پیرایہ میں ہونا چاہیئے۔ جس سے دنیا اچھا اثر لے۔ اور جنگ جیتنے میں ہمارا ممد معاون بنے۔ نہ یہ کہ ہٹلر کو گا گا کر لوریاں سنانے اور اسے چمکار و پچکار کر سلانے یعنی انا کی خدمات بی بی سی اپنے ذمے لے۔

انڈیا ہفتہ وار لاہور

ہندوستان کی اردو صحافت کو جس نازک دور کا سامنا کرنا پڑرہا ہے وہ سب پر روشن ہے اور اسی وجہ سے یہانکی اردو صحافت کو وہ بلند معیار اور اعلیٰ مرتبہ حاصل نہیں ہے جو اسے حاصل ہونا چاہیئے۔ غلامی اور اسکے لوازمات نے ہندوستانیوں کی ہر اس چیز کی کمر توڑ رکھی ہے جو دوسرے ملکوں میں زندگی اور ترقی کی راہ میں ممد و معاون ہوا کرتی ہیں۔ یہانکا مذہب بے جان۔ شباب خمیدہ کمر۔ شجاعت بوسیدہ معاشرت متعفن تعلیم ناقص۔ محبت و اخوت ناپید۔ اور ان سب کی آبیاری کرنیوالی صحافت بسسکتی ہوئی۔ رحم طلب آنکھوں سے، مردوں سے زندگی کی بھیک مانگتی ہوئی خوشامد پرست نہ انداز میں کیڑے مکوڑوں کے پیچھے رینگنے کی عادی ہے۔ ایسی تاریک بھیانک فضا میں جب کوئی اخبار یا رسالہ عام سطح سے بلند ہوکر ملکی خدمت کا عزم کرکے عالم وجود میں آتا ہے اور مدت گزرجانے پر بھی اپنے عزائم پر سختی کیساتھ قائم رہتا ہے تو ہر اصلاح پسند اور ہمدرد وطن کو لازمی طور پر مسرت ہوتی ہے۔ انڈیا لاہور کے مالک اور ایڈیٹر مسٹر ساقی ان نوجوانوں میں سے ہیں جو سچے معنوں میں انسانیت کے حامی محب وطن آزاد خیال روشن طبع ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں "انڈیا" ملک کیلئے مفید اور ملکی صحافت کیلئے قابل فخر ثابت ہوگا۔ ابتک اس کی جتنی اشاعتیں ہماری نظر سے گزری ہیں قابل تعریف ہیں۔ مضامین نظم و نثر۔ افسانے۔ شذرات سب میں زندگی ترقی رفعت اور اصلاح کی لہر دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور یہی چیز اخبار کی جان ہو۔ اصلاح پسند پبلک کا فرض ہے کہ وہ ایسے ترقی پسند بلند پایہ اخبار اور رسائل کی قدر کرنا سیکھیں کہ یہی انکی نجات کا باعث ہوسکتے۔ کاغذ اچھا لکھائی چھپائی عمدہ سرورق جاذب نظر اور تصاویر سے مزین ہے۔ قیمت فی پرچہ ار سالانہ چندہ للعصر ملنے کا پتہ :۔ دفتر انڈیا ہفتہ وار میکلوڈ روڈ لاہور۔

مساواتِ انسانی

از حضرت امام اکبر آبادی

اس دنیا میں مذہب کی بنیاد قائدین عظام نے اخلاقی و روحانی اصول پر قائم کی تھی۔ اور اس میں شک نہیں کہ ہر بانیٔ مذہب کی تحریک ابتدا میں، یعنی ان کی حیات تک، اور اس کے بعد بھی کچھ مدت تک نہایت قوی، زود اثر، اور دلنشین ثابت ہوئی، اور یہ اسلئے کہ ہر تحریک خلوص و ایثار پر مبنی تھی، اور سب کا مرکز ایک ہی تھا، البتہ راستے جدا جدا تھے۔ ان راستوں میں انسانیت کا سبق دیا جاتا تھا۔ اور یہ سبق ایمان و عقیدت کی روشنی کے تحت تھا۔ انکا اٹھنا بیٹھنا، کھانا، پینا، اور سونا جاگنا سب میں عزم و ارادہ اور عقیدت کا اثر نمایاں تھا۔ یہانتک کہ جنگ بھی اسی عقیدت کے تحت کیجاتی تھی۔ اور اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا سے ظلم و عدوان اور طوفان فساد مٹا کر مصیبت زدہ انسان کو آلام و مصائب سے نجات دلائی جائے۔

اس میں بھی شک نہیں کہ بانیان مذاہب کی نیتیں نیک اور ارادے پاک تھے۔ اور یہ چاہتے تھے، بلکہ انمیں سے ہر ایک کی دلی منشاء یہ تھی کہ ساری دنیا کے لوگ ہمارے جھنڈے تلے آکر ایک سبق پڑھیں ایک گیت گائیں، اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آئیں۔ امن و چین سے رہنا سیکھیں، اور درندگی و خونخواری رہزنی و بدکاری کو ٹھکرا دیں۔

اور اس میں بھی شک نہیں کہ ان کے دل و دماغ روشن و مجلّا تھے، ان کی نگاہوں میں نور ایمان تھا۔ یہ انسانی فطرت کے نباض تھے، ان سے بڑھکر نہ آجتک کوئی حکیم ہوا، اور نہ کوئی فلسفی۔ یہ عالم باعمل تھے۔ اور صداقت و خلوص کے مجسمے تھے۔ انکا شعور کامل تھا۔ یہ تحت الشعور اور ماورائے تحت الشعور سے واقف تھے، اور طبیعیات و ماورائے طبیعات سے آگاہ تھے۔ ان کی ریاضت و محنت، انکا کشف و مجاہدۂ نفس قوی تھا، اور یہ نفسیات کے لتنے بڑے ماہر تھے کہ اکثر لوگ انکو جادوگر سے تشبیہہ دیتے تھے لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ انہوں نے انسان کو کبھی بدی کیطرف رجوع کیا ہو۔

مگر نہیں معلوم کہ انکا دیا ہوا سبق فطرت کے خلاف تھا؟ یا فطرت سے جنگ کے مترادف تھا؟ کہ بعد کے لوگوں نے وہ سب کچھ بھلا دیا جو انہیں پڑھایا تھا۔ خود غرضی، خودنمائی،

اور خود پسندی غالب آگئی، اور انسانیت کو فراموش کردیا۔ تیقن کی جگہ توہم پرستی نے لے لی۔ اور روشنی کی جگہ ظلمت نے۔ نوبت بانیجا رسید کہ مختلف طریقوں، مختلف ذریعوں، اور مختلف حیلوں کے تحت نقد عزت و شرف کی دوکانیں آراستہ کرکے پیتل کو سونا اور سونے کو پیتل بتایا۔ صداقت کو وہم، اور وہم کو صداقت سمجھا اور سمجھایا، روشنی کو ظلمت اور ظلمت کو روشنی تصور کیا۔ اور کذب و افترا کے ساتھ مذاہب پر یہ بہتان عظیم لگایا کہ وہ تو سب کے سب دھوکہ، جہالت، اور توہم پرستی کی باتیں سکھاتے ہیں اور اس لئے آج کے "روشن خیال" "اپٹوڈیٹ" انسان کو اس کی پیروی و تقلید کرنا باعث ننگ ہے۔ بڑے بڑے روشن خیال نفس مذہب کو غلط سمجھنے لگے۔ اور اس کے معنی توہم پرستی سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

میرے خیال میں مذہب ایک نوع کی سوسائٹی کا نام ہے۔ اور اس کا مقصد بدی سے روکنا اور نیکی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ جس طرح آج جمہوریت، اشتراکیت اور قومیت کے نام سے جماعتیں قائم کرکے انسانی خون کے دریا بہائے جارہے ہیں۔ اسی طرح گذشتہ زمانہ میں مختلف مذہب یعنی مختلف سوسائٹیاں قائم کرکے آدمی کو انسانیت کا سبق دیا جاتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس آسمان کے نیچے مذہب کے نام پر بھی خون بہایا گیا ہے، اور مذہب ہی کے نام پر رہزنی و غارت گری کرکے انسانی شرافت کو بٹہ لگایا گیا ہے۔ لیکن اس نوع کے افعال کسی بانی مذہب سے سرزد نہیں ہوئے، بلکہ یہ تمام حرکات شنیعہ بعد کے لوگوں سے سرزد ہوئیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مذہب کے نام پر پادریوں، مولویوں، اور پنڈتوں نے انسانوں کو خوب گمراہ کیا۔ اور دل کھولکر خون کے چشمے بہرے تاہم بعد کے نائبین مذاہب نے غلط پروپیگنڈا کرکے انسانوں کا اتنا خون کبھی نہیں بہایا، جتنا کہ گذشتہ جنگ عظیم اور موجودہ جنگ کے ذریعہ آجکے "روشن خیال" گروہ بہارہے ہیں اور جتنا کہ مستقبل قریب میں بہانے کا امکان نظر آرہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ پادریوں، مولویوں اور پنڈتوں نے مذہب کو دل کھولکر بدنام کیا ہے۔ یہ دقیانوسی گروہ انسانوں کیلئے ہمیشہ تباہی و بربادی کا باعث ہوا ہے۔ لیکن دنیا کا عمل آج اسی "مقدس" گروہ کی تعلیم پر ہے یعنی سنگ و خشت اور ناقوس اذان پر انسانوں کو ہلاک کرکے اسکو مذہب کا نعل بتانا کس گروہ کا کام ہے؟ اس شیطانی حرکات کو نجات کا ذریعہ بتانا کس کی تعلیم ہے؟ بانیان مذہب نے تو یہ تعلیم کبھی نہیں دی۔ البتہ بعد کے حریص لوگوں کی یہ تعلیم ہے۔ مذہب تو اس کو عذاب کے نام سے پکارتا ہے، اور سوسائٹی اسے ظلم و بہیمیت کے نام سے یاد کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مذہب کا نام آتے ہی آجکے "روشن خیال" آدمی کی آنکھوں کے روبرو ایک جہالت کا مجسمہ آجاتا ہے۔ اور سیاست کا نام آتے ہی لیڈری یا صاحبیت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے روشن خیال اور اپٹوڈیٹ حضرات کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ مغرب و مشرق میں اور خصوصاً ہندوستان اور یورپ میں آج جو کچھ ہورہا ہے وہ مذہب کی تعلیم نہیں ہے۔ بلکہ مذہب کا نام لیکر شیطان کا کام لیا جارہا ہے۔ توہم پرستی، بت پرستی اور شخصیت پرستی کا سبق کبھی کسی مذہب نے نہیں دیا۔ کذب بیانی و باطل اندیشی، دغابازی و فریب کاری کیطرف بھی کسی مذہب نے رجوع نہیں کیا۔ پھر مذہب کو کیوں بدنام کیا جاتا ہے؟

صرف اسلئے کہ وہ طمع و حرص، اور ہوائے نفس سے روکتا ہے، وہ ظلم و عدوان اور سرکشی سے روکتا ہے۔ وہ افلاس زدہ گروہ کی امداد کرکے تمول کے تعیش سے روکتا ہے۔ اور وہ اس سے بھی روکتا ہے کہ آزادی کیساتھ انسانی خون کے دریا بہائے جائیں۔ ان تمام باتوں سے آزادی حاصل کرنے کیلئے مذہب کی زنجیر کو توڑا جا رہا ہے، اور آزادی کی جگہ آوارگی اختیار کیجا رہی ہے۔ ہماری جنگ صرف اسلئے ہے کہ ہم جس نام سے خدا کو پکارتے ہیں، دوسرا اسی نام سے کیوں نہیں پکارتا، ہماری عبادت کا جو طریقہ ہے وہی طریقہ دوسرا کیوں نہیں اختیار کرتا۔ ہمارا اختلاف و افتراق اس بنا پر ہے کہ ہماری پرستشگاہیں علحدہ علحدہ صورت کی ہیں۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ خدا نہ تو کعبہ میں رہتا ہے نہ بتکدے میں، نہ وہ مسجد میں رہتا ہے، نہ مندر میں، اور نہ گرجے میں۔ نہ تو انسان کے دلمیں اور دل کی گہرائیوں میں رہتا ہے، وہ کائنات میں اور کائنات کے ذرّے ذرّے میں جاری و ساری ہے۔ وہ ان ذروں میں بھی رہتا ہے جو نہ تو آنکھ سے دکھائی دیتے ہیں اور نہ خوردبین سے۔ وہ روشنی ہے جو محیط کل ہو، درحقیقت وہ سب سے عظیم ہے۔ وہ دائمی سکون و اطمینان ہے، وہ تقدس محض ہے، وہ قدرت کاملہ اور مطلقہ ہے، وہ محبت ہے اور صرف محبت۔ وہ سماجی اخوت کو سب سے بڑی عبادت سمجھتا ہے۔ اسکے نزدیک ساری دنیا ایک خاندان ہے اور مثل ایک گھر کے ہے۔

حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ صلعم نے اور حضرت کرشن، رام، لچھمن اور مہاتما بدھ نے بھی یہی تعلیم دی ہے اسکے سوا کچھ نہیں کہا ہے کہ آدم کی اولاد ایک باپ سے ہے، اور انسانی حیثیت کے تحت سب برابر ہیں، الا وہ جس کے اعمال بہتر ہیں۔

پس موجودہ و آئندہ نسلوں کو چاہیئے کہ وہ نسلی امتیاز کو ہٹا کر، ہندو مسلم تعصب آمیز خیالات کو دور کرکے، خونخواری اور درندگی کو چھوڑ کر، سماجی اخوت، اور سماجی قوت کو بڑھائیں اور ہندوستان کے وسیع ملک کو ایک گھر اور اس کے رہنے والوں کو ایک خاندان سمجھکر بھائی بھائی کا سا عمل کرکے دنیا کو دعوت دیں کہ ہم اور تم، کالا اور گورا سب ایک ہے کہ

"بنی آدم اعضائے یکدیگر اند"

حیرت و تعجب ہے کہ چالیس کروڑ انسان ایک متعفن لاشہ کی حیثیت میں پڑے ہیں۔ یہاں کا بڑے سے بڑا انسان بھی مساوات کی خوبیوں اور برکتوں سے نا آشنا ہے تنگ خیالی و تاریکی اس قدر چھا گئی ہے کہ کسی وعظ و پند کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ یہ زمانہ روشنی و آزادی کا زمانہ کہلاتا ہے جمہوریت کا ہر طرف زور ہے، غریب طبقوں کو ہلا ہلا کر جگایا جا رہا ہے۔ مزدوروں کے نام پر انقلاب برپا کیا جا رہا ہے، اور بظاہر مفلسوں کی انتہائی ہمدردی کیجا رہی ہے یعنی امیر و غریب کو ایک ہی سطح پر لا کر کھڑا کیا جا رہا ہے لیکن نفس مساوات سے بیخبری کا وہی عالم ہے، جو آج سے پہلے تھا۔

چالیس کروڑ میں سے شاید چالیس آدمی اکثبا میں مساوی الرائے ہوں، باقی تمام کے تمام باوجود غلام ہونیکے اس قدر مغرور و سرکش ہیں کہ انسان کو انسان نہیں سمجھتے، بلکہ

کچھ اور سمجھتے ہیں - حالانکہ جس آب و گل سے ایک مغرور کی تعمیر ہوئی ہے، اسی سے ایک مسکین کی۔ جو خون ایک سرکش و باغی کے جسم میں دوڑ رہا ہے، وہی خون ایک بیکس و خادم کے جسم میں بھی رواں ہے۔ جسم کے جتنے اعضاء ایک شریف کے پاس ہیں، اتنے ہی ایک ذلیل کے پاس بھی۔ لیکن نام نہاد اشراف شرف باطل کی دوکانیں آراستہ کئے بیٹھے ہیں، اور مدعی ہیں کہ ہم اشرف الانسان ہیں، حالانکہ ان کے عمل ایک سفیہہ و دنی سے کم نہیں۔ یہ چالیس کروڑ انسان اگر نفس مساوات کو سمجھکر متحد ہو جائیں تو دنیا میں کوئی نہیں جو انکی طرف آنکھ اٹھاکر بھی دیکھ سکے۔

رُباعیات

ازجناب شاد عارفی صاحب
رام پور

"تلخابۂ نفس" و "لذتِ روحانی"
مائل ہو جدھر بھی فطرتِ انسانی
اربابِ دول کی ناز برداری سے
بہتر ہے "خودی کی بے سروسامانی"

سب کام میں وطن میں بنی عیب ہمارے
بیچیں وطن بیست ہمت ہمارے
بیچے وطن پیشِ نسیتی ہے
کس طرح وہ انجمن پیش ہمارے
"قانون" جس انجمن کی گردن مارے

ہر تھپیڑے پہ مسکرانا بہتر
زندگانی سے ہاتھ اٹھانا بہتر
جس کنارے میں جذبِ محکومی
اُس کنارے سے ڈوب جانا بہتر

اعتماد و عمل کی بربادی ہے
کششِ نامراد۔فریادی ہے
ہم اور احساسِ پستی و محرومی
قید خانے میں فکرِ آزادی ہے

ملک صیاد سے جو واقف ہوتے
دولتِ "اتحاد" ہی کیوں کھوتے
ہے ہمارے نفاق کی یہ مثال
جیسے پنجرے میں لڑ رہے ہوں "توتے"

چھٹا شاندار ہفتہ!
رنجیت کی شاندار پیش کش
مغربی اور مشرقی تہذیب کا بہترین موازنہ
آج کا ہندوستان
ادا کار:۔
پرتھوی راج۔ روز۔ ایشور لال۔ ستارہ۔ چارلی
رائل اوپیرا ہاؤس
اوقات روزانہ:۔ ۳½۔ ۶½۔ ۹ بجے

یادگار لمحہ (افسانہ)

از جناب مائل ملیح آبادی

وہ ایک لمحہ مجھے ہمیشہ یاد رہیگا۔

یہ ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ ایک مرد کی مصیبت اور ایک عورت کی ہمدردی کی ــــ کہانی یا کچھہ اور؟ ــــ کون جانے۔

مَیں لکھنؤ سے کلکتہ جارہا تھا۔ گاڑی بھری ہوئی تھی، خلافِ معمول بہت ہی زیادہ۔ مَیں تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں داخل ہوُا۔ چمڑے کا ایک چھوٹا بکس، ایک کمبل اور "شعلۂ وشبنم" کی ایک جلد ــــ یہ تھا میرا کل اثاثہ۔ ڈبے میں کہیں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کچھہ لوگ لیٹے ہوئے تھے اور کچھہ اپنے بڑے بڑے بستر بنچوں پر رکھے ہوئے اطمینان سے باتیں کررہے تھے۔ میں کھڑکی ہی کے پاس کھڑا ہوگیا اور پورے ڈبے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ جگہ کہیں بھی خالی نہ تھی۔ میرے دل میں غصہ تھا، ان لوگوں کیلئے جو آرام سے لیٹے تھے۔ یا بستر بنچوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں انسانی ہمدردی کا نام تک نہ تھا۔

پھر میری نظر خود بخود قریب کے بنچ پر جاکر تھم گئی۔ ایک عورت اور ایک چھہ سالہ بچے پر۔ عورت خاموش بیٹھی تھی اور بچہ شریفے کھانے میں مشغول تھا۔ میں نے اور عورت نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ کچھہ جھجک سی گئی۔ اور فوراً ہی لڑکے کو اٹھا کر گود میں بٹھالیا۔ اس نے جگہ کی تھی، شاید میرے لئے ــــ مَیں سمجھا اور خالی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا۔ سامان اوپر رکھ دیا اور شعلۂ وشبنم دیکھنے لگا ــــ مَیں نے عورت کا شکریہ نہیں ادا کیا، اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

پھر بچے نے شریفے کے چھلکے کتاب پر گرا دئے اور عورت نے اسے جھڑکا۔ بچے نے رونی صورت بنائی اور مینے کتاب پر چھلکے ہٹاتے ہوئے اس سے کہا "کھاؤ"۔ بچہ پھر کھانے لگا۔ اور ساتھہ ہی اپنی ماں کے چہرے کو فتحمندانہ نظروں سے دیکھا بھی۔ ماں مسکرادی ــ ماں یا کوئی اور؟ خدا جانے۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر ٹھہری اور مینے تھوڑے سے کیلے اور سنگترے خریدے۔ گاڑی چل پڑی اور بچہ نے ماں کا مُنہ دیکھکر کہا "کیلا" ساتھہ ہی مینے کنکھیوں سے عورت کی طرف دیکھا وہ اشارے سے بچے کو منع کررہی تھی۔

مینے ایک سنگترہ اور دو کیلے بچے کی طرف بڑھادئے اور بچہ نے ماں کا مُنہ دیکھا ــــ "لے لو میاں" مینے بچے سے کہا۔ عورت نے بھی لے لینے کا اشارہ کیا ــــ قدرے بے دلی کیساتھہ۔ ــــ ساتھہ ہی ہمنے ایک دوسرے کو دیکھا بھی ــــ ایک لمحہ یا

اس سے بھی کم وقفہ میں ــــ وہ مجموعی حیثیت سے خوبصورت تھی۔ اور خوبصورتی سے زیادہ اس میں ایک طرح کی کشش تھی۔ مقناطیست ــــ آنکھیں بڑی اور اُبھری ہوئی تھیں جن پر لانبی لانبی کالی پلکوں کا سایہ تھا۔ ناک کھڑی تھی قدرے چمکدار، رخسار اُبھرے ہوئے تھے اور سب سے زیادہ دلکش تھا اس کا دہانہ ــــ کسی توجیہ سے بے نیاز۔ کانوں میں دو چوکور بُندے جھلا رہے تھے اور گلے میں سنہرا نکلس تھا۔

ہمنے ایک دوسرے کو دیکھا ــــ میں کچھ جھجکا۔ وہ کچھ لجائی، شرمائی، سمٹی اور باہر دیکھنے لگی۔ میرا دل اس کی طرف جُھکا ــــ احترام اور عقیدت کیساتھ۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں اس کو ہمیشہ سے جانتا ہوں حالانکہ آج سے پہلے میں نے اسکو کبھی نہیں دیکھا تھا ــــ کبھی نہیں۔

سامنے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا ــــ کسی گاؤں کا باشندہ کھدر کی جوخانی ٹوپی، سفید کرتا اور سفید لنگی، یہ تھی اسکی پوشاک ٹوپی کے کنارے تیل اور پسینے سے کالے ہوگئے تھے، کرتا جگہ جگہ سے مسکا ہوا تھا اور میلا ہوکر مٹیالا سا ہوگیا تھا۔ لنگی بھی میلی اور بدبودار تھی۔ وہ باتیں کر رہا تھا، مسلسل، ایک ہی سانس میں۔ گاؤں کی کانگریس کمیٹی کے جھگڑے اس کی گفتگو کا موضوع تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر چند مسلم نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ــــ "اسلامی ہمدردی، سوادِ اعظم، جماعت اور دردِ ملت" کے الفاظ ان کی زبانوں پر گردش کر رہے تھے۔ حالانکہ یہ نوجوان اسلامی ہمدردی کا مظاہرہ ابھی ابھی کر چکے تھے۔ وہ کافی جگہ گھیرے ہوئے تھے اور اگر چاہتے تو جب میں ڈبے میں کھڑا ہوا تھا تو مجھے جگہ دے سکتے تھے۔ لیکن .....

ڈبے کے کونے پر دو سادھو گنگنا رہے تھے "یہ گاڑی جانے والی ہے" قسم کا کوئی گیت۔ ڈبے کی مجموعی فضا کچھ ایسی ہی تھی۔

ایک جگہ گاڑی نے کچھ جھوک لیا اور بچے کے پیچھے ہاتھ میرے گھٹنے پر ٹیک گئے۔ عورت نے بچہ کو زور سے مارا۔ اور بچہ بلبلا کر رونے لگا۔ کانگرسی نے زور سے "ہونہہ" کہا مسلم نوجوان ایک دوسرے کو دیکھکر مسکرائے۔ میں ادھر ایک لمحہ کیلئے خاموش ہوگئے۔ میں جلدی جلدی کتاب کے صفحے اُلٹنے لگا۔ ــــ اور پھر دوسرے ہی لمحے کانگرسی چلا چلا کر بولنے لگا مسلم نوجوان اپنی گفتگو میں مشغول ہوگئے اور سادھو گنگنانے لگے۔ "یہ گاڑی جانے والی ہے"

بچہ اسی طرح رو رہا تھا، عورت رہ رہ کر اس کو جھڑک رہی تھی۔

"چپ ہوجاؤ تو یہ تصویر لے" کہکر میں نے بچہ کو کانن بالا کی تصویر دکھائی جو خدا جانے کتاب میں کہاں سے آ گئی تھی۔

بچہ خاموش ہوگیا اور حسرت بھری نگاہوں سے تصویر دیکھنے لگا ــــ "لو، مگر اب رونا نہیں" کہکر میں نے تصویر بچہ کے ہاتھ میں دیدی۔ عورت نے بھی تصویر کو غور سے دیکھا ــــ پھر اس کی نظر میرے چہرے کو دیکھتی ہوئی باہر کی فضا میں گم ہوگئیں۔ اور سادھو نے اپنے گانے کو ذرا اٹھایا ــــــــ

"یہ گاڑی جانے والی ہے" ــــ مسافر ــ یہ گاڑی جانیوالی ہے۔

سورج غروب ہو رہا تھا، شفق کی رنگینی نے ڈبے کو بھی رنگین بنا دیا تھا، باہر دور تک گیہوں کے ہرے ہرے کھیت جھومتے لہلہاتے چلے گئے تھے۔ پٹری کے کنارے کنارے چرواہے اپنے جانوروں کو گاؤں کی طرف ہنکائے لئے جا رہے تھے اور دور ندی کے اس پار ایک بیل گاڑی لڑکھڑاتی ہوئی سی

چلی جا رہی تھی، ڈبے میں صرف ایک ہی آواز گونج رہی تھی۔
—— "یہ گاڑی جانے والی ہے"

فیض آباد اسٹیشن پر عورت نے لوٹے میں پانی لیا اور تھوڑے سے پان خریدے۔ ڈبے سے کچھ آدمی اتر گئے اور کچھ نئے سوار ہوگئے۔ موقع اچھا تھا میں نے لیٹنے کا انتظام بھی کر لیا۔ گاڑی روانہ ہوگئی اور عورت نے اپنے سامان میں سے کچھ پوریاں تھوڑی مٹھائی اور تھوڑا سا حلوا نکال کر پلیٹ میں رکھا ساتھ ہی بچہ نے اپنی معصوم اور توتلی زبان سے کہا "کھانا کھائیے"

"بسم اللہ کیجئے" میں نے بچہ کو جواب دیا۔ میں اس جواب کیلئے پہلے سے تیار بھی تھا۔ جواب بچہ کو دیا تھا یا کسی اور کو، یہ میں کہہ نہیں سکتا۔ پھر میں نے دیکھا کہ لانبی لانبی حسین انگلیوں نے چاندی کی ڈبیا سے پان نکال کر دیا اور آہستہ سے اس سے کچھ کہا بھی .... لیکن دوسرے ہی لمحہ اس نے بچہ سے پان لے بھی لیا۔ قدرے کانپتی ہوئی انگلیوں سے۔

میری بغل کا مسافر یک بیک میری طرف متوجہ ہوا۔ "جناب کھانا حاضر ہے" اس نے پوریاں اور کباب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور مجھے فوراً ہی "بسم اللہ کیجئے" کہنا تھا۔

"تکلف کاہے کا؟" اس نے کہا۔ "تناول فرمائیے نا!"

"ابھی میرے کھانے کا وقت نہیں آیا ہے" میں نے کہا۔ "میں نو بجے سے پہلے کھانا نہیں کھاتا ہوں" مسافر خاموش ہوگیا اور اس کی موٹی موٹی انگلیاں بڑے بڑے نوالے توڑنے لگیں۔ عورت نے ہماری باتیں غور سے سنیں اور بچے کو پانی پلانے لگی۔

میں نے سر کھڑکی پر رکھ دیا، ہوا میں خنکی تھی، میری آنکھ لگ گئی مغلسرائے پہنچکر آنکھ کھلی۔ باہر نکل کر نل پر منہ دھویا اور کھانے کیلئے کچھ مٹھائی بھی خریدی —— لیکن ——؟ میں گھبرا گیا۔ میرا بکس اور کمبل جو غائب تھا۔

"آپ نے دیکھا ہے؟" میں نے گھبرا کر قریب کے مسافر سے سوال کیا۔ وہ اونگھ رہا تھا۔ چونک کر بولا —— "کیا؟"

"میرا بکس اور کمبل؟" میں نے کہا۔

"کہاں رکھا تھا آپ نے؟" اس نے پوچھا

"یہیں اوپر" میں نے جواب دیا۔

"دیکھئے نا وہیں ہوگا۔" اس نے لاپرواہی سے کہا اور پھر کھڑکی پر سر ٹیک دیا۔ اس کو پرواہ ہی کیا تھی۔ سب لوگ میری طرف متوجہ ہوگئے۔

"وہ سوٹ والا آدمی ادھر سے کچھ اتار رہا تھا" کانگریسی نے اپنے ساتھی سے کہا۔

"کہئے آپ بے فکر ہوکر سو کیوں گئے تھے" نوجوان مسلمانوں نے آپس میں سرگوشی کی۔

"ست ہے نام رام کا" ایک سادھو نے ڈکار لے کر کہا۔ اور میں نے مٹھائی واپس کرتے ہوئے خوانچے والے سے ... معذرت کی۔ "بھائی معاف کرنا میرا بکس چوری ہوگیا پیسے بھی اسی میں تھے"

"کوئی بات نہیں بابو صاحب" کہکر خوانچے والے نے مٹھائی خوانچے میں رکھی۔ "تازی برفی" کی کرخت آواز آئی۔ اور خوانچے والا آگے بڑھ گیا —— اور پھر میری نظریں عورت کی طرف گئیں۔ اس کا ہاتھ جیب تک جاکر ٹھہر گیا تھا۔ نگاہیں خوانچے والے کا پیچھا کر رہی تھیں اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اور نہ کہہ سکتی ہو۔ میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا اور کتاب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں میرے اوپر آکر تھم گئیں —— مریم اور شفیق آنکھیں۔ الا آنکھوں میں

ہمدردی تھی، محبت تھی، افسوس تھا، بیچینی تھی۔

گاڑی نے سیٹی بجائی، پلیٹ فارم پر سے چائے گرم، تانبے سنترے، خستہ بسکٹ کی آوازیں آئیں اور ایک شخص تیزی سے ہمارے ڈبے کے پاس سے گزرا ——— اس کی جیب میں پیسے کھنک رہے تھے۔

گاڑی آگے بڑھی، دو کانپتے ہوئے ہاتھ بچّے کو چادر اڑھانے لگے۔ اور کونے پر سادھو نے گانا شروع کیا ———

——— یہ گاڑی جانے والی ہے"

مجھے نیند نہیں آئی، بھوک بھی تھی اور افسوس بھی۔ عورت بھی دوسری طرف منہ کئے بیٹھی تھی شاید سنجیدہ۔ اور مطمئن۔

ٹکٹ چیکر کو ڈبے میں آتے دیکھکر میری بدحواسی اور بھی بڑھ گئی۔ میرا ٹکٹ تو بکس ہی میں تھا۔ اس نے ٹکٹ چیک کئے اور سب کے کہنے سننے سے بمشکل یہ باور کرنے پر آمادہ ہوا کہ واقعی میرا بکس اور ٹکٹ چوری ہو گئے ہیں ——— کسی اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری اور ٹکٹ چیکر یہ کہتا ہوا اتر گیا کہ "اچھا معاملہ ہے عورت کا ٹکٹ رہ گیا اور مرد کا غائب ہو گیا"!

عورت اور مرد کون؟ ——— ایکبار پھر ہم دونوں نے ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور ٹھٹک گئے ——— اس کی آنکھیں ہمدردی تھیں اور شرمائی ہوئی بھی۔

صبح، ابھی ابھی سورج کی پہلی کرن پھوٹی تھی کہ گاڑی پٹنہ جنکشن پر جا ٹھہری۔ مجھے بھوک تھی کافی سے زیادہ بھوک۔ مینے عورت کی طرف دیکھا۔ بچہ اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا بغل میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی سی رکھی ہوئی تھی اور وہ بغل میں

کوئی چیز باندھ رہی تھی ——— مینے ایکبار پھر اس پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ اس میں نسوانیت تھی۔ محبت تھی، خلوص تھا اور ان سب باتوں سے زیادہ جو چیز تھی وہ اس کا "ماں پن" تھا۔

وہ ایک "ماں" تھی ——— شاید!

گاڑی نے سیٹی بجائی اور اس نے جلدی جلدی بچّہ کو کھڑا کیا۔ لوٹا بچے کے ہاتھ میں دیا۔ ایک ہاتھ سے گٹھری سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے ——— کانپتے اور تھرتھراتے ہاتھ سے رومال میری طرف بڑھایا، وہ خاموش تھی، بالکل خاموش آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں، ہونٹ کچھ کہہ رہے تھے اور کانپتا ہوا ہاتھ کچھ کہہ رہا تھا ——— میری آنکھیں کچھ سن رہی تھیں ہونٹ کچھ سن رہے تھے اور بڑھا ہوا ہاتھ کچھ سن رہا تھا۔

رومال میرے ہاتھ میں دیکر وہ گاڑی سے اتر گئی۔

گاڑی چل پڑی۔ مینے رومال کھول کر دیکھا اس میں پانچ روپے بندھے ہوئے تھے۔

گاڑی آگے بڑھ رہی تھی۔ مینے جھانک کر دیکھا بجلی کے لیمپ کی روشنی میں وہ بچّے کی انگلی پکڑے ہوئے جاتی نظر آئی اور پھر ایک موڑ پر پہنچ کر غائب ہو گئی۔

گاڑی طوفان اور آندھی کی طرح چلی جا رہی تھی میری نظریں عورت کو اسٹیشن پر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ سادھو گا رہا تھا ——— "یہ گاڑی جانے والی ہے ——— مسافر ——— یہ گاڑی جانے والی ہے" ——— اور ...... اور پانچ روپے میری ہتیلی پر رکھے ہوئے تھے

(فقط)

مفلس کا خطاب اپنے خدا سے

از جناب مجروح سلطانپوری

اے تری نظر کرم بزم سلاطیں کی مکیں
ظالموں کے واسطے پھیلی ہوئی تیری زمیں
تو غریبوں کا خدا، ہرگز نہیں ہرگز نہیں
تو نہیں اپنا تو یہ دیوار یہ در کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

ہر نفس آوازۂ غمناکیٔ انجام ہے
دیکھتا یہ ہوں کہ جیسی صبح ویسی شام ہے
مفلسی تیرے جہاں میں بدترین الزام ہے
موت کو پھر زیست کا نغمہ سنا کر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

میرا مذہب تنگدستی میرا ایماں بے بسی
میرا نغمہ بے نوائی میری فطرت بے حسی
میرا دل یکسر تحمل میری دنیا بے کسی
تلملا کر کیا کروں میں مسکرا کر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

کون ہے اپنا یہاں خاموشیٔ محفل میں دیکھ
اب یہ کشتی ہے کہاں محرومیٔ ساحل میں دیکھ
میری ناکامی کا عالم وعدۂ مشکل میں دیکھ
اک نگاہ لطف بے مینا و ساغر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

ہر طرف بیوہ کی آہیں ہو رہی ہیں شعلہ بار
اب یہاں سنتا نہیں کوئی یتیموں کی پکار
اور انہیں کے خون سے رنگینیٔ سرمایہ دار
اسپہ تیری خامشی کا حسن منظر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

بندگی سرمایۂ نادار ہو سکتی نہیں
بے زری اب زیست کا معیار ہو سکتی نہیں
یوسفی رونق دہِ بازار ہو سکتی نہیں
پھر یہاں اک ہستی بیکار بنکر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

ان پسینوں سے رُوئے فطرت پہ رنگ زندگی
میرے نور باصرہ کے قمقموں میں روشنی
میرے خشک اعضا کی جسمیں جذب ساری تازگی
میں اُسی گلزار میں آنسو بہا کر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

مل رہے ہیں کچھ شرارے مفلسی کی خاک میں
بجلیاں سی دوڑتی ہیں اب رگ خاشاک میں
اب تو ہمت آ چکی ہے دیدۂ بیباک میں
پھر نہیں سنتا تو میں تجھکو بُلا کر کیا کروں
کیا کروں آخر تری دنیا میں رہکر کیا کروں

دل کی دھڑکن نظر کی بیتابی
اُف یہ شام و سحر کی بیتابی

جان کھنچتی ہے جانبِ منزل
دیکھ! شوقِ سفر کی بیتابی

توڑ ڈالا صدف کے سینے کو
کام آئی گُہر کی بیتابی

عارضی اضطراب شوق نہیں
ہے یہ آٹھوں پہر کی بیتابی

درد دل چھپ سکا نہ محفل میں
کہہ گئی سب نظر کی بیتابی

الاماں! موسم بہار و قفس
طائر بال و پر کی بیتابی

یہ مناظر، یہ شام اور یہ باغ
پھر کسی منتظر کی بیتابی

وہ "سکون حیات" کے ساماں
وہ قضا و قدر کی بیتابی

ہو گئے حسن و عشق ایک ادیب
کچھ اِدھر، کچھ اُدھر کی بیتابی

کسان کا خواب

از جناب سلام مچھلی شہری

پلاٹ لانگ فیلو کی ایک نظم سے لیا گیا ہے

کتنی پریشان نیند - کتنا درد بھرا خواب !!
ہرے بھرے کھیت کے کنارے - ننگے بدن - بکھرے بال - ہاتھ میں ہنسیا ـــــ نیم خوابی کے عالم میں ، ایک کسان جسے بے درد زمینداروں نے گاؤں سے نکال دیا ہے سو رہا ہے - وہ خواب دیکھ رہا ہے ـــ اپنا پیارا گاؤں.

~~~~~~

یہ تو گنگا ندی ہے ، وہی جو اس کے گاؤں میں بہتی ہے ہرے بھرے میدانوں کے کنارے وہ بہتی ہوئی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے . کسان اس میدان میں کس شان سے ٹہل رہا ہے ـــ جیسے آزادی کا راجا - وہ دیہاتی عورتوں کے گیت جو وہ بسنت رُت کی خوشی میں گا رہی ہیں کس محبت سے سُن رہا ہے ـــ !

~~~~~~

بھولے بھالے معصوم بچوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی خوبصورت بیوی کو وہ کن محبتوں سے دیکھ رہا ہے ـــ بچے اس کی انگلیاں پکڑتے ہیں . گلے میں ہاتھ ڈالتے ہیں. اور سینے کو چوم چوم کر کہتے ہیں " اب نہ جاؤ بابو !" ـــ وہ اپنے باپ کو گھیر لیتے ہیں ـــ آنسو - بس ایک آنسو! ـــ کسان سو رہا ہے ـــ خواب دیکھ رہا ہے !!

بہت تیزی سے گنگا ندی کے چٹیل میدانوں میں ، وہ ایک گھوڑے پر سنہری راس تھامے جا رہا ہے - تلواریں دونوں طرف لٹکی ہوئی ہیں - گھوڑا دوڑ رہا ہے -

یہ کیسی آواز سنائی پڑتی ہے ؟
اس کی تلواریں جنگ کے گیت گا رہی ہیں !
آزادی کی جنگ !!

~~~~~~

سرخ - زرد اور سبز رنگ کی تتلیاں ایک ساتھ اُڑ رہی ہیں - معلوم ہوتا ہے فضا میں آزادی کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہے !

کسان کتنا خوش ہے ـــ وہ جھنڈے کی سلامی کیلئے بیچھا کئے ہوئے ہے ـــ

. . . . ارے صبح ہو گئی ؟

نہیں یہ چاندنی رات ہے !
گنگا ندی ایک تلوار کی طرح دکھائی پڑتی ہے ـــ
ہائے اس کے جھونپڑے کی چھت بھی تو نظر آتی ہے !!

~~~~~~

لومڑی اور بھیڑیئے ، گنگا ندی کے کنارے جھاڑیوں میں شور کر رہے ہیں ، اور کسان کے گھوڑے کی ٹاپ لمبی لمبی۔

گھانسوں میں سُنائی پڑتی ہے ——— نہیں جنگی باجوں کی شاندار آواز! ٹھیک اسی وقت جبکہ کسان کا خواب اپنے پورے شباب پر ہے!!

〰〰〰

جنگل اپنی پتیوں کی بے شمار زبانوں سے چلا رہا ہے:
"آزادی - آزادی - آزادی!!!"
ہوا کے سخت جھونکے شور کر رہے ہیں۔ "آزادی۔ آزادی۔ آزادی!!!"
——— کسان چونک پڑا۔ اس کے ہونٹوں پر فضا کے یہ لاحاصل نعرے سنکر ایک افسردہ تبسم نمایاں ہے!!

〰〰〰

ظالم سپاہیوں کے کوڑوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ چنگاریوں ایسی سورج کی کرنیں اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گی ——— کیونکہ "موت" نے اُس کو خواب کی دنیا میں پہنچا دیا ہے ——— وہ دنیا جہاں وہ آزادی کے گیت خوش خوش سُنا سکے گا ——— ہاں،

اس کا مردہ جسم اب بھی پڑا ہوا ہے۔
روح غلامی کی نیند سے چھوٹ چکی ہے ———
زنجیریں ٹوٹ چکی ہیں!!!
اب وہ آزاد ہے۔

. . . .

اُف!
کتنی پریشان نیند ——— کتنا درد بھرا خواب!!

〰〰〰

دو غزلیں

از پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ایم اے

بانگِ جرس دھیما دھیما سا ۔ قافلہ کچھ ٹھہرا ٹھہرا سا
دردِ محبّت اٹھا اٹھا سا ۔ رنگِ محبت اُڑا اُڑا سا
وہ رُخِ تاباں چھپا چھپا سا ۔ دردِ نہاں چمکا چمکا سا
دل میں شاید درد ہے تیرا ۔ دبا دبا سا رُکا رُکا سا
بھولی بھولی سی تھی وہ صورت ۔ یاد کریں، تھا نام بھلا سا
ایک دل اور فسردہ فسردہ ۔ ایک چراغ اور بجھا بجھا سا
راہِ عشق میں دل کا مُسافر ۔ رُکا رُکا سا بڑھا بڑھا سا
آج نہ جانیں دیر سے کیوں ہے ۔ دل میں درد ہلکا ہلکا سا
اُف یہ خرامِ ناز کا عالم ۔ جامِ حسن چھلکا چھلکا سا
خوشبو کچھ پھیلی پھیلی سی ۔ رنگ بھی کچھ نکھرا نکھرا سا
عشق امرت ہو یا ہو ہلاہل ۔ ایک جہاں ہے پیاسا پیاسا
تھمی تھمی سی گردشِ دوراں ۔ وقتِ قیامت رُکا رُکا سا
دیر سے کیوں ہے دردِ محبت ۔ گھٹا گھٹا سا بڑھا بڑھا سا
اک مدت سے ہے دل کا پیالہ ۔ تہی تہی سا بھرا بھرا سا
بڑے ہی اسے جان سکے ہیں ۔ دیکھنے میں بھولا بھالا سا
کون ہے؟ کون ہے؟ سامنے میرے ۔ کچھ دیکھا کچھ ان دیکھا سا

دل اُمڈا سا آنکھ بھری سی
آج تو حسن بھی ہے اپنا سا

ہجر میں آٹھ پہر کا رونا
بات ذرا سی غم اتنا سا

دل کا دیار ہے اک مدت سے
کچھ آباد سا کچھ سونا سا

جب دیکھو اس کو ہے یہ عالم
کچھ سویا سا کچھ جاگا سا

تجھکو دل سے دل کو تجھ سے
ایک جھجک سی اک کھٹکا سا

کب سے دل تیرے کوچے میں
پھرتا ہے بھولا بھٹکا سا

کشتیٔ عشق بھی ہے بے لنگر
حسن بھی ہے چڑھتا دریا سا

عشق میں ایک عذاب سا دل پر
سر پر برکت کا سایا سا

دیکھ فراقؔ خوشی پھر اپنی!
اس میں ملا لے غم تھوڑا سا

۲

غصّے کی رَو آئی ہوئی سی
صاف جبیں تیورائی ہوئی سی

اُن اَمرت سے دھوئے لبوں پر
موجِ تبسم آئی ہوئی سی

بوجھل بوجھل حُسن کے شانے
پتلی کمر بل کھائی ہوئی سی

تری نگاہوں کی وہ لگاوٹ
جیسے کچھ یاد آئی ہوئی سی

چھڑا ہوا سا سازِ محبت
دل کی رگیں تھرائی ہوئی سی

اسکو جب دیکھو ہے یہ عالم
اک انگڑائی آئی ہوئی سی

دیر تک اس سے ملکر دل پر
ایک اُداسی چھائی ہوئی سی

ہجر میں پچھلے پہر کا عالم
تاروں کو نیند آئی ہوئی سی

بس ہے یہی رفتارِ قیامت
ٹھہری ہوئی سی آئی ہوئی سی

بس ہے یہی رفتارِ قیامت
ٹھہری ہوئی سی آئی ہوئی سی

دنیا کے آگے بڑھنے میں
جنت بھی ٹھکرائی ہوئی سی

اُمڈے دلوں کے قافلے نکلے
جیسے ندی لہرائی ہوئی سی

درد کی منزل سے گذری ہے
بادِ فنا کترائی ہوئی سی

آہ وہ باتیں آہ وہ صورت
بھولی ہوئی یاد آئی ہوئی سی

تیری محبت اک دنیا ہے
کھوئی ہوئی سی پائی ہوئی سی

عشق کی گتھی جانیں کب کی
سُلجھائی اُلجھائی ہوئی سی

گنبدِ مینا میں بھی تھرتھری
اور زمیں چکرائی ہوئی سی

ایک نگاہ قسم کھانے کو
اور وہ بھی گھبرائی ہوئی سی

شعلہ شعلہ شبنم شبنم
یاد گلوں کی آئی ہوئی سی

رگ رگ میں اک نیچ سی جیسے
دل کی آگ اکسائی ہوئی سی

دل تو فراقؔ سخی ہے تیرا
آنکھ مگر للچائی ہوئی سی

(بقیہ سمندر کنارے)

نورانی چہرے سے نقاب اٹھا — ادھر سمندر کے نفس کو قرار آیا — یہ نظارے میری نظروں سے گزرے ہیں کب؟ جبکہ میں سمندر کنارے ایک غریب ملاح تھا — صبح ہوئی اٹھے۔ نہ منہ دھونے کی فکر نہ ہاتھ دھونے کا خیال سب نے جال اٹھایا اور کنارے سے آگے بڑھ گئے کوئی مچھلی نہیں آئی — ان دنیا والوں کی طرح ہم نراش نہیں ہوئے نراش کب ہونے ہیں۔ یہ ہمیں معلوم ہی نہ تھا۔ ذرا اور آگے بڑھ گئے — پھر ہاتھ پانچ سیر کی مچھلی لگی پھر ساتھیوں میں سے ایک نے مانگی میں نے دیدی نہ تو تو، نہ میں میں — نہ حسد نہ بغض — دنیا والوں — اور سماج کے بڑے پیٹ والے سیٹھوں کی نظر میں ہم ذلیل پیشہ تھے۔ نیچ قوم تھے مگر ہماری نظروں میں ہماری زندگی کا وہ اوج تھا بلندی تھی۔ میری دنیا الگ تھی بالکل الگ۔ اس دنیا کا اس دنیا سے کوئی لگاؤ نہ تھا کوئی سمبندھ نہ تھا۔ کب؟ جبکہ میں سمندر کنارے تھا — میں نے کیوں کسی کا کہا مانا — میں نے کیوں اپنے آپکو مایا کے جال میں پھنسا کر سماج والوں کی آماجگاہ بنا — میں نے سمندر کی راہ چھوڑ ہی کیوں۔ کاش میں اپنی کشتی حیات کو سمندر کنارے ہی لگا رہنے دیتا۔ شاید کوئی لہر مجھکو بھی بہا کر لے جاتی۔ یا شاید بلکہ یقیناً اتنی کبھی مجھے اتنی شکستی دیتا کہ میں خود ہی اپنی کشتی کا ناخدا بن جاتا — م

م لیکن میرا اس میں کوئی دوش نہیں یہ تیری تقدیر تھی — میں اکثر اپنی بچپن کا ایک شعر گنگناتا ہوں — سمندر کنارے چین ہے بابا
کوئی نہ داں بے چین ہے بابا

گذشتہ سے پیوستہ

ازجناب عبدالباری صاحب عباسی ایم۔ اے (علیگ)

(۹)

۱۲ را پریل کو میری بچی پیدا ہوئی۔ وہ بھی ایک عجیب تجربہ تھا۔ لیکن میں جلد فارغ ہوگئی۔ میں ایک وسیع اور شاندار وارڈ میں تھی۔ وہاں کی نرس نے مجھے خوشخبری دی کہ تمہاری بچی پیدا ہوئی ہے۔ لیکن مجھے دیکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ یہی اقرارنامہ کی شرط تھی۔ مینے دیکھا کہ نرسیں بنڈل کی طرح چھوٹے چھوٹے بچوں کو نرسری کے کمرے سے لا رہی ہیں اور دودھ پلانے کیلئے ان کی ماؤں کو دیرہی ہیں۔ وارڈ کے دوسرے کنارے پر ایک لڑکی تھی اس نے بھی متبنیٰ دینے کے لئے فارم بھر دیا تھا۔ سارا دن وہ خاموش پڑی اوپر چھت کی طرف ٹکٹکی لگائے تھی۔ کبھی کبھی آہیں بھی بھرتی تھی۔ مینے اس سے بات کرنا چاہا۔ مینے کہا ہم لوگوں نے دوراندیشی سے کام لیا ہے۔ متبنیٰ ہونے والے بچے فوراً لے لئے جاتے تھے اور اچھے اچھے دولتمند لوگ لیجاتے تھے۔ واقعی ہم لوگ بہترین تحفہ ان کی نذر کررہے ہیں۔

جس دن پہلی مرتبہ مجھے بیٹھنے کی اجازت دی گئی تھی کمرہ میں ایک نئی نرس آئی ہوئی تھی۔ اس دن بہت خوشگوار موسم تھا۔ درخت پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ میں اپنے بدن میں ایک نئی تازگی اور خوشی کی لہر محسوس کر رہی تھی۔ نرس پہیئے دار کشتی کو ڈھکیلتے ہوئے کمرہ میں داخل ہوئی۔ آکر میرے پلنگ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ گفتگو سے پہلے ہی اس نے نیلے بنڈل کو میری گود میں دیدیا۔

مینے اُس کو بڑے تعجب سے دیکھا۔ گود میں چھوٹا بچہ لینے کا یہ میرا پہلا ہی اتفاق تھا۔ میری بچی لال نہیں بلکہ گلابی رنگ کی تھی۔ ایسے ہی دوسری لڑکیوں کے سرخ بچے میری نظر سے پہلے بھی گزر چکے تھے۔ اس کے سیاہ گھونگروالے بال تھے۔ بھوک کے مارے وہ اپنا چھوٹا سا منہ پھیلا رہی تھی۔ جو مجھکو بہت بھلا لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مٹھیاں ٹھوڑی سے لگی ہوئی تھیں۔ مینے اس کو گود میں دبا لیا۔ وہ اپنا چھوٹا سا سر دودھ پینے کیلئے میرے سینہ پر مارتی تھی۔ نرس جھپٹ کر واپس آئی اور بچی کو مجھ سے چھین لیا۔

"معاف کیجئے۔ غلطی ہوگئی"

مینے آہستہ سے کہا "یہ بچی تو میری ہی ہے"

اس نے معذرت کے ساتھ کہا "ہاں ہے تو۔ لیکن

مہربانی کرکے میری رپورٹ نہ کیجئے گا۔

میں نے تکیہ پر سہارا لگاکر کہا "نہیں! میں رپورٹ نہیں کروں گی"۔ میں رپورٹ اس کی کیا کرتی۔ وہ ایک نئی نرس تھی۔ اور اس کے پاس کام کی کثرت تھی۔ ہر انسان سے غلطی ہوتی ہے۔ اس وقت مجھ سے غلطی ہوجاتی۔ یوں میں اپنی اصلاح کرنے لگی۔

دوسرے ہفتہ میں مینے اسپتال چھوڑدیا۔ اور ایک اعلیٰ درجہ کے نرسنگ ہوم میں رہنے لگی۔ جو دریائے ہڈسن پر واقعہ تھا۔ وہاں کا ماحول نہایت عمدہ تھا۔ کمرہ بہت ہی پرتکلف۔ غسلخانہ بہت آرام دہ۔ اور کھانا بہت معقول ہوتا تھا۔ اسپتال کی چیخ و پکار کے بعد وہاں مجھے بہت سکون ملا۔

مینے خاندان والوں کو خیریت کا خط لکھدیا۔ پال کو جرمنی خط بھیجا۔ والدصاحب نے پریشان ہوکر تار دیا۔ پال کا بھی تار آیا مینے اس کو اپنی خیریت بذریعہ تار بھیجدی اور لکھا کہ شادی کیلئے بس تمہاری آمد کا انتظار ہے۔

اس طرح یہ قصہ ختم ہوگیا اور مجھے بھی اس سے نجات ملی۔ واقعی مینے بڑا جرم کیا تھا۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔ میرے گناہ کا نتیجہ وہ بچی تھی۔ لیکن مینے مطلق اس کا خیال نہیں کیا۔

دوسرے ہفتہ میں نے نرسنگ ہوم چھوڑدیا۔ ایک رات کو میں سو رہی تھی کہ دفعتاً چونک کر جاگ پڑی۔ مجھے اپنی گود میں کسی چیز کا احساس ہوا تھا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ سوتے وقت میرا بایاں ہاتھ سینہ کی طرف مڑا ہوا تھا۔ وہ سن ہوگیا تھا۔ جب اس میں خون کی روانی ہوئی پھر ٹھیک ہوگیا لیکن سوتے وقت وہ پھر ویسا ہی ہوجاتا تھا۔ کیونکہ مجھکو محسوس ہوتا تھا کہ کوئی چیز میرے سینہ سے چمٹی ہوئی ہے۔ مجھکو اس کی گرمی بھی محسوس ہوتی تھی۔ دوبارہ پھر میں چلاّ کر چونک پڑی۔ میرا ہاتھ برف کی مانند سرد ہوگیا تھا۔

بیشک یہ میری گھبراہٹ کا اثر تھا۔ ضروریات نے مجھکو کاموں میں مشغول کردیا۔ دوسری مرتبہ جب میں نیویارک میں کتاب شائع کرنے والوں سے ملنے آئی۔ اس وقت مجھکو محسوس ہوا کہ میری طبیعت گرتی جارہی ہے۔ اگرچہ میرا جسم توانا اور جلد نکھری ہوئی تھی۔ اگرچہ مجھکو نیند آتی ہوتی تو کوئی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن نیند ہی نہیں آتی تھی۔ میرے تصور میں وہی نقشہ تھا کہ میری گود میں کچھ ہے۔

۱۰

پال شروع جون میں آگیا۔ اور ہملوگوں نے شادی کرلی ہم آغوش ہوکر سونے کی میری بڑی خواہش رہتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ رات کو ڈراونے خواب نہ دیکھوں۔ لیونارڈ کیطرح پال میں محبت کا جوش تو نہیں تھا۔ مگر وہ ایسا شریک حیات تھا کہ جس پر میں ہرطرح کا بھروسہ کرسکتی تھی۔ ایک ہفتہ کے بعد وہی سن ہوجانے والی حالت پھر پیدا ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز سینہ سے لگی ہوئی ہے۔ مجھے اسکا دباؤ بھی اچھی طرح محسوس ہوتا تھا۔ میرے کانوں میں چھوٹے بچوں کے رونے کی آوازیں بھی آتی تھیں۔ جیسے کہ اسپتال میں آیا کرتی تھیں۔ مجھے خیال ہوتا تھا کہ شاید یہ میری بچی کی آواز ہے....

مینے سوچ لیا کہ خواب کے تصور کا ایک ہی علاج ہے۔

مینے پال سے کہا "میری تمنا ہے کہ کاش کوئی بچہ ہوتا؟" اس پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اس نے کہا "ہمارے بچہ ضرور ہوگا"۔ لیکن کوئی بچہ نہیں ہوا۔ ہم سب سے ملنے کیلئے مکان گئے۔

مینے کیسی کو دیکھا وہ بہت خوش و خرم اور تندرست ہے۔ لیکن اس کی آنکھوں سے کچھ تفکر اور پریشانی ظاہر ہوتی تھی۔ لیونارڈ کہیں باہر گیا ہوا تھا...... ہاں اکثر وہ گھر سے غائب رہتا تھا...... اس کے تبسم سے مستقل مزاجی ظاہر ہوتی تھی۔ مجھکو وہ کچھ معنی خیز معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے لئے ہوئے انداز میں لیونارڈ اور اپنے مستقل کیلئے صفائی پیش کرتی تھی۔

مشرق میں ایک بڑی کیمیائی کمپنی تھی۔ اس نے پال کو ایک اچھی ملازمت دیدی۔ ہم لوگ فلیڈ ملفیا میں رہنے لگے۔ مہینے گذر گئے۔ مجھکو نیند نہ آنے کی بیماری ہوگئی۔ اور کوئی حمل بھی قائم نہیں ہوا۔ نیند نہ آنے کی وجہ سے اکثر میں متفکر اور پریشان رہنے لگی۔ جب کبھی نیند آتی بھی تھی تو خواب میں اسپتال کا ہی منظر دکھائی دیتا تھا کہ نرسیں بچوں کو لا رہی ہیں لیکن مجھے کوئی بچہ نہیں دیا جاتا ہے۔

پال کا اصرار تھا کہ ماہرین نفسیات سے مشورہ کرنا چاہیئے لیکن میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں نے ایک دوسری کتاب لکھنا شروع کی۔ جس میں چھوٹے بچوں کا حال لکھا، جن کا نہ کوئی وارث ہوتا تھا اور نہ کوئی دعویدار۔

آخر کار میں نیویارک میں انجمن اطفال میں پھر گئی۔ وہاں کے شاندار کمرے میں بیٹھی اور وہاں کی قابل منتظمہ مس ولز سے باتیں کر رہی تھی۔ میں یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ بلا وجہ ذکر کر رہی ہوں۔ مینے کہا "میں اپنی بچی کے متعلق معلوم کرنا چاہتی ہوں"۔ اور یہ رقم معاوضہ بھی پیش کرنا چاہتی ہوں"۔ یہ کہکر اپنے بٹوہ سے پانچسو شلنگ کا چک نکال کر پیش کیا۔ اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ کہ میں یہ رقم نہیں لے سکتی۔ معذرت کے ساتھ کہا کہ تمہاری بچی دسویں ہی دن متبنیٰ کر لی گئی۔ تمنے بھی متبنیٰ دینے کیلئے اقرار کیا تھا ہم لوگ متبنیٰ بنانے والے والدین کا نام نہیں بتاتے ہیں۔

مینے پھر پوچھا "بچی اچھی تو ہے؟ پیدائش کے بعد سے صحیح سلامت رہی؟ کیا وہ لوگ اولاد سے مایوس ہو چکے ہیں"؟ "مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں تمہارے سوالات کا جواب نہیں دے سکتی ہوں"۔

ہماری شادی کو ابھی ایک ہی سال ہوا تھا کہ میرے سر کے بال سفید ہونے لگے۔ میں بہت پریشان رہتی تھی۔ لیکن پال میری غمگساری کرتا تھا۔ میں بچے کی بہت آرزومند تھی۔ مگر مجھے مایوس ہو جانا پڑتا تھا۔ وہ بھی مایوس تھا کہ اب کیا ہوگا! اور میں بھی یہی سوچتی تھی میرے دل میں کبھی اس کی محبت پیدا ہو جاتی تھی اور کبھی نفرت۔ صبر و تحمل تو میری زندگی میں مفقود تھا۔ مینے ہر قسم کی نیند لانے والی دوائیں استعمال کیں مگر بے سود۔ تین سال سے مجھکو مطلق نیند نہیں آتی تھی۔ پال کی منکسر مزاجی اور محبت سے میں بہت پریشان ہوتی تھی۔ وہ اپنے اوپر بھی نفرت کرتا تھا کہ ابتک کوئی بچہ نہیں ہوا۔ پریشانی اور غیر مستقل مزاجی کا اثر اس کے کاموں پر بھی پڑتا تھا۔

پال نے مجھکو مشورہ دیا کہ کسی بچے کو متبنیٰ کر لوں۔ لیکن میں نے یہ کہکر ٹال دیا کہ میری پسند کے مطابق کوئی بچہ نہیں ملیگا۔ اسی اثنا میں کیسی کا خط آیا کہ لیونارڈ نیو یارک میں ہے اگر پال یا تم موجود ہو تو والڈراف ہوٹل میں اس سے ملاقات کرلو۔ مینے اپنے دل میں کہا کہ لیونارڈ میری پریشانی کا حل ہے لیونارڈ سے دوسرا بچہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اور مجھے اس کا یقین ہوگیا۔ ہماری باہمی کشمکش بھی ایسی ہی تھی جو لوگوں کو مجبور کر دیتی ہے۔

میں نیویارک گئی۔ جب میں ہوٹل کو ٹیلیفون کر رہی تھی تو میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ ہوٹل والا بار بار پکار رہا تھا کہ "مسٹر ہال لیونارڈ! مسٹر ہال! میں انتظار کر رہی تھی کہ میں لیونارڈ کی آواز ٹیلیفون پر سنتی۔ یہ اس کی شیریں اور تیز آواز تھی۔ میں کچھ ہچکچائی۔ میں نے بار بار "ہلو۔ ہلو" کی آواز سنی پھر میں نے ٹیلیفون چھوڑ دیا۔ میں اپنے اوپر پچھتائی اور دل میں کہا افسوس! میں کسی کی بھی نہ ہوئی۔ میں نے ہال کیسی اور لیونارڈ سب سے بے انصافی کی۔"

میں ٹیلیفون کے کمرے کو چھوڑ کر سڑک پر آگئی۔ بغیر کسی سوچ بچار کے میں ایک گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی بان حکم کا منتظر تھا۔ میں نے اس کو انجمن اطفال کا پتہ دیا۔

اسی بے خودی کے عالم میں میں مس ولز کے دفتر میں پہنچی۔ اس نے خوشی خوشی استقبال کیا اور کہا "آج تمہارے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔"

میں نے پوچھا بچی کے متعلق کوئی خبر ہے؟ وہ بیمار تو نہیں ہے؟

"نہیں وہ بالکل اچھی ہے۔ میں تمکو بہت زیادہ امید دلانا نہیں چاہتی۔ لیکن متبنیٰ لینے والے والدین میں طلاق ہونے والی ہے۔ ایسی حالت میں وہ تمہاری بچی کو واپس کر دینگے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آپس میں صلح ہو جائے۔

میں نے آہ بھر کر کہا "کیوں، آپ صلح کیوں کراتی ہیں؟ طلاق ہو جانے دیجئے ......"

"ذرا صبر کرو! بچی تو نہیں کو والدین سمجھتی ہے پھوٹ سالا گھر خراب ہوتا ہے۔ اکثر بلا وجہ لوگوں میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ان میں صلح ہو جائے۔ اگر ان میں صلح نہ ہو سکی تو کیا تم اپنی بچی کو واپس لے لوگی؟"

میں فوراً بولی "ہاں ہاں میں اس کو ضرور لے لونگی"

"لیکن ذرا صبر کرو! اس میں کم از کم دو ایک مہینے لگیں گے۔ لیکن جب تک وہ چار برس کی نہ ہو جائے تم انتظار کرتی رہو۔"

میں نے وعدہ کیا کہ ہاں میں انتظار کرونگی "لیکن آپ کو اس وقت اطلاع کرنا پڑے گی"

"بیشک میں اطلاع کرونگی"

تین مہینے گذر گئے اور میں انتظار کرتی رہی۔

مس ولز نے مجھکو یقین دلایا کہ ان میں صلح کا امکان بہت کم ہے۔ مجھے امید تھی کہ شاید اگلے مہینے میں وہ اطلاع کرے۔ اسی عرصے میں مجھکو محسوس ہوا کہ میں حاملہ ہوں۔

شاید یہی میرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ میں نے چھوٹے سے چھوٹے گناہ کے لئے توبہ کر لی۔ امید کہ میرے گناہ معاف ہو جائیں:

(فقط)

رنگین دنیا

از محترمہ سعیدہ مظہر صاحبہ

پرے اوراک کی سرحد سے اک بستی بسائی تھی

شفق سے رنگ لیکر شام کو واں کی سنوارا تھا
ستاروں سے چمک لیکر وہاں زینت بڑھائی تھی

مہر سے روشنی لی واسطے دن کے سجانے کے
مہ کامل سے کامل ضوفشانی بھی چرائی تھی

حسیں آئینہ زا جھیلوں سے لائی خوشنمائی میں
شب مہتاب میں اکثر وہاں کشتی چلائی تھی

لب جو اک حسیں چھوٹی سی کٹیا میرا مسکن تھی
چھت اس کی خس کے خوشبو دار تنکوں سے بنائی تھی

صنوبر شاخیں تھامے تھیں میری کٹیا کی ننھی چھت
تو در کے واسطے میں شاخ صندل کاٹ لائی تھی

حنائی بال میں ننھی سی چڑیاں زمزمے کرتیں
وہاں میں تھی اور انکی محو کن نغمہ سرائی تھی

جدھر جاتی نظر "فردوس منظر" سامنے ہوتا
تردد، فکر و غم کا ذکر تک سننے نہ پائی تھی

گل لالہ نہ تھے بس سرخ مے کے سرخ پیالے تھے
چنبیلی، موتیا نے جنتی خوشبو اڑائی تھی

نہ تھی کچھ فکر فردا اور نہ دنیا سے غرض مجھکو
مسرت شادمانی بس مری دنیا پہ چھائی تھی

شباب و شعر کی رنگینیاں تھیں میری دنیا تھی
نہ دنیا کو ستایا تھا، نہ دنیا کی ستائی تھی

سویرے ایکدن اٹھکر چلی تھی جھیل کیجانب
ارادہ تھا کہ لوٹونگی ڈھلے دن گھر کی میں جانب

نہ جانے بات کیا تھی ہر طرف تھی ایک سنسانی
کہ گویا پڑ چکی تھی سرد سبکی روح تابانی

زمیں سے آسماں تک ایک بے کیفی سی چھائی تھی

گھٹائیں اس سے پہلے بھی تو اکثر آکے چھاتی تھیں
مگر اتنی اداسی تو نہ اپنے ساتھ لاتی تھیں

اداسی اور بیکیفی سے جب گھٹنے لگا ہے دم
ہوا احساس مجھکو کہ نہیں کوئی میرا ہمدم

میری آنکھوں میں آنسو تیر کر پلکوں پہ رقصاں تھے
یہی وہ میں تھی جسکے قہقہوں سے سب ہی شاداں تھے

تصور نے میری آنکھوں کے آگے سین وہ کھینچا
جواں اک شنی کھیتا جھیل پر اکدن جو آیا تھا

وہ جسنے منتیں کی تھیں یہاں اک روز رہنے کی   وہ جسکو مینے اکدن کی اجازت بھی نہیں دی تھی!!
وہ اس کی واپسیں نظریں مجھے اب یاد آتی ہیں   وہ یاد آتے ہی میرے دلکی دنیا کو ہلاتی ہیں!!
اسی احساس نے رنگین دنیا کو مٹا ڈالا!   میری تخئیلی دنیا کو تبہ برباد کر ڈالا!!

نہ وہ رنگینی باقی ہے نہ اب کچھہ لطف آتا ہے
فقط بے کیفیاں چھائی ہیں اور وہ یاد آتا ہے!

(خاص تنویر کیلئے)

سمندر کنارے

وجد چغتائی لشکر گوالیار

میری بھی کچھہ زندگی تھی ..... مَیں سانس آسانی اور اطمینان سے لے سکتا تھا ..... میرے دوست احباب مچھیرے تھے کب ــــ؟ جبکہ میرا جھونپڑا سمندر کے کنارے تھا۔
میں گھنگھور گھٹا سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا تھا۔ ..... زندگی کی لمحات عزیز اور خوشگوار معلوم ہوتے تھے۔ ـــ طلوع آفتاب کے مناظر میرے ہمنوا تھے اور شفق میری دمساز ـــ چاندنی میری ہم جلیس ـــ مَیں رات کے وقت آنکھہ مچولی کھیلتا تھا کب ـــ؟ جبکہ میں سمندر کنارے تھا

نہ یہ شب و روز کے غم تھے نہ فکریں ـــ مَیں ان سب سے آزاد تھا ـــ آشنان کو جی چاہا ماتا پتا نے منع کیا۔ ـــ دونوں کا کہنا مان لیا ـــ دل کا بھی ـــ اور والدین کا بھی ـــ اُچھلتا کودتا گیا ٹھنڈی اور نرم ریت پر دو چار لوٹیں لگائیں اور چلا آیا ـــ یہ تھی صحیح معنوں میں زندگی کب ـــ؟ جبکہ میں سمندر کنارے رہتا تھا۔

تبدیل آب و ہوا کیلئے بڑے بڑے شہروں سے کروڑپتی آئے تھے ـــ کبھی کبھی ہمیں ان سے کچھہ مل بھی جاتا تھا۔ جب چاندنی رات میں کبھی مَیں کسی امیر کو کشتی پر لیکر کنارے سے بہت دور نکلجاتا اور میرے بازو پتوار چلانے چلاتے تھک جاتے تو ـــ مجھے بڑا افسوس ہوتا تھا کیونکہ میری ساری محنت رائیگاں ہوجاتی۔ سمندر کی مغرور لہریں میری محنت کی سنہری کشتی کو پھر ساحل پر دھکیل دیتی تھیں ـــ یہ میرا پُر لطف اور عجیب مشغلہ تھا کب؟ جبکہ میں سمندر کنارے تھا۔

سب کی پاس پاس جھونپڑیاں تھیں ـــ موسم گرما کا زمانہ تھا اور پھر سب دوست ہم عمر تھے ـــ سوچا کہ کون جائے جھونپڑیوں میں ـــ کشتی کنارے پر باندھ دیا اور تاش کھیلتے کھیلتے نیند آگئی ـــ وہیں دراز ہوگئے۔ یہ تھے میرے زندگی کے مسکین لمحات کب ـــ جبکہ میں سمندر کنارے تھا۔ رات میں آنکھہ کھلی ـــ عجیب نظارہ دیکھا۔ چاند میں ایک لغزش سی تھی ـــ سمندر کے پاؤں صفحۂ ساحل سے اُکھڑے جارہے تھے ـــ وہ اس ناکام کوشش میں تھا کہ کسی کی موہنی صورت کے قربان ہوجائے ـــ سمندر نے ایک حشر بپا کر رکھا تھا ـــ چاند بھی پوری طور سے اسکی طرف جھکا جا رہا تھا۔ ادھر آفتاب نے اپنے

(باقی بر صفحہ ۴۲)

ثابت قدمی

از محترمہ کنیز فاطمہ بیگم صاحبہ (پٹنہ)

ثابت قدمی کیا ہے؟ یہ سوال کوئی اس شخص سے پوچھے جو دنیا میں اپنی زندگی بغیر اس کی مدد کے صرف دوسروں کے بھروسہ پر بیکار اور ناکام گذارتا ہے۔ کچھ اسی ناکام قسمت کا دل جانتا ہے۔ کہ ثابت قدمی اور استقلال کیا ہے اور کتنا ضروری ہے! مستقل مزاجی اور ثابت قدمی بذات خود پیغامبر کامیابی ہے۔ جس کے دل میں یہ جلوہ فگن ہے اس شخص کی تمام زندگی کامیابی کا ایک مرقع ہے۔ اگر یہ کسی پر اپنی نظر نہ ڈالے۔ تو دنیا کی تمام مصیبتیں تمام ناکامیاں اس کی قسمت کا ایک جزو بنجائیں۔

ہر شعبۂ زندگی میں کامیابی کی جان اسی مستقل مزاجی سے وابستہ ہے۔ اور زندگی کا مزہ" اس کا لطف کچھہ کامیابی ہی سے ملتا ہے۔ ناکام انسان کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وبال جان ہے۔ ثابت قدمی خدا کی ایک بڑی نعمت ہے۔ لیکن جو حضرات اس کی پروا نہیں کرتے اس کی اہمیت پر غور نہیں کرتے وہ اپنی زندگی نہایت مہمل اور تکلیف دہ گزارتے ہیں۔ چشم حقیقت سے دیکھنے والے بتا سکتے ہیں کہ ترقی کا راستہ یہی ہے۔ اور صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ کامیابی کی عبارت اسی سے ہوتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر ترقی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور اوج و رفعت اقبال وکامیابی لبیک کہتی ہوئی آگے بڑھی آتی ہے۔ یہی وہ پُر فضا جگہ ہے جہاں سے ترقی دارین کا دل لبھانے والا منظر دکھائی دیتا ہے۔ دنیا کی کوئی ہستی کیا وہ بادشاہ وقت ہو یا فقیر بے نوا کامیابی کے زینہ تک پہنچ ہی نہیں سکتا ہے جبتک اس میں ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا مادہ نہو۔

تاریخ سلف کی ورق گردانی اور گذشتہ زمانے کی یاد کے بعد روشن ہوجائیگا کہ دنیا کی نامور قومیں اور بلند اقبال ہستیاں کبھی بھی ترقی نہیں کرسکتیں اور اپنے ارادوں میں کامیاب نہیں ہوسکتیں اگر ثابت قدمی ان میں نہ ہوتی۔ ناکامیابی ایک ایسی چیز ہے کہ وہ انسان کو بیکار کردیتی ہے۔ لیکن اس کی تمام قوتوں کو ثابت قدمی ہی اپنی مدد سے انسانوں کے دلوں میں آنکر اس شوق کو اور بھی پہلے سے زیادہ بہتر کرکے مٹا دیتی ہے۔ اور بے ہمتی کو جلا کر خاکستر کردیتی ہے اور اس شخص کو آخر کار بام رفعت وکامیابی پر پہنچادیتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ شاہد ہے کہ محمد غوری نے نرائین کے مقام پر شکست کھائی مگر ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا نہ رہا بلکہ اس جوہر لطیف نے اس کے دل میں آنکر آتش شوق کو اور بھی زیادہ بھڑکایا اور ہمت دلائی۔ چنانچہ وہ پھر آمادۂ پیکار ہوا۔ اور آخر ایک دن وہ آیا کہ جس جس مقام پر اسنے ہزیمت اٹھائی تھی فتح ونصرت کا جھنڈا لہرانے لگا۔ غرضکہ ہر شخص کو اپنی زندگی میں اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہماری زندگی نہایت کشمکش و پیچ میں مبتلا ہے۔ ہماری ہستی نہایت ہی کمزور وناتواں ہے۔ باد صرصر کا ایک ادنٰے سا جھونکا اس کے شیرازے کو بکھیر دیتا ہے چشم زدن میں اس کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ مگر ہملوگوں کو لازم ہے کہ میدان مصیبت میں پائوں کو لغزش نہو۔ دامن صبر ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اگر قید غم میں بھی گرفتار ہوں تو زندگی کے لمحات نہایت خندہ پیشانی سے استقلال کیساتھ گزاردیں۔ کیونکہ زندگی کا لطف ارادوں کا پورا ہونا ہے اور ارادوں کے پورا ہونیکا راز استقلال و ثابت قدمی پر منحصر ہے۔ (فقط)

وہ فلم جسے ہر ماں اپنی بیٹی کو دکھانے کیلئے بیتاب ہے!

اس فلم میں آپ زندگی کا حقیقت سے بھرپور ڈرامہ دیکھیں گے۔ جو یقیناً ہزاروں کہانیوں سے زیادہ بہتر ہے۔

NATIONAL STUDIOS

نیشنل اسٹوڈیوز

عورت

ڈائرکٹر:- محبوب

پاتھے سینما بمبئی
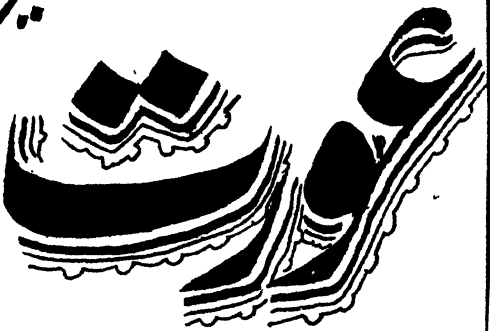
اداکار:- سردار اختر۔ یعقوب۔ جیوتی۔ ارون۔ ہریش۔ وتسلا کمٹیکر۔ کنہیا لال۔ سنالینی دیوی۔ برج رانی۔

روزانہ:- ۳½ - ۶½ - ۹½ بجے

JYOTI

See her at Pathe Cinema, in National Studios WOMAN.

ROSE

See her in Ranjit's 'India To-Day" at Royal Opera House.

SUMATI GUPTE
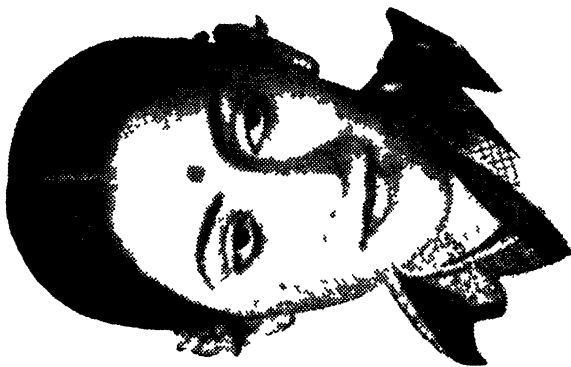
Yeswant & Sumitra

See them in Prabhat's Sant Gyaneshwar" at Central Cinema

جیسا سُنا تھا ویسا ہی پایا
تیسرا ہفتہ
پربھات کے فلم
ہمیشہ آرٹ اور انسانیت کے علمبردار ہوتے ہیں
وہ لوگ جو
سنت گیانیشور
دیکھ آئے ہیں یہی کہتے ہیں
انسانیت پرور، سماعت نواز، بصیرت افروز
ایک خدا رسیدہ بزرگ کی داستان حیات
اداکار:۔ شاہو موڈک۔ یشونت۔ منجلا۔ شنکر کلکرنی۔ وی ڈیسائی۔
سنٹرل سنیما
روزانہ:۔ ۶ اور ۹ بجے ہندی

مذہب کا اثر قومیت پر

از محترمہ زیب عثمانیہ صاحبہ لدھیانوی

سیاست دانوں کا یہ نظریہ بہت حد تک درست ہے کہ دنیا میں مذاہب کے غلط استعمال نے فساد پیدا کر کے قومیت اور ریاست کے محدود نظریوں کو ابھرنے اور جمعیت انسانی کو پاش پاش کرنے میں مدد دی! اور مشرق و مغرب میں صرف مذاہب ہی کے علمبرداروں نے طبائع میں مخالفت کا جذبہ مشتعل کر کے افراد کو سیاسی و جماعتی آزادی کے حصوں کی طرف رغبت دلائی اگر قومیت کے قیام کیلئے دنیا میں جغرافیہ اور تاریخ نے بھی بہت کام کیا۔ لیکن مذہب اس تحریک میں سب سے پیش پیش نظر آتا ہے! یہ مذہب ہی اختلاف پیدا ہو جانے کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے اوائل میں عربوں میں شام ایران اور قسطنطنیہ کی ظاہری آن بان سے متاثر ہو کر دو مختلف خیالات کے لوگ پیدا ہو گئے' ایک جماعت اسلامی سیاسیات کے ظاہری آداب کے سوا ذاتی زندگی کو شان و شوکت سے بسر کرنے کا حق مانگتی تھی' اور دوسری جماعت چاہتی تھی کہ مسلمانوں کے حاکم بانی اسلام کی ذاتی زندگی کا سادہ نمونہ پیش کریں اور ہر دو جماعتوں میں جنگیں بھی رونما ہوئیں. جن میں کربلا کا معرکہ حالت بے بسی میں ایک کھرے اور سچے مسلمان کا وہ جذبہ خدمت ہے جو حکومت اور خدمت بڑائی اور خاکساری میں توازن قائم رکھنے کیلئے پیش کیا گیا! اگرچہ اسلام کا درس ربط و اتحاد آپس میں مغربی قوموں کی طرح مستقل طور پر تقسیم ہو جانے سے بچا لے گیا۔ تاہم عرب ایک مذہبی لغزش کا شکار ہو ہی گئے، وہ عربی اور عجمی کا فرق ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی!

مغرب میں انسانیت عمومی کا تو مذہب کے علمبرداروں نے جو ستیاناس کیا وہ آج کسی سے چھپا ہوا ہی نہیں۔ یورپ کی متحدہ انسانیت کو قوموں اور گروہوں میں بانٹنے کے ذمہ دار یورپ کے عظیم و وسیع کوہ و دریا بھی ہیں لیکن یہ حقیر پانی اور پتھر کی لکیریں. بیچ میں حائل ہو کر ان قوموں یا جماعتوں پر ایک دوسرے کا مقدس خون حلال نہیں کر دیتیں' پھر کیوں وہ قومیں آئے دن کبھی کمزوروں کبھی قومیتوں کبھی کلیسا کے انتقام کے حیلے سے خنجر لئے ایک دوسرے کی تلاش میں رہتی ہیں' یہ مذہب کی غلط تاویلات کا نتیجہ ہے! مغرب والوں نے ایک اور غضب کیا یعنی مذہب کی خامیوں پر نظر ثانی کرنے اور اسے انسانی نجات کا موجب بنانے کے بجائے اور اس سے بیزار ہوتے چلے گئے' اور یہ ان کی بیزاری قومیت کے نظریہ کو فروغ دینے کا ایک اور بہانہ

بن گئی۔ کیونکہ اگر مذہب کو انسانی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو افراد میں سیاسی، عملی، اتحاد، اور یکجہتی قائم رکھنے کیلئے قومیت یا ریاست کے سوا کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا! کیا انسانوں پر ذات پات کی ناجائز قید مذہب پر عملدرآمد کا نتیجہ نہیں؟ کیا مذہب کے اجارہ داروں نے مذہب کو اپنی ذاتی ملکیت کی صورت دیکر اپنی بلندی و برتری کو نسل در نسل قائم رکھنے کی متواتر سعی نہیں کی؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو مجھے یہ کہنے دیا جائے کہ اسی ظالم گروہ کے اس نفاق اور مذہبی گھمنڈ نے دنیا میں امرا فرقہ دارانہ اور قوم پرورانہ احساس کو تقویت دی۔ جو اب تک زمانہ کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح مٹایا جا سکتا ہے!

قرون وسطیٰ کے مذاہب نے متحدہ انسانیت کے قیام و بقا کی تلقین ہی نہیں کی بلکہ وہ اسکے تسلیم کرانے اور ترویج دینے میں بھی کامیاب ہوئے، لیکن کچھ تو صنعت کے تقابلی مذاق نے جو ازمنہ وسطیٰ کی سرمایہ دارانہ ذہنیتوں کا نتیجہ تھا کچھ کام کے امتیاز کے ذات کا امتیاز بن جانے نے انسانوں میں بھی من و تو کا احساس پیدا کرنا شروع کر دیا جو آج سفید و سیاہ اقوام کے درمیان ہی نہیں بلکہ ہر دو اقوام کے اپنے علاوہ احوال کیلئے بھی صدہا تنازعات اور تفرقات کا موجب بنا ہوا ہے! لیکن یہ سب کچھ اس وقت عمل میں آنا شروع ہوا جب ایک مذہبی جماعت جو روحانیت کی ضرورت سے زیادہ قائل تھی خانقاہوں اور مندروں کے گوشوں میں صرف خدا کا عاشق ہو کر بیٹھ رہنے کو ترجیح دینے لگی تھی اور دوسری مذہبی جماعت جو بد قسمتی سے مادیت کی ضرورت سے زیادہ قائل واقع ہوئی تھی اپنی حد سے بڑھی ہوئی مادی احتیاجات کے پیش نظر مذہب اور احکام مذہب پر صرف اپنا پہرہ جمانے کی کوشش کر رہی تھی چنانچہ موخرالذکر ریاکار مذہبی گروہ نے خود کو خدا کا سگا ظاہر کرنا شروع کیا جو نہایت کامیاب حکمت عملی تھی کیونکہ سادہ دل عوام جو اپنی بڑھی ہوئی احتیاج اور بے بسی کے باعث ہمیشہ خدا کے بہت زیادہ قائل رہے ہیں۔ اب خدا کے ساتھ ان مذہبی اجارہ داروں کی بھی پرستش کرنے لگے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک خدا کی خوشنودی کا یہ ایک اور ذریعہ تھا! انسانیت عمومی کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم ہوتے تو آپ نے دیکھ ہی لیا۔ لیکن اب جمعیت انسانی کے نظریہ کیلئے زندگی کے میدان میں شکستیں ہی شکستیں تھیں۔ کیونکہ بد قسمتی سے باہمی غضب و جبر کا راندہ ہوا انسان الگ الگ حلقوں اور جماعتوں کے تعین میں اپنی پناہ دیکھنے لگا تھا۔ لیکن اس کے بعد بہت جلد انسان نے یہ محسوس کر لیا کہ وہ اس تقسیم و تعین کے بعد بھی دنیا سے غضب و جبر کو نہیں مٹا سکا ہے۔ لہذا اسے لازمی طور پر مذہب میں واقع شدہ خامیوں کی اصلاح اور عالمگیر جمعیت انسانی کے نظریہ کی دوبارہ احیا کی ضرورت لاحق ہوئی۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

(اقبال علیہ الرحمتہ)

برائے تنویر بمبئی

قطعہ

کسی کی یاد پھر تڑپا رہی ہے
گھٹا غم کی اُمڈتی آ رہی ہے
نگاہوں میں ہے ویرانی کا عالم
ہر اک شے پر اُداسی چھا رہی ہے

بقا نقوی البخاری

تنخواہ کا دن

(خاص برائے تنویر) از جناب قادر نیازی اونوی

(ایک ہندوستانی مزدور کا کیرکٹر)

راجا مل کلکتہ کا ایک متحرک پرزہ ..... یا ... پھر امیروں کی جلی ہوئی سگریٹ ..... اگر کوئی ہوسکتا تھا تو وہ رامو غریب تھا۔

گرمیوں کے طویل اور انگارے برسانے والے تیس دنوں کے بعد اسے صرف سات سفید سکے ملتے تھے ..... میں نے بارہا دیکھا کہ اس کی میلی کچیلی بنڈی میں بٹن تک نہیں ..... سردیوں کی راتیں تو اکثر جاگتے ہوئے ہی کٹتیں .... اس پر غضب یہ کہ علی الصباح چھوٹے مل جانا ... آدھی رات تو بیچارے کی آگ تاپتے ہوئے ہی تمام ہوجاتی ——— بارش تو اور بھی اس کیلئے ایک آگ تیز کر دینے والا موسم تھا — کبھی گاؤں کے نالے میں پور رہتا ——— کبھی چار دن کی جھڑی۔ پھر دیہات کے چکنی مٹی کے راستے — اس موسم میں تو رامو کو صرف پانچ یا چار ہی روپے ملتے تھے۔

نومبر کی ۹ تاریخ تھی .....

رامو نے اپنا سانچا چلاتے ہوئے قریب کے مزدور سے پوچھا۔ "بھیا آج تاریخ کیا ہے"!

دوسرے مزدور نے تیسرے آدمی سے پوچھا اور کہنے لگا۔ "آج ۹ تاریخ ہے —"

رامو نے سُنا ۹ تاریخ ———

اس کی سیاہ پیشانی کی سلوٹیں تن گئیں — امیروں جیسی ——— پھر اس نے یکایک پوچھا۔ "کل تنخواہ کا دن ہے .... نہیں بابو"

— "ارے کام کرتا ہے یا تنخواہ پوچھ رہا ہے —" قریب کے مزدور نے جھڑکاتے ہوئے جواب دیا ———

یہ مزدور رامو سے زیادہ تنخواہ پاتا تھا ———

رامو پھر ایک مرتبہ پژمردہ ہوگیا ——— اسکی ایک لمحہ کی خوشی ٹھنڈی راکھ ہوگئی۔ اس نے دل میں کہا ———

"بھگوان میں کیوں نہیں بہت روپے کماتا — یہ بڑے بڑے بابو محنت کم کرتے ہیں اور زیادہ روپے پاتے ہیں — کیا بھگوان امیروں کا ہی ہے .. ...."

رامو ابھی انہیں تفکرات میں محو تھا کہ بارہ بجے کی سیٹی ہوئی۔ مل کے بڑے دروازے سے تمام مزدور ایسے نکل رہے تھے جیسے بے جان برقی انسان — جنکا سرمایہ صرف پھٹی دھوتی — میلی بنڈی۔ اور چند بیڑیوں کے سوا کچھ نہیں۔ ان کے سخت کالے کالے ہاتھ — اور بدن پر

تنی ہوئی نسیں ہی ان کی زندگی کی آئینہ دار تھی۔

راموبڑے بنگلے کی دیوار سے جوار کی روٹی اور مولی کی بھاجی چاب چاب کر کھا رہا تھا۔ اسی وقت اسکے سامنے ایک کتا آکر کھڑا ہوگیا۔ اور راموکو گھورنے لگا۔ رامو بھی اس کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ اس نے جوار کی روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کتے کے سامنے پھینکا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے تھرتھراتے ہوئے ٹپکے لیکن میرے لئے یہ دو آنسو غریبوں کی مکمل خونچکاں داستان ہے۔

ابھی اس نے پیٹ بھر روٹی بھی نہ کھائی تھی۔ کہ پھر حاضری کی سیٹی ہوگئی۔ اسنے جلدی جلدی روٹی چبائی اور اپنے کھاتے کی طرف جانے لگا ــــ وہ نل پر پانی پی رہا تھا بازو کے کمرے میں چند کلرک چاء پی رہے تھے۔ ان کے پیالوں کی آواز کے ساتھ قہقہوں کی آواز صاف سنائی دیتی تھی ــــ راموسوچنے لگا

"کیا انہیں کام کرنا نہیں ـــ ہم غریب تو برابر روٹی بھی نہیں کھاسکتے" ـــ بھگوان کی مرجی (مرضی) ــــ

وہ اپنے کھاتے میں داخل ہوگیا۔

وہ کتا ابھی تک اس کو دور سے دیکھ رہا تھا۔

کل تنخواہ کا دن ہے۔ راموکو سات روپے ملیں گے۔

ایک .... دو .... تین .... چار .... پانچ ....

اور پرسوں بجار (بازار) بھی ہے بڑا بجار (بازار) نئی دھوتی خریدوں گا۔ اور بندی کیلئے کوئی اچھا سا کپڑا۔

اور .... اور ـــ بہت سی اچھی اچھی چیزیں .....

رامو انہیں خیالات میں محو تھا۔ اسے مطلق خیال نہ تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے اور اسے کہاں جانا ہے ـــ

سینما کے اشتہار بانٹنے والی موٹر اس کے سامنے سے نکل گئی ـــ "بھگوان یہ دنیا کتنی سندر ہے۔ کتنی اچھی ہے" ـــ جونہی اسنے بڑی سڑک کو پار کرنا چاہا ایک تیز موٹر اس سے ٹکرا گئی اور وہ فوراً ہی سڑک کی ڈھلان پر تڑپنے لگا۔

رامو فوراً اسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس حادثے سے اس کے سر اور پیر پر کافی ضرب آئی تھی۔ ڈاکٹروں نے صاف کہدیا تھا کہ کوئی امید نہیں"۔

رات کٹ گئی اپنے معمول کے مطابق .... دوسرا دن طلوع ہوا ... ہزاروں حادثات کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے راموغریب "وارڈ" کے ایک سادہ سے پلنگ پر بے حس پڑا تھا۔ جیسے مردہ لاش۔

آج پھر ــــ ۱۲ بجے کی سیٹی ــــ فضاؤں کو چیرتی ــــ امیروں کے گھروں سے ـــ اور غریبوں کے جھونپڑوں سے ہوتی ہوئی ـــ رامو کے کانوں تک پہنچی ـــ اسنے ایک ہیبتناک چیخ ماری ـــ

"آج تنخواہ کا دن ہے"

یہ آواز ہسپتال کے وارڈ میں گونجی اور ہمیشہ کیلئے فضاؤں میں کھو گئی ــــ ....

تھوڑی دیر بعد ایک لاش "چیرگھر" (جہاں لاوارث لاشوں کی چیر پھاڑ ہوتی ہے) کی طرف لیجائی جارہی تھی۔

مئے دو آتشہ

مرسلہ زبیدہ زرّین صاحبہ صاموٗنیہ گوالیار

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی لافانی کتاب جاوید نامہ میں فلک قمر کے عنوان سے حضرت رومی کی زبان حقیقت بیان سے جو عالم - آدم - اور حق کی حقیقت بیان کی ہے اور جو "عالم" اور "حق" کے متعلق شرق و غرب کے رجحانات ہیں وہ صرف دو شعروں میں اس عمدگی سے ظاہر کئے گئے ہیں کہ دریا بکوزہ کی مثل صادق آئی - انکا ترجمہ کیا گیا ہے -

اقبال

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم این شمشیر را سنگِ فسن
شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید از حق رمید

ترجمہ

آدمی ہے تیغ اور حق تیغ زن
ہے جہاں اس تیغ کا سنگِ فسن
واقفِ اسرارِ حق مشرق ہوا
پر جہاں سے بے خبر یکسر رہا
گو جہاں کے راز سب عریاں کئے
حق سے اہل غرب نا واقف رہے

ایک اور جگہ جسم و جان کے صحیح رشتہ کا مفہوم واضح کیا ہے اور اسی سلسلہ میں معراج کا نکتہ بھی کھول دیا ہے - ملاحظہ ہو -

اقبال

چیست جاں؟ جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیر سپہر گرد گرد

ترجمہ

جان ہے جذب و سرور و سوز و درد
ذوقِ تسخیرِ سپہرِ گرد گرد

اقبال

چیست تن؟ با رنگ و بو خو کردن است
با مقام چار سو خو کردن است
از شعور است اینکہ گوئی نزد و دور
چیست معراج؟ انقلاب اندر شعور
انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وا رہاند جذب و شوق از تحت و فوق
این بدن با جانِ ما انبار نیست
مشت خاکے مانعِ پرواز نیست

ترجمہ

جسم ہے عشقِ جہانِ رنگ و بو
ہے مقام اس کا مقام چارسو
مت سمجھ معراج کو نزدیک و دور
یہ ہے لے جاں "انقلاب اندر شعور"
ہے کرشمہ یہ وفورِ شوق سے
واسطہ کیا اس کو تحت و فوق سے
جسم جاں کو باز رکھ سکتا نہیں
مانع پرواز رکھ سکتا نہیں (فقط)

وفات حسرت آیات

گزشتہ ماہ بیگم نواب محمد اسمٰعیل خانصاحب میرٹھ کا اچانک طور پر انتقال ہوگیا جس سے ہر دردمند ملت کو زبردست صدمہ پہنچا ہے۔ بیگم مرحومہ مسلم خواتین میں ایک نمایاں اور ممتاز پوزیشن کی مالک تھیں۔ ان کی خدمات قومی قابل فخر ہیں اور یادگار رہینگی۔ تمام مسلم خواتین کے علاوہ آپکے حلقۂ تعارف کی تمام دیگر خواتین بھی اس حادثہ ناگاہ پر غمگین اور افسردہ ہیں۔ چونکہ مرحومہ بہت نیک بی بی تھیں اور سچے معنوں میں انسانیت کا نمونہ تھیں۔

اسی سلسلے میں ہمیں دو خط میرٹھ سے وصول ہوئے ہیں۔ جو ہم شائع کر رہے ہیں۔ اس سے مرحومہ کے مختصر حالات زندگی اور سانحہ ارتحال پر روشنی پڑتی ہے۔ ادارۂ تنویر مرحومہ کے رشتہ داروں اور پسماندگان کے اس رنج و قلق میں دل سے شریک ہے۔

(ادارہ)

از میرٹھ

مکرمہ ایڈیٹر صاحبہ تسلیم۔

کچھ عرصہ ہوا آپکا عنایت نامہ موصول ہوا۔ آپکی اس محبت سے جس قدر خوشی ہوئی وہ تحریر سے باہر ہے۔ جواب جلد نہ دے سکی جسکا افسوس ہے۔ چونکہ اس عرصہ میں میری پیاری آپا (بیگم نواب محمد اسمٰعیل خاں) کی موت کا ایسا عجیب واقعہ ہوگیا کہ طبیعت آج تک پریشان ہے۔ ہم سبکو اور خصوصاً اور سب ملنے والیوں کو یقین بھی نہیں آتا۔

ہوا یہ کہ ۹ ہر اپریل کی شام کو وہ اپنی چھوٹی لڑکی کے ہمراہ شہر میں قاضی نجم الدین صاحب کے مکان پر تشریف لے گئیں کسی قسم کی کوئی بات نہ تھی۔ جب قاضی صاحب کے مکان سے رات کو واپس چلنے لگیں تو ایکدم دوران خون کا زور ہوا اور گر پڑیں گھر کی بیویوں نے انکو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا۔ سر میں درد کی شکایت بتائی اور اسی دوران میں بیہوش ہوگئیں۔

کوٹھی سے انکی لڑکیاں خبر ہوتے ہی قاضی صاحب کے یہاں گئیں۔ اور ہمارے یہاں سے کچھ لوگ وہاں پہنچے مشہور ڈاکٹروں میں بھوپال سنگھ اور ڈاکٹر جے۔ ایل۔ کرولی بلائے گئے۔ انہوں نے خون وغیرہ نکالا۔ مگر انکو ہوش آنا تھا نہ آیا۔ حالت بگڑتی گئی۔ بالآخر ۲ بجکر ۱ منٹ پر ہم سبکو روتا چھوڑ کر قاضی صاحب کے مکان پر ہی اس دنیائے فانی سے عالم جاودانی کو سدھاریں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اتفاق کی بات کہ انکے لڑکے اور دولہا بھائی صاحب قبلہ میرٹھ میں تشریف نہ رکھتے تھے سبکو تار دیکر بلایا گیا۔ صبح کو مرحومہ کو انکی کوٹھی "مصطفےٰ کاسل" لے گئے۔ دوپہر تک دولہا بھائی مع لڑکوں کے نیز اور عزیز انکی ساتھ غیر جہانگیر آباد سے آگئے۔ حالت قلم بند کرنا میرے لئے کم از کم بالکل ناممکن ہے خود اندازہ کر لیجئے کہ کیا وقت سب پر گزر رہا ہوگا۔ شام کو ۵ بجے سپرد خاک کر دیا گیا۔ ابتک ہم سبکے دلوں کو قرار نہیں ہے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم سبکو صبر عطا فرمائے۔ مرحومہ نے یادگار آٹھ بچے چھوڑے ہیں خدا انکو زندہ رکھے۔

مرحومہ بڑی زندہ دل تھیں اور ملنسار بیوی تھیں۔ نماز

مسلم لیگ میرٹھ کی صدر تھیں مسلم نسواں اسکول قائم کیا تھا۔ خدا اسکول کو دن رات ترقیاں دے۔ جو اُن کی یادگار ہے۔ دراصل ان کی موت سے مسلم خواتین کو ایک زبردست دھکا پہنچا ہے۔

تنویری بہنوں سے استدعا ہے کہ وہ پیاری آپا کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ (فقط) آپکی مجسمہ

بیگم صاحبہ نواب اسمٰعیل خاں صاحب لکھنؤ کے مختصر حالات زندگی

(مرسلہ محترمہ اسد فاطمہ صاحبہ میرٹھ)

آپکی پیدائش حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ والدہ میرٹھ کی تھیں اور والد ضلع الہ آباد کے، عرصہ سے والد نے حیدرآباد کی سکونت اختیار کرلی تھی حیدرآباد میں اور عزیز بھی ہیں۔

شادی ۱۴ سال کی عمر میں ہوئی۔ اس وقت زمانہ کے لحاظ سے اردو اور انگریزی میں کافی لیاقت حاصل تھی۔ شادی کے بعد میرٹھ آگئیں اور اسکے بعد سے زیادہ تر میرٹھ ہی رہنا ہوا۔ والد کا انتقال صغر سنی میں ہو گیا تھا۔ والدہ بہنیں اور بھائی وغیرہ حیدرآباد ہی میں رہتے تھے۔

انہوں نے اپنی نئی زندگی کو اس قدر کامیاب بنالیا تھا کہ سسرال والے اور عزیز ان سے بہت خوش تھے اور ان پر فخر کرتے تھے۔ قومی خدمت کا شوق بہت تھا میرٹھ میں مسلم خواتین کی سوشل زندگی کی روح رواں تھیں۔ عید میلاد کا سالانہ جلسہ، مسلم لیگ کے جلسے۔ غرض ہر قومی اجتماع انہیں کے دم سے رونق پاتے تھے۔ میرٹھ خواتین مسلم لیگ کی صدر تھیں تمام پبلک ان سے بہت خوش تھی۔ لڑکیوں کے واسطے انہوں نے ایک سکول بھی قائم کیا تھا جو کہ انکی اخیری یادگار ہے اور اسکے تمام اخراجات اپنے ہی پاس سے برداشت کرتی تھیں۔ اسکے بڑھانے کی اس وقت کافی کوشش ہو رہی ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ انکی یہ آخری یادگار ہمیشہ زندہ رہے اور ان کے نام کو روشن کرے۔ (آمین)

خوش مزاج اس قدر تھیں کہ جیسا آدمی ہو ویسی ہی باتیں۔ اگر بڑوں میں بیٹھی ہیں تو بڑی۔ لڑکیوں میں ہیں تو لڑکی اور بچوں میں بچہ۔ امیر و غریب ہر ایک سے محبت سے پیش آنا اپنا مین فرض سمجھتی تھیں۔

موسیقی، شاعری۔ بیت بازی اور چمن بندی وغیرہ سے خاص شوق تھا انتقال سے کئی روز پہلے لیڈیز پارک میں میلاد شریف کیا خود میلاد شریف پڑھا اور سر انتظام میں پیش پیش رہیں۔ افسوس ہر دلعزیز تھیں کہ جس دن لیڈیز پارک میں میلاد تھا اسی روز ہندو عورتوں نے بھی جلسہ کیا اور انہیں اس کا صدر بنایا مگر افسوس وہ اس کا کوئی کام سرانجام نہ دے سکیں۔ اس کا انہیں رنج تھا۔

مرحومہ نے ۳ لڑکے اور چھ لڑکیاں چھوڑیں۔ انکا انتقال بالکل اچانک ہو گیا۔ ایک جگہ شہر میں مہمان گئی تھیں۔ واپسی کے موقعہ پر ایکدم دورہ پڑا اور بیہوش ہو گئیں۔ اور تھوڑی دیر بعد انتقال ہو گیا۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب لکھنؤ گئے ہوئے تھے ایک لڑکا ولایت میں پڑھنے کیواسطے گیا ہوا ہے۔ جسوقت دورہ پڑا ہے اس وقت ۱۱ سال کی لڑکی انکے پاس تھی۔ جنت نشان یعنی انکے میکے میں طبیعت خراب ہونیکا حال سنا۔ اسی وقت سب عزیز قاضی صاحب کے یہاں پہنچ گئے صبح ۵ بجے جنازہ "مصطفےٰ کاسل" لایا گیا جو کہ ماموں زاد بھائی لائے۔ نواب صاحب خورشید اسن صاحبہ بڑی لڑکی دونوں لڑکے اور سسرال کے عزیز لکھنؤ ہردوئی وغیرہ مختلف مقامات پر تھے سبکو تار اور موٹریں روانہ کی گئیں ۱۲ بجے سے ۴ بجے تک سب عزیز آگئے تھے ۵ بجے شام کو جنازہ اٹھا۔ جنازہ کے ساتھ بہت زیادہ ہجوم تھا اور ہر فرد و بشر کو انکی اس اچانک موت کا رنج تھا۔ مرحومہ کو مقدم شاہ ولایت میں انکے نانا محمد صدیق صاحب مرحوم (جو کہ حیدرآباد دکن میں ایک بڑے عہدہ پر ممتاز تھے اور کوٹھی جنت نشان والوں سے انکا بہت قریب کا رشتہ ہے) دفن کی گئیں۔ خدا مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

میرے بہنوئی نے مجھے بالکل حق بجانب ٹھہرایا اور کہا کہ مجھے بہت سی باتوں سے اس کا اندازہ ہوا کہ آپ کیلئے خاندان بھر میں کوئی جگہ نہ تھی۔ پھر آپ گھر نہ چھوڑتیں تو کیا کرتیں؟ مثال کے طور پر انہوں نے کہا۔ کہ جب آپ پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کے متعلق گھر میں بات چیت ہوا کرتی تو تمہاری سوتیلی ماں بھی بھورے سے کم مسرور نظر نہیں آتی تھیں وہ بھی بھورے کی ساتھی دکھائی دیتی تھیں اور انہیں بھی بھورے جتنی ہی اس بات کی خوشی تھی کہ آپ پر مقدمہ چل رہا ہے۔ اس سے آپ نہ صرف مصیبت میں مبتلا ہیں بلکہ آپکو جیل بھی جانا پڑیگا۔ جو ان کے خیال میں آپ کے لئے انتہائی ذلت کی بات ہوگی۔ اور آپکی ذلت انکی تمنا تھی جو پوری ہوتی نظر آرہی تھی۔ وہ خوشی کے بہاؤ میں ایسی بہنے لگیں کہ ہم سب کے سامنے ہی آپ کے والد سے پوچھنے لگیں "کہو اگر صاحب پر دیں جیل جائیگی تو تمہیں اس کے کھانے کو تو روپیہ نہیں دینا پڑیگا؟" اس سوال پر والد صاحب کا منہ غصہ سے سرخ ہوگیا اور ہم سبکو بہت برا لگا۔ خاصکر مجھے اس بات سے سخت تکلیف پہنچی کیونکہ میں سوتیلے بچوں سے ان کے حسد اور جلاپے کو اس کمینہ حد تک پہنچا ہوا نہیں سمجھتا تھا۔ سوتیلی لڑکی بھی اس کے جیل جانے کی خوشی بھی درست، مگر انہیں غم اس بات کا تھا کہ اس کے کھانے پینے پر خرچ نہ کرنا پڑ جائے" اس بات پر پہلی بار مجھ میں اور انمیں شدت سے لڑائی ہوئی اور تقریباً آٹھ دن تک بات چیت بند رہی۔

یہ تمام باتیں سُنکر مجھے بھی کافی رنج ہوا۔ اور ابتک اسکا اثر باقی ہے پہلے ہم باپ کے منہ سے اس سے محبت کرنا چاہتے تھے مگر اس کے دل کا یہ نقشہ دیکھکر اب طبیعت اس پر آمادہ نہیں ہوتی۔ یقیناً اگر میری ماں زندہ ہوتیں تو بھورے سے اتنی نجات تو ملتی کہ ماں کے گھر آکر بیٹھ جاتی اور زندگی کاٹ دیتی۔ مگر سوتیلی ماں کی وجہ سے، اسکے حسد اور جلی کٹی باتوں کیوجہ سے باپ کے گھر کا دروازہ بھی اپنے لئے بند پا کر میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ مجبور، بیکس، اور قابل رحم حالت تو میری تھی۔ مگر والد صاحب اور تمام اعزہ کی نظروں میں سرخرو بھورے، سوتیلی ماں، اور دادی ہوگئے۔ پہلے کی خاندانی رنجشوں۔ نااتفاقی اور لڑائیوں کے جواز میں یہ تینوں میرے گھر چھوڑ دینے کو پیش کر دیتے اور کہتے کہ ہم تو بے قصور ہیں اصل میں خراب تو

تمہاری لڑکی تھی تب ہی تو نہ نبھ سکی۔ دیکھو نا آخر گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ شاید والد صاحب نے بھی اس پر یقین کر لیا چونکہ صرف اسی وقت سے سوتیلی ماں کو ہمارے گھر میں ہم پر فوقیت حاصل ہوئی ورنہ اس سے قبل والد صاحب نے ایک مثال قائم کر دی تھی۔ کہ سوتیلی ماں آکر باپ پر قبضہ نہیں کر سکتی۔ اور اگر باپ چاہے تو سوتیلی ماں۔ بچوں کی لونڈی کی حیثیت سے رہ سکتی ہے اور بچوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ بلکہ بچوں کی حکومت سوتیلی ماں پر چل سکتی ہے۔

ممکن ہے کہ والد صاحب کی یہ بے انصافی یعنی تمہاری بیجا حمایت اور سوتیلی ماں کیساتھ سختی سے پیش آنیکا ہی یہ نتیجہ ہو کہ وہ ہم سے اس قدر نفرت کرنے لگی۔ بہر حال جو بھی ہو میں نے سب حقیقتوں پر روشنی ڈالدی ہے نتیجہ نکالنا ناظرین کا کام ہے۔ لیکن یہ ایک سنگین حقیقت ہے کہ میری تباہی سے سب سے زیادہ خوشی بھورے، سوتیلی ماں اور اس کے بعد نانی کو ہوئی۔ خاصکر اسلئے کہ اس سے ان کے عیبوں پر پردہ پڑ گیا۔

مقدمہ چلتا رہا۔ بھورے خوب بن ٹھنکر عدالت میں آیا کرتا۔ مگر بناوٹ سجاوٹ پر بھی بھدّا پن حاوی ہی رہتا۔ کبھی گھیر دار شلوار، رنگین ازار بند لٹکتا ہوا۔ لانبی ریشمی قمیص شکاری کوٹ، باریک ململ کا رنگا ہوا ابرک لگا صافہ، پشاوری کلاہ پہنکر آتا۔ اس لباس سے نہ جانے کیوں مجھے ہمیشہ شدید نفرت رہی ہے۔ کبھی کوٹ پتلون پہنکر شاہی لنگی باندھکر آتا۔ کنگھی پٹی ہمیشہ کئے رہتا۔ وہ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس قماش کے مرد جو ذرات زنان بازاری کے حضور میں بیٹھنے والے ہیں ان میں زنان بازاری کی سی عادتیں ضرور پائی جاتی ہیں۔ وہی زنانہ ادائیں۔ ہر دم فحش اشعار گنگناتے رہنا۔ بناؤ سنگھار ناز و نخرے۔ فحش حرکتیں۔ اوپر سے لیپا پوتی اور اندر سے سڑاند۔ میری نظروں میں تو اس کی یہ حقیقت تھی بھیڑ کوّا چلا ہنس کی چال تو بھول گیا اپنی بھی چال کے مصداق وہ اور بھی بہنگم نظر آتا تھا۔ ایسا کہ جی متلانے لگتا۔

انہیں دنوں تمام ملنے جلنے والوں پر بھورے کے عیوب، جہالت، اکھڑ پن اور بے شعوری کے پول کھلے کیونکہ خطوط اور اخبارات کے ذریعے، بعض ہمدردوں کی معرفت اس قسم کی خبریں مجھ تک اکثر پہنچتیں کہ بھورے کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر اس کے حامی بھی اس سے کترانے لگے ہیں اور میرے مخالف گروہ میں سے بھی بہت سے حضرات میرے ہمدرد بنگئے ہیں انکا کہنا تھا کہ واقعی میرے والد نے اس معاملے میں بہت زبردست غلطی کی ہے کہ طوطی اور زاغ کا جوڑا ملایا اور لڑکی پر یہ بہت بڑا ظلم توڑا گیا کہ ایسے گنوار اور جاہل سے بیاہا۔ وہ کسی طرح اس کے لائق نہ تھا۔ اور پھر اس کی فریاد کی کچھ شنوائی بھی نہ کی۔" بھورے ایسا بے غیرت۔ بے حمیت بے شرم اور جسمانی لذتوں کا دلدادہ تھا کہ اتنی بڑی مصیبت اور بدنامی کا بھی اس پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ جبکہ اور تمام نزدیک و دور کے رشتے دار اس غم سے نیم جاں ہو رہے تھے۔ یہ رہتا سہتا اور کھاتا پہنتا تو میرے والد کے یہاں اور ان کی وجہ سے ہی معزز لوگوں میں اس کا آنا جانا تھا۔ وہاں یہ خواہ مخواہ اکڑتا پھرتا۔ اور اپنی جہالت اور بدتمیزی کی نمائش کرتا۔ رحمتہ شام کو صبح وجمع کر "شیطان پورہ"

ضرور جاتا۔ سب لوگ اس کی بدچلنی اور کمینہ حرکتوں سے نالاں تھے۔ اس سے نفرت کرتے تھے۔ مگر چونکہ مقدمہ اسی کی طرف سے دائر تھا اسلئے خاموش تھے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ اس مقدمہ کیوجہ سے شہر میں ایک طوفان سا برپا تھا۔ ہر انسان کی زبان پر اسی واقعہ کا ذکر تھا۔ میرے ہمدرد تھوڑے تھے مگر مخالفین کی کثرت تھی۔ میرا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا ہر کام شدید احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا۔ میرے محافظوں کی جان بھی خطرے میں تھی کئی نئے اخبارات صرف مجھے اور میرے ساتھیوں کو گالیاں دینے کیلئے نکالے گئے۔ بدمعاش اس کام پر مقرر کئے گئے کہ مجھے پکڑ لائیں یا زک پہنچائیں۔ مگر میرا مددگار تو خود خدا تھا۔ کیونکہ میں اس کے "قانون قدرت" پر عمل پیرا تھی بیکسوں کے زمرے میں سے نکلکر، فضول قسم کی ایثار و قربانی کو چھوڑ کر اپنی طاقتوں سے کام لینا سیکھ گئی تھی۔ زندگی اور زندگی کیلئے اپنے جائز حقوق غاصبوں سے زبردستی چھین لینے پر آمادہ تھی۔ اسلئے خدا میری مدد پر آمادہ تھا۔ جبتک میں اپنے آپکو اپنی زندگی اپنے حقوق کو اپنی کمزوری کیوجہ سے پامال ہونے دیرہی تھی اور انکی قدر نہیں کرتی تھی خدا بھی میری طرف سے غافل تھا۔ میں بیکس و کمزور بنکر چاہتی تھی کہ دوسرے مجھپر رحم کریں۔ یہ میری بھول تھی۔ بیکس اور کمزور پر کوئی رحم نہیں کرتا بیکس اور کمزور صرف مٹ جانے کیلئے ہے۔ میں نام نہاد شرافت کے دھوکے میں آکر لونڈی غلام سے بدتر بنی ہوئی تھی۔ کمزوری اور بیچارگی کو تہذیب و انسانیت سمجھ رہی تھی۔ نااہلوں سے ایثار و قربانی برت کر اچھی صفات کا خون کر رہی تھی — نا اہلوں کی گردن نہ مروڑ کر یقیناً میں بہت بڑے گناہ کی مرتکب ہو رہی تھی۔ پھر خدا میری مدد کیوں کرتا؟ میرے انہیں گناہوں کیوجہ سے مجھے نقصان پہنچا۔ اور ہر اس عورت کو اسی طرح نقصان پہنچ رہا ہوگا جو اس غلط راستہ پر گامزن ہے۔ جب میں صحیح راستہ پر آگئی خدا نے فی الفور میری مدد کی۔ ہزاروں دشمن ہوتے ہوئے بھی میرا بال بیکا نہ کرسکے

---

۷ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ بھورے اور اس کے گواہ جراح میں بہت بُری طرح سے اکھڑے انکی بڑی ذلت ہوئی۔ بالآخر مقدمہ خارج ہوگیا۔ بھورے کو اس ذلت و عزت کی کیا پڑا تھی۔ اس کیلئے تو یہ ایک کھیل تماشہ تھا۔ البتہ وہ اس بات سے بہت خوفزدہ تھا کہ میں اور میرے مددگار کہیں اس پر ہتک عزت، اور حرجانے کا مقدمہ دائر نہ کردیں۔ چنانچہ مجھے اپنی بہن کے خط سے یہ معلوم ہوا کہ بھورے ڈر کے مارے روتا پھرتا ہے۔ آج کل اس پر نیند حرام ہے اور سخت پریشان ہے۔ تم اس پر ضرور مقدمہ دائر کرکے اسے کیفر کردار کو پہنچاؤ" میں بھی بھورے کو ستانا اور اُسے سزا دینا دنیا کا سب سے بڑا "کار ثواب" سمجھتی تھی۔ مگر افسوس کہ میرے مددگار اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا "کہ کیوں اپنی قیمتی زندگی اور وقت کو محض انتقام لینے کیخاطر ایسے کمین شخص کے منہ لگ کر اور الجھ کر خراب کرتی ہو اب اس پر لعنت بھیجو"۔ اس پر میں خاموش ہو رہی۔ فوجداری مقدمہ خارج ہونے کے بعد بچے چھیننے کے لئے ان لوگوں نے عدالت دیوانی میں مقدمہ دائر کردیا۔ اِدھر خود غرض اور ہنگامہ پرست لوگوں نے عوام کو بھڑکانا شروع کردیا اور اسے مذہبی شکست کا رنگ دیدیا۔

شہر کی فضا زہریلی کر دی گئی۔ عوام مشتعل ہو اٹھے۔
غور کرنے کی بات ہے کہ مقدمہ خارج ہوا یا ذلت آمیز ہار ہوئی تو ہوئے جیسے بد قماش انسان کی ہوئی۔ جس کا دراصل وہ مستحق تھا۔ پھر بھلا اس معمولی سے واقعہ سے مذہب کو کیونکر نقصان پہنچ سکتا تھا؟ اگر ایک بیکس و معصوم لڑکی کو جو ایک شیطان کے پنجۂ ظلم میں گرفتار تھی اگر اس کی قید سے آزاد ہوگئی تو اس بات سے اسلام کو کیسے خطرہ ہوگیا؟
مگر اس بد قسمت ملک میں تو ذاتی اغراض اور محدود فائدے کیلئے ہمیشہ ہی بے چارے مذہب کو آلۂ کار بنا لینے کی ایک رسم سی پڑی ہوئی ہے۔ مذہبی دعویداروں کو اس سے بحث نہیں کہ ان کے اِن اعمال سے مذہب کی عزت و حرمت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔
بہرحال شیطان کی حمایت میں مذہب کی دہائیاں دی گئیں۔ اور نیکی کو زک پہنچانے کیلئے ناسمجھ عوام کے جذبۂ مذہبی سے غلط کام لیا گیا۔ مقدمہ خارج ہوئے کوئی ڈیڑھ ہفتہ ہی گزرا ہوگا۔ سہ پہر کا وقت۔ بھائی مجھے انگریزی پڑھا رہے تھے کہ پریسیڈنٹ صاحب کے یہاں کا چپراسی بدحواس ہانپتا کانپتا ہمارے پاس پہنچا اور بھائی جی کو ساتھ چلنے کو کہا۔ اور یہ ہیبتناک خبر سنائی کہ پریسیڈنٹ صاحب کو کسی نے گولی مار کر شہید کر دیا۔ مجھ پر تو گویا ایک بجلی سی گر پڑی اور بھائی جی کے تو صدر صاحب باپ ہی تھے۔ ہم دونوں چپراسی کے ساتھ ہولئے۔ وہاں جا کر ایسا ہیبتناک نظارہ دیکھا جس پر انسانیت آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھی۔ پریسیڈنٹ صاحب کے چار گولیاں لگی تھیں انکے ملازم کو بھی دو گولیاں لگی تھیں مگر یہ زندہ تھا۔ سارا کمرہ خون سے لت پت تھا۔ ایک ملازم خونی کو پکڑے ہوئے ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ گولیوں سے خالی ریوالور خونی کے ہاتھ میں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی خونی تلملا اٹھا۔ اور کہنے لگا کہ خدا کے لئے مجھے اتنی دیر کے لئے چھوڑ دو کہ میں ریوالور بھر کر اس مردار کو بھی واصل جہنم کر دوں۔ ملازم نے اُسے اور بھی زور سے پکڑ لیا۔ پریسیڈنٹ صاحب کے داماد اور بھائی جی بہت گھبرا گئے۔ انہوں نے ایک صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے یہاں سے اپنے ساتھ لیجا کر بحفاظت گھر پہنچا دیں۔ چنانچہ مجھے گھر پہنچا دیا گیا اور سارے شہر میں اس واقعے سے کہرام سا مچ گیا:

(باقی)

فلمی خبریں

پربھات فلم کمپنی کے نئے فلم سنت گیانیشور کی نمائش سنٹرل سینما میں ہوئی۔ پبلک اس کا نہایت بیچینی سے انتظار کر رہی تھی۔ یہ فلم نہایت زور و شور سے چل رہی ہے۔ مسٹر شانتا رام نے اپنی نئی پکچر "پڑوسی" کی شوٹنگ شروع کر دی ہے۔

رنجیت فلم کمپنی کی فلم "انڈیا ٹوڈے" نہایت کامیابی کیساتھ رائل اوپیرا ہاؤس میں چل رہی ہے۔ اس کے بعد ہندی "تلسی داس" نمائش کیلئے پیش کیا جائیگا۔ اس کمپنی کی آنیوالی فلمیں "امید" اور "پاگل" ہیں۔

کلکتہ فلم ایکسچنج نیو تھیٹرز کی "زندگی" منروا ٹاکیز میں اس وقت تک نہایت شان و شوکت سے چل رہی ہے۔ اسکے بعد نیو تھیٹرز کی زبردست فلم "آندھی" آنے والی ہے اسمیں پنکج ملک بطور ہیرو کے پیش ہونگے۔ ان کے ساتھ مولینا بھی ہونگی۔

نیشنل اسٹوڈیوز کی فلم "عورت" پاتھے سینما میں سرکوز "فل ہاؤس" لے رہی ہے۔ خیال ہے کہ یہ فلم بہت مدت تک کامیابی سے چلیگی۔

واڈیا موویٹون کا زبردست موسیقی سے لبریز شاہکار "دیے کمار" نمائش کیلئے پیش ہونے والا ہے۔ اس میں سردار منصور۔ اور سربتا کام کرتے ہیں۔ اسکے ڈائرکٹر مسٹر اسپی ہیں۔

انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ کی عظیم الشان فلم "بھورانی" عنقریب پیش ہونیوالی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ والوں کا یہ "عنقریب" بہت طویل ثابت ہو رہا ہے۔ اور پبلک کا اشتیاق کے مارے برا حال ہے۔ یہ فلم نمائش کیلئے ایکسلسیر سینما میں پیش ہوگا۔ کمپنی نے اعلان کیا ہے کہ ان کی آنے والی پکچر "گمو نسلہ" ہو گی۔

منروا موویٹون کی فلم "میں ہاری" بہت کامیاب رہی۔ اس کے بعد کمپنی اپنی نئی فلم "بھروسہ" پیش کرے گی۔

اسی کمپنی کے مایۂ ناز پبلسٹی افیسر مسٹر مغنی نے کمپنی سے استعفیٰ دیدیا ہے۔ مسٹر مغنی کی یہ علیحدگی برضا و رغبت عمل میں آئی۔ مسٹر سہراب مودی کو بھی اپنے اس ہر دلعزیز رفیق کارکن سے علیحدگی پسند نہ ہوگی۔ اس کا سب کو یقین ہے مگر مسٹر مغنی کی ترقی اور بہبودی کی خاطر سبکو اس علیحدگی کو برداشت کرنا ہی پڑا۔

بمبئی ٹاکیز کی تازہ فلم "آزاد" راکسی میں چل رہی ہے۔ اس فلم میں اشوک کمار۔ لیلا چٹنس۔ راماشکل اور ہنسا کام کرتے ہیں ؎
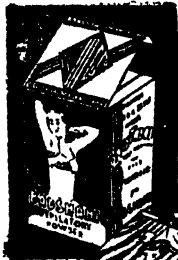
(سایو یونا)

گوڈریج سوپ لمیٹڈ کسی تعارف کی محتاج نہیں.

یہ کمپنی ہندوستان کی سب سے پہلی اور مشہور و معروف بہترین صابون بنانے والی کمپنی ہے. کمپنی نے اس بار اپنا نیا غسل کا صابون "وطنی سوپ" تیار کیا ہے. ہمنے بھی یہ صابون استعمال کیا ہے. یہ صابون بہترین خوشبودار ہے. جلد کو ملائم اور صاف کرنے میں ولایتی صابونوں سے کم نہیں ہے. ٹکیہ کافی بڑی ہے اور اِن خوبیوں اور مقدار کے مقابلہ میں فی ٹکیہ تین آنے قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے.

امید کہ اہل وطن اپنی وطنی صنعتوں کی ترقی پر خوش ہونگے اور اسے استعمال کرکے اپنی ملکی صنعتوں کی ترقی میں اضافہ کرینگے.

سنت گیانیشور - تیار کردہ پربھات فلم کمپنی پونا - ڈائرکٹر ڈملے اور فتح لال - نمائش گاہ سنٹرل سینما بمبئی - یہ ایک مذہبی اصلاحی فلم ہے. سٹوری بہت اچھی ہے - اور اسمیں جدت پائی جاتی ہے اسمیں بتایا گیا ہے ایک ایسا شخص جسکی طبیعت پر مذہبی اثرات غالب ہیں گھر بار اور بیوی کو چھوڑ کر سنیاسی بنجاتا ہے اور پھر فطرت انسانی سے مجبور ہوکر دوبارہ گرہستی جیون اختیار کرلیتا ہے مذہب اور فطرت کی کشمکش کو بہت اچھے انداز میں دکھایا گیا ہے. فلم سبق آموز اور عبرت انگیز ہے.

ڈائرکشن بہت اچھی ہے. فوٹو گرافی اور صدابندی بھی عمدہ ہے. ماسٹر یشونت کے ایکٹنگ اور ڈائلاگ پبلک سے بہت خراج تحسین حاصل کررہے ہیں. فوٹو گرافی کے وہ سین جوکہ گھنے جنگل میں لئے گئے ہیں اور جہ یوگی راج کیلئے

خود بخود ہٹ کر راستہ صاف کردیتے ہیں پسندیدہ ہیں گاڑیبان کے کھیتوں والا گانا بھی تعریف کے قابل ہے - اس موضوع پر یہ پہلی فلم ہے جو پردۂ تصویر پر پیش کی گئی ہے.

"عورت" تیار کردہ نیشنل سٹوڈیوز لمیٹڈ - ڈائرکٹر محبوب نمائش گاہ پاتھے سینما - اس فلم میں ہندوستان کے گاؤں اور ہندوستانی عورت کی زندگی جس انداز میں پیش کی گئی ہے وہ حقیقت کا پہلو لئے ہوئے ہے - اور اسلئے اثر کرنیوالی اور قابل تعریف ہے. اس کے لائق ڈائرکٹر نے واقعی ہندوستانی عورت کی پیدائش سے موت تک، زندگی کے تمام مجردد پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے - اس فلم کی سب سے زیادہ خصوصیت اس کی فوٹو گرافی ہے - اداکاروں میں یعقوب کا کام سب سے بڑھکر ہے. جس وقت یہ سامنے آتا ہے اسوقت کسی اور طرف دیکھنے والے کا دھیان نہیں جانے دیتا - سردار اختر نے اپنا کام باوجود مشکل ہونے کے بہت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے. کنھیا لال کے ٹما کلاک بولنے کا انداز نہایت دلکش ہے. اور اس کی ایکٹنگ بھی بہت اچھی ہے. سریندر اور جیوتی نے بھی اپنے رول عمدگی سے ادا کئے ہیں. وتسلا کمیشکر کے گانے بھی اچھے ہیں.

بحیثیت مجموعی یہ فلم بہت عمدہ اور کامیاب ہے.

کوئی ضرورت نہیں کہ آپ اُن عورتوں کی مخمل کی طرح ملائم جلد کو دیکھکر رشک کریں جن کا حُسن جاذب نظر ہوتا ہے۔ اگر آپ پوری توجہ سے کام لیں تو آپکا حُسن بھی ویسا ہی ہوسکتا ہے۔ ہر عورت جانتی ہے کہ دلفریب حسن و جمال کیلئے خوبصورت رنگ ایک لازمی چیز ہے۔

آج ہی سے اپنی جلد کو شفاف، تر و تازہ اور گلاب کی پنکھڑی کی طرح ملائم بنانے پر توجہ دیجئے۔

روز رات کو اور صبح اپنی جلد کو **پانڈس کولڈ کریم** سے صاف کیجئے یہ ایک مشہور کریم ہے جسے تمام دنیا کی عورتیں استعمال کرتی ہیں اسے انگلیوں سے اپنی جلد پر نفاست کیساتھ لگائیے اور کچھ دیر رہنے دیجئے تاکہ مساموں میں جو چکنا پن اور میل جمع ہوگیا ہے وہ نرم ہوجائے پھر کسی ملائم کپڑے یا پانڈس کے خاص کپڑے سے پونچھ ڈالئے اس کے بعد دوبارہ کریم لگائیے اب ذرا آئینے میں اپنا چہرہ دیکھئے کتنا تر و تازہ اور چمکدار نظر آتا ہے۔

دن میں دھوپ آندھی اور گرد و غبار سے جلد کو محفوظ رکھنے کے لئے **پانڈس وانشنگ** (جذب ہونیوالا) کریم استعمال کیجئے یہ ہر قسم کا بھدا پن دور کردیتا ہے اور جلد کو نفاست کیساتھ پاؤڈر قبول کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔

پانڈس کریمیں باقاعدہ پندرہ یوم تک استعمال کیجئے۔

آپ دیکھیں گی کہ آپ کے چہرہ کا رنگ روز بروز نکھرتا ہی جارہا ہے اور اس میں ملائمت دلکشی اور شباب کی چمک دمک پیدا ہوتی جارہی ہے۔

پانڈس کریمیں ہر بڑے دکاندار سے حاصل کیجئے یا **پانڈس** پوسٹ بکس ۴۴ بمبئی کو لکھکر منگائیے۔

پانڈس کولڈ کریم جلد کو اچھی طرح صاف کرتا اور ملائم رکھتا ہے۔
روز رات کو اور صبح باقاعدہ استعمال کیجئے۔

Regd No. B 4013

Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works Sankli Street Byculla Bombay 8

TANVIR
MONTHLY
BOMBAY-8

BEGUM HAMID ALI SAHIBA
(President All India Women's Conference Association) Held at Allahabad.

Read her Presidential speech delivered at the 14th session of the association, in this issue.

تب
اُف - اوہ!
"میں گٹھیے کے مرض سے صحتیاب ہونے کی تمام اُمیدوں کو
خیر باد کہہ چکی تھی، یہ مرض ایکدم ہی شروع ہوجایا
کرتا تھا - اور مجھے بستر پر لیٹنا پڑتا تھا - میں نے
اس کیلئے ہر چیز کو آزمایا - لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا"
اب
آہا - ہاہا
"ایکدن میں ایک دوافروش کے یہاں گئی - وہاں مینے ایک گراہک کو گٹھیے
کیلئے کروشن سالٹ مانگتے ہوتے سنا پس مینے بھی اسے خریدنے کا
فیصلہ کرلیا - اُسدن سے پھر مجھے اس مرض کی تکلیف نہیں ہوئی گٹھیے کا
درد کم ہوتا گیا - اور اب میں بالکل اچھی ہوگئی ہوں" کروشن کے اندر خاص
نمک ہوتے ہیں - جنکا اثر بہت جلد یورک ایسڈ کرسٹلز پر ہوتا ہے
یورک ایسڈ کرسٹلز ہی گٹھیے کے درد کا بنیادی سبب ہوتے ہیں
(۱) کرسٹلز کے تیز کنارے پگھل جاتے ہیں اور یہ کرسٹلز ایک پتلی سی چیز
بنکر جسم سے خارج ہوجاتے ہیں - کروشن سالٹ گٹھیے کو ختم کر دیتا ہے اور
مستقل طور پر مکمل صحتمند بنا دیتا ہے -
کروشن سالٹ آپکو بازار میں تمام انگریزی دوافروشوں و دیگر اسٹورز میں مل سکتا ہے.
کروشن سالٹ کا شکریہ
KRUSCHEN SALTS
KRUSCHEN
SALTS

ماہنامہ تنویر بمبئی

شرح چندہ
سالانہ ..... للعہ
قیمت فی پرچہ ۴ر
لوکل ۳ر
ممالک غیر سے دس شلنگ

مدیرہ:۔ سحر
نائب مدیرہ:۔ انوری خانم

جلد ۴ — شمارہ ۵

فہرست مضامین ماہ مئی سنہ ۱۹۴۰ء

اظہار تشکر

ہم اپنے اُن تمام ہمدرد اور مہربان خریداروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو تنویر کے نہ صرف مستقل خریدار ہیں بلکہ اسکے معاون اور مددگار بھی ہیں۔ جنہوں نے اس ماہ اپنا چندہ پیشگی بذریعہ منی آرڈر اور وی پی مرحمت فرمایا اور ساتھ ہی اپنے تنویر کیلئے ایک ایک، دو دو، اور تین تین نئے خریدار بھی دئے۔ ایسے ہی روشن طبع۔ اصلاح پسند اردو نواز اور آزاد خیال بہنوں اور بھائیوں کے اشتراک عمل، حمایت اور اعانت سے تنویر زندہ ہے۔ اگرچہ جنگ کیوجہ سے اس کی دلکشی اور ضخامت پر بھی اثر پڑے بغیر نہ رہ سکا۔ لیکن یہ چیز عارضی ہے انشاءاللہ موقعہ پاتے ہی اسکی ضخامت میں اضافہ دلکشی اور معیار میں ترقی کر دیجائیگی۔ اور یہ اپنے قدردان اور ہمدرد معاونین جنہوں نے اسکا برے وقت میں ساتھ دیا ہے انکی خدمت پہلے سے زیادہ شاندار طریقے پر انجام دے گا۔ (ادارہ)

تحسین تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی نمبر ۸ سے شائع کیا۔

خوشبودار
ٹاٹا کے ناریل کے تیل کے شمپو سے دھوئے ہوئے بال پھولوں
کی طرح خوشبودار ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایکدفعہ استعمال سے
آپکے بالوں میں ایک نئی خوبصورتی پیدا ہو جائیگی اور وہ گھنے اور
نرم ہو جائینگے۔ آج ہی یہ پُر لطف شمپو خرید لیجئے:۔
Tata
TATA
TOMCO
TOMCO
COCOANUT
OIL
SHAMPOO
ٹاٹا کا بنایا ہوا بالوں کی آرائش کا سامان سب ہی دکانوں پر ملتا ہے اور ہمیشہ مندرجہ ذیل پتہ پر:۔
ٹامکو سیلز ڈیپارٹمنٹ۔ پی او بکس ۵۲۸ بمبئی
دی ٹاٹا آئیل ملز کمپنی لمیٹڈ۔ ٹاٹا پورم اور بمبئی

صحت مند اور خوش باش
بچے
گلیکسو پر پرورش پاتے ہیں
گلیکسو دودھ کی وہ غذا ہے جس پر آپ ہمیشہ بھروسہ کر سکتے ہیں
آپکے ننھے بچے کی صحت بالکل دودھ پر منحصر ہے۔ اسلئے صرف بہترین
دودھ ہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ اور بچوں کی بہترین غذا گلیکسو ہے دنیابھر کی
عقلمند مائیں اپنے بچوں کو گلیکسو پر ہی پرورش کرتی ہیں۔ کیوں؟ اس کا
جواب یہ ہے کہ گلیکسو غذائیت سے بھرپور خالص دودھ ہے جو
بچوں کے ہی استعمال کیلئے خاص طور پر پاؤڈر کی شکل میں بنایا گیا ہے
اور اس میں تمام پرورش کرنیوالے اجزاء شامل رہتے ہیں گلیکسو سے
بچے مضبوط اور صحتمند ہوتے ہیں اس کے استعمال سے نازک سے نازک
ترین معدہ بھی خراب نہیں ہوتا۔ اگر آپ آج ہی سے اپنے بچے کی پرورش
گلیکسو پر کرنے لگیں تو آپ نہ صرف اپنے آپکو قطعی طور پر بچے کی
خوراک کے متعلق تفکرات سے نجات دینگے بلکہ بچہ کی صحت کا بیمہ بھی کرینگے
ہمیشہ جب آپ گلیکسو کا ڈبہ خریدیں تو یقین رکھیں کہ آپ بچے کیلئے بہترین
خوراک خرید رہے ہیں گلیکسو کے استعمال میں کفایت بھی ہے کیونکہ اس میں سے
ذرہ بھر بھی ضائع نہیں ہوتا آپ حسب ضرورت استعمال کر سکتے ہیں۔ لہذا
خیال رکھیں تاکہ اب جب آپ اپنے بچے کی خوراک خریدیں تو یہی ٹین خریدیں
گلیکسو کا طریقہ
گلیکسو اعلیٰ نسل کی بہترین چارہ کھانیوالی انعام یافتہ گایوں کے دودھ کو ماہرین کی زیر نگرانی خاص طریقہ پر بنایا جاتا ہے
گلیکسو کیلئے گایوں کا دودھ نئے ہائجینک طریقہ سے نکالا جاتا ہے جو جراثیم سے مبرا اور خالص ترین ہوتا ہے۔
گلیکسو دوران تیاری میں کسی وقت بھی ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا اور سو فیصدی محفوظ طریقہ پر بند کیا جاتا ہے
پرانا طریقہ
معمولی دودھ اکثر کمزور گایوں کا ہوتا ہے اسلئے آپکے بچے کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔
دودھ دوہنے کا معمولی طریقہ پرانا طریقہ ہے جو گندا اور خطرناک ہے ایسے دودھ میں اکثر جراثیم ہوتے ہیں۔
عام طور پر یہ دودھ اکثر غیر صاف برتنوں میں گرد و غبار میں رہنے سے بچوں کیلئے مضر ہوتا ہے۔
گلیکسو
Glaxo
ہندوستان میں کافی اسٹاک موجود ہے۔ اسلئے اسٹنڈرڈ قیمتوں پر کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔
ننھے بچوں کیلئے بہترین دودھ کی غذا ہے
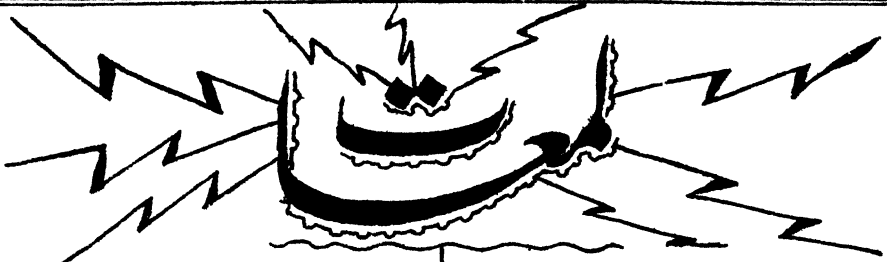
مسلمانوں کیلئے لمحۂ فکریہ

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور کی تجاویز اور اس کے صدر مسٹر جناح کے خطبۂ صدارت پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ مگر ہم اسے بے سود سمجھتے ہیں۔ اسلئے کہ مسٹر جناح اور تمام مسلم لیگی بھائی بہرحال ہمارے بھائی ہیں۔ وہ ہم سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ ہمارے ان کے مفاد، اور نقصان، قطعی طور پر ایک ہیں۔ یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ ایک جماعت غیروں کا آلۂ کار بنکر اپنے نقصان پر آمادہ ہے۔ اس کیلئے وہ قابل رحم ہے نہ کہ قابل نفرت، اور ہمنے جب بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی ہے محض اسلئے کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں اور اسلام کی روشن روایات پر کلنک لگتا ہے۔ اور وہ دنیا میں بُری طرح سے بدنام ہو رہے ہیں۔ آزادی کی رَو تو رُکنے والی نہیں ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں نے آزادیٔ وطن کیلئے دوسری اقوام سے کسی طرح کم قربانیاں نہیں کی ہیں۔ تحریک آزادی کی ابتدا میں جبکہ اس کا صلہ صرف مصائب تھا مسلمانوں نے اہل وطن کا ساتھ دیا۔ کونسی وہ جگہ ہے جہاں آزادیٔ وطن کیلئے ہندوستان کی دوسری اقوام کا خون بہا ہو اور اس میں مسلمانان ہند کا خون شامل نہ ہو قید و بند کی صعوبتیں نہ جھیلی ہوں تو اب آخر وقت میں جبکہ منزلِ آزادی قریب ہے۔ مسلمان کس طرح تحریکِ آزادیٔ وطن سے الگ رہیں؟ طرّہ یہ کہ اپنے لئے یہ کہلانا پسند کریں کہ "ہندوستانی مسلمان آزادیٔ وطن کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں اور برطانوی غلامی کے حامی ہیں"۔ ہندوستان سے باہر کے مسلمان مثلاً ٹرکی، عرب، ایران، افغانستان، مصر، فلسطین، عراق و شام وغیرہ کے مسلمان بھی ہندوستانی مسلمانوں کی "غلامی پسندانہ روش" کیوجہ سے ان سے نفرت کرتے ہیں۔ اور اس کا ثبوت اُن معتبر مسلمانوں کے "بیانات" ہیں جو ان ملکوں میں وقتاً فوقتاً جا چکے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ خود آزاد ہوں اور دوسروں کو آزاد کرائیں۔ نہ یہ کہ آزادی کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔ ہر مسلمان حق و صداقت کی راہ میں ایک جانباز سپاہی ہوتا ہے۔ کیا آٹھ کروڑ انسان ہندوستان کو آزاد کرانے کیلئے ناکافی تھے! ہندوستان کی آزادی کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھنا چاہیئے تھا اور آزادی کی نعمتیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے اہل وطن پر لُٹائی جانا چاہیئے تھیں۔ یہی اسلام اور مسلمانوں کے شایان شان تھا. مگر وائے بر حال ما ـــ کہ لیڈر بھی ملا تو ایسا جسنے مسلمانوں سے حوصلہ، شجاعت، اولوالعزمی، احساس برتری، سب کچھ چھین لیا اور وہی باتیں مسلمانوں میں بھی پیدا کر دیں جنکی شکایت دوسروں سے کیجاتی ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ تو "تنگدل ہے اسلئے ہم بھی تنگدل بنے جاتے ہیں"۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت اکثر انہیں ہندوستانی مسلمانوں میں پائی جاتی ہے جو دو تین پشت قبل مسلمان نہیں تھے۔ انکا بھی قصور نہیں ہے

یہ لوگ ورثے میں یہ عادات و اطوار لیکر آئے ہیں۔ مگر اسلام کی تابناک خصوصیات، شجاعت، حوصلہ، فراخدلی، اولوالعزمی اور مساوات انسانی کو ان عادات و اطوار کا شکار نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ اور اچھے خصائل کو برائیوں پر حاوی ہونا چاہیئے۔ اچھے خصائل ہر مذہب کی جان ہیں۔ جو قومیں اس سے دور جا پڑی ہیں ان میں قولاً عملاً ان کی تبلیغ کرنا چاہیئے۔ برائی کے جواب میں برائی اختیار کر لینے سے بُرائی دُور نہیں ہو سکتی۔

ہندو مسلمانوں کی معاشرت، تہذیب وتمدن، شاعری اور ادب کو علیحدہ علیحدہ کہنا لوگوں کی نگاہوں میں دھول جھونکنا ہے۔ مغلوں کے زمانے سے لیکر اس وقت تک ان دونوں قوموں نے مِل جُلکر ان سب کو ایک ہندوستانی سانچے میں ڈھال لیا ہے اور اب یہ چیزیں ان دونوں کی مشترکہ ہیں اور ہندوستانی کلچر کہلاتی ہیں۔ نہ یہ ٹھیٹھ "مہا بھارتی" زمانے کی یادگار ہیں اور نہ "عرب و ایران" کا نمونہ۔ ایک ہندوستانی مسلمان کا رہن سہن، زبان، خیالات، کھانا پینا، رسم و رواج شادی بیاہ، پیدائش، عرب و شام، مصر اور ایران کے مسلمانوں سے کہیں مختلف ہے بہ نسبت ایک ہموطن ہندو کے بلکہ صدیوں ساتھ رہنے سے یہ اس قدر خلط ملط ہو گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے عقائد تک پر گہرا اثر پڑا ہے۔ شادی بیاہ بھی ان دونوں قوموں میں ہوتے آئے ہیں۔ اور اب زیادتی پر ہیں۔ کھانا پینا بھی اکٹھا ہوتا ہے اور اگر بہت نہیں بھی ہوتا تو اب ہونا چاہیئے۔ کاروبار بزنس بیوپار سب مل جُلکر کرتے ہیں تو پھر صرف آزادئ وطن کے ہی سوال پر علیحدگی کا نعرہ لگا کر تفرقہ پردازی کیوں کیجاتی ہے۔ اور کیوں نہیں ننانوے فیصدی زندگی کے میدان میں اشتراک عمل کرتے ہوئے غلامی سے نجات پانے کیلئے سو فیصدی اشتراک عمل پر کاربند ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ننانوے فیصدی اشتراک عمل سے نقصان نہیں ہوتا، نہ مذہب کو خطرہ لاحق ہوتا ہے اور ایک فیصدی آزادی کے سوال پر مذہب کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے! اسی لئے ہمیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں"

ہندو مسلم سوال سے بڑھکر تو صوبجاتی سوال اہمیت رکھتا ہے لسانی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے بنگالی مسلمان ایک بنگالی ہندو کے ساتھ تو بآسانی زندگی بسر کر سکتا ہے مگر سرحدی مسلمان یا کاٹھیاواڑی مسلمان میں اجنبیت پائیگا۔ اسی طرح یوپی کے ہندو مسلمان آپس میں یکانگت محسوس کرتے ہیں۔ مگر پنجاب کی سرزمین پر انہیں ایک ایک سانس بیگانہ معلوم ہوگی۔ اسی طرح سرحدی ہندو گجراتی یا مہاراشٹری ہندو سے کبھی مانوس نہیں ہو سکتا اور انہیں ایک نئی دنیا کا آدمی محسوس کریگا۔ بہ نسبت ان کے سرحدی مسلمان کو اپنے سے قریب تر پائے گا پھر ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کی تقسیم کے بعد گجراتی مسلمان اپنے گجراتی کلچر، گجراتی زبان ادب و شاعری کو کیا پنجاب، صوبہ سرحد۔ یا بنگال میں ساتھ لیجائینگے۔ اور وہاں کی زبان اور کلچر کے برابر حقوق دلوا کر اس کی حفاظت کر سکیں گے؟۔

این خیال است و محال ست و جنوں

غرضکہ ہندو مسلم سوال پر ہندوستان کے ٹکڑے کرنا اس کی متحدہ قومی طاقت کو پارہ پارہ کر کے مخالفین کو قوت پہنچانا نہایت مضحکہ خیز، ناقابل عمل اور خودکشی کے مترادف ہے رہا اقلیتوں کا سوال وہ بھی اس اسکیم سے حل نہیں ہو سکتا۔

اس پر مفصل بحث تو ہم اپنی آئندہ کسی اشاعت میں کرینگے۔ سر دست یہ کہدینا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر اقلیتوں کے تحفظ کا سوال ہے تو اور اقلیتیں بھی یہ مطالبہ پیش کرینگی۔ مثلاً سکھ۔ پارسی عیسائی۔ یہودی۔ اینگلو انڈین۔ اچھوت' اور خود مسلمانوں میں سے شیعہ اور پھر خود مسلم ہندوستان میں ہندو اقلیتیں اور ہندو ہندوستان میں مسلم اقلیتیں بھی تو آخر اپنے اپنے حقوق کی حفاظت میں آ ایسے ہی مطالبات پیش کرسکتی ہیں۔ انہیں کس طرح حل کیا جائے گا؟ تو کیا پھر ان چھوٹی چھوٹی ملک کی اندرونی باتوں کیوجہ سے اتنے بڑے ملک کی آزادی معرض التوا میں پڑی رہیگی۔ اور ہندو مسلمان غلام ہی کہلانا پسند کرتے رہینگے؟ اور اگر اکثریت کے فائدے اور حقوق کا سوال ہے تو یہ سوال اٹھانا خود مسلمانوں کیلئے خطرے سے خالی نہیں۔ اگر اقلیت اپنی اکثریت کے فائدے کا سودا کرے گی تو اکثریت کیسے اپنے مفاد سے دست بردار ہو سکتی ہے۔ اسلئے سب سے بہتر یہی بات ہے کہ مل جلکر سیاسی طور پر ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کیجائے جس میں کوئی تفرقہ ڈالنے والا سوال ہی نہ اٹھے۔ یہاں کی تمام قومیں اپنی اپنی خصوصیات کے باوجود ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے ملکی نفع و نقصان میں برابر کی حصہ دار ہونگی۔ اکثریت اقلیت کو ناراض کرکے اور نقصان پہنچا کر خود کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکیگی۔ اسی طرح اقلیت اکثریت سے بیر رکھکر فائدے کی بجائے اپنا نقصان ہی کرے گی۔

ہمیں یہ ذہنی پستی ہرگز پسند نہیں ہے کہ ہندو مسلمان غلام بنکر تو اکٹھا اس ملک میں رہ سکتے ہیں مگر آزادی ایک ایسی لعنت ہوگی جو ان سے تمامتر انسانی خوبیاں چھین لیگی اور وہ مل جلکر نہ رہ سکیں گے۔ گویا ہندو مسلمانوں کو انسان بنائے رکھنے اور اتحاد کیلئے حکومت برطانیہ اور اس کا خوف ہمارے دلوں پر ضرور مسلط رہنا چاہیئے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ موجودہ ہندو دھرم اور اسلام کا ہی دوسرا نام "برطانوی حکومت" ہے جبتک یہ قائم ہے امن و امان ہے جب یہ نہ ہوگی تو ہندو مسلمان حیوان بنجائینگے۔ کیا یہ خیالات دائمی غلامی کا پٹہ نہیں ہیں۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ گورنمنٹ برطانیہ کی دست کشی کے بعد ہمیں خوف خدا نہیں رہیگا۔ غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد ہم خدا کے خوف' مذہب کے احکام' اور نیکی کی راہ سے بھی نجات حاصل کرلینگے اور پورے شیطان بنجائینگے تو کیا انسان بنائے رکھنے کیلئے "غلامی" ایک بڑی شرط ہے؟۔

خاکسار، حکومت پنجاب' اور مسلم لیگ

۱۹ر مارچ کو لاہور میں جو خونین واقعہ رونما ہوا وہ قابل افسوس ہے۔ حکومت پنجاب نے فوجی یا نیم فوجی نوعیت رکھنے والی تمام جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیدیا تھا۔ خاکساروں نے اس کی مخالفت میں جلوس نکالا۔ پولیس نے گولی چلائی اور گورنمنٹ کے اعلان کے مطابق "صرف" ۳۰ خاکسار ہلاک ہوئے۔

مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں خاکساروں سے ہمدردی کا ریزولیوشن پاس کیا اور گورنمنٹ پنجاب سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ اس واقعہ کی تحقیق کیجائے اور خاکساروں سے یہ پابندی اٹھالی جائے۔ اس کیلئے مسٹر جناح ایک یا دو بار سر سکندر سے ملے بھی اور بس۔ ہمیں اصولاً خاکسار جماعت کے

عقائد سے اختلاف ہے چونکہ اس جماعت نے آجتک نہ تو خدمت بنی نوع انسان کیلئے کوئی نمایاں کام کیا اور نہ آزادی وطن کی راہ میں کوئی سرگرمی دکھائی۔ نہ مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور مذہبی اصلاح کا کام کیا۔ ان کی تمام سرگرمیاں ایک محدود دائرہ کے اندر رہی ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہمیں لاہور کے حادثہ کا شکار ہونے والے خاکساروں سے دلی ہمدردی ہے۔ اور انکے جذبہ سرفروشی اور جانبازی کی داد دئے بغیر کوئی نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ جماعتی کاز کیلئے خواہ وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو اپنی جانیں دیدینا بذات خود قابل قدر فعل ہے۔ ہندوستانیوں میں "انفرادیت" حد سے گذر چکی ہے۔ اور یہی چیز ہماری قومی زندگی کے لئے سم قاتل ثابت ہوئی۔ خاکساروں کی جماعتی تنظیم اس کا رد عمل ہے۔

پنجاب گورنمنٹ بحالات موجودہ نیم ہندوستانی گورنمنٹ ہے جس کا وزیر اعظم ایک مسلمان ہے۔ کانگریسی نیم ہندوستانی حکومتوں کا عقیدہ تو خیر عدم تشدد کا تھا۔ اس سے تو یہ شکایت کی ہی نہیں جاسکتی کہ اس نے اہل وطن کی فوجی تعلیم کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھایا مگر پنجاب گورنمنٹ سے بجا طور پر یہ شکایت ہوسکتی ہے کہ اپنے اہل وطن کو فوجی تعلیم و تربیت دینا تو درکنار اس سے یہ بھی برداشت نہ ہوسکا کہ ہندوستانیوں کو فوجی ترتیب میں چلتے ہوئے بھی وہ دیکھ سکے۔ کیا یہی ہندوستان کی خدمت اور حفاظت کے طریقے ہیں؟ یہ نہیتے ہندوستانیوں کو سوا چھ انچہ کا چاقو بھی ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں ہے۔ کیا مسلح غیر ممالک کے حملوں سے ہندوستان کو بچانے کیلئے مٹھی بھر انگریز کافی ہیں؟ یا وہ سینکڑوں کی تعداد میں بزدل کمزور نہتے بے غیرت ہندوستانی جو ایک انگریز سارجنٹ کی گالی سنکر حضور حضور کہکر گھگیانے لگتے ہیں ہندوستان کی حفاظت کے موقعہ پر کارآمد ثابت ہونگے؟

آج جبکہ تمام دنیا اور خود برطانیہ نئے نئے ہتھیاروں اور طاقت کے بل بوتے پر ہی اپنی زندگی کا انحصار سمجھ رہی ہے ہندوستانی عوام کو ہتھیاروں کے استعمال اور فوجی تربیت سے کیوں محروم رکھا گیا ہے؟ برطانیہ ہندوستانیوں کی دوست ہے تو اسے ہندوستانیوں کو اس قابل بنا دینا چاہیئے تھا کہ وہ اپنی زندگی کیلئے دوسروں کے محتاج نہ رہتے۔ اور آج جبکہ برطانیہ خود اپنی مشکلات میں مبتلا ہے ہندوستانیوں کی حفاظت کے بارے سبکدوش ہوتا۔ اور اس صورت میں اپنی ساری طاقتیں اپنے یورپین مخالفین سے فتح حاصل کرنے میں صرف کرتا۔

اب رہا مسلم لیگ کا سوال ہم صرف یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر یہی لاہور والا خاکساروں کا واقعہ کسی کانگریسی صوبے کی حکومت میں ہوتا تو کیا یہی نرم رویہ مسلم لیگ اختیار کرتی؟ ہرگز نہیں۔ تمام ہندوستان کے ناسمجھ مسلمانوں کو بھڑکا کر کانگریسی حکومت کے خلاف طومار باندھ دیا جاتا۔ اور اس سے پہلے لکھنؤ میں کیا نہیں ہوچکا۔ خود علامہ مشرقی اور خاکساروں نے یوپی گورنمنٹ پر یورش کر ہی دی تھی۔ اور اس قدر زبردست خونین حادثہ جب سر سکندر کی حکومت میں ہوا تو علامہ مشرقی نے بھی ان مجاہد خاکساروں کی حمایت میں ایک لفظ تک نہیں کہا۔ کیا یہ انصاف ہے؟ مسلمانوں کے کیریکٹر میں یہ کمزوری نہ معلوم کہاں سے آگئی ہے کہ وہ بھی تنگدلی اور تعصب کا شکار بنگئے۔ یہ خرابی تو ان کے غیر تک میں تھی۔ چونکہ دنیا میں کسی بھی بہادر اور سچی قوم کے پاس تنگدلی اور تعصب پھٹک نہیں سکتے۔

شکر ہے کہ کسی کانگریسی حکومت میں ایسا خونین حادثہ نہیں ہوا۔ اسلئے اس واقعہ کی روشنی میں نہ مسٹر جناح کا

منہ ہے نہ حامیان مسلم لیگ کا اور نہ علامہ مشرقی کا کہ وہ کانگریس حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی کہہ سکیں۔ کیونکہ اتنا بڑا ظلم آجتک کسی کانگریسی حکومت نے مسلمانوں پر نہیں کیا اور اگر کرتی تو یقیناً قابل نفرت قرار دی جاتی۔

دنیائے انسانیت کا نقصان عظیم

مسٹر سی ایف اینڈریوز کے انتقال کی خبر کو محبت انسانیت کے حامیوں نے اندوہ وقلق کے ساتھ سُنا۔ مرحوم اگرچہ انگلستان کے مایۂ ناز فرزند تھے لیکن ان کی ذات والا صفات پر تمام دنیا کو فخر تھا۔ وہ دنیا کے ہر گوشے کے انسانوں کو پیارے تھے اور ہر انسان انہیں اپنا سمجھتا تھا۔ چونکہ نوع انسانی کی خدمت میں آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی۔ ہندوستان سے آپ کو خاص طور پر اُنس تھا۔ اور آپ سچے دل سے اس کی آزادی اور بہبودی کے حامی تھے۔ اس کی بہتری کیلئے آپ کی کوششیں یادگار بنی رہینگی۔ مذہب کی عظمت بھی آپ ایسی برگزیدہ ہستیوں کے روشن اور نیک اعمال سے قائم ہے آپ ایک سچے عیسائی تھے اسلئے سچے یورپین اور سچے انسان تھے آپ کی زندگی مذہب کے حامیوں کیلئے ایک نمونہ بننی چاہیئے۔

آزاد مسلم کانفرنس

ہر سچا ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان پارسی ہو یا عیسائی سکھ ہو یا اینگلو انڈین مادر وطن کی آزادی کیلئے بیقرار ہے اور اپنا سب سے پہلا فرض یہ سمجھتا ہے کہ غیر ملکی حکومت کا طوق غلامی اپنے گلے سے اتار پھینکے۔ چونکہ ہندوستان کی آزادی مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھینی گئی ہے اسلئے قدرتی طور پر مسلمانوں پر اسے آزاد کرانے کی ذمہ داری زیادہ عاید ہوتی ہے اور چونکہ وہ حال ہی میں غلام بنے ہیں اسلئے انہیں احساس غلامی زیادہ ہے اور وہ ہندوستان کو آزاد کرانیکی کوشش میں ہندو بھائیوں سے کسی طرح پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔ آزادی کی اس جدوجہد میں دونوں اقوام کے شاندار اتحاد و اتفاق اور کارناموں کی مثالیں ملتی ہیں۔ مگر انکا کبھی تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ برعکس اسکے یہاں کے باشندوں کے برائے نام اختلافات کو "نفاق" کا نام دیکر دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اس زمانے میں بھی ہندوستانی اپنے بُرے بھلے کو نہیں سمجھتے۔ اور جانوروں کی طرح آپس میں لڑکر اپنے مفاد کو ہاتھ سے کھو دیتے ہیں اور تماشا یہ کہ یہاں تو لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی برتی جاتی ہے۔ اور وہاں بیٹھے ہوئے ہمیں اتحاد و اتفاق کی تلقین کیجاتی ہے۔

چنانچہ ہندوستان میں جب سے "آزادئ وطن" کی صدا بلند ہوئی ہے اسی وقت سے اس کا اثر زائل کرنے کیلئے ہندو مسلم سوال پیدا کیا گیا اور جب جب ہندوستان میں تحریک آزادی نے زور پکڑا اس کے فوراً بعد ہی ہندو مسلم فساد ہوتے پائے گئے۔ آزادی کی آواز سے پہلے کسی نے "ہندو مسلم سوال" کا نام بھی نہ سنا تھا اسی لئے حقیقت بین نظریں اس سوال کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں اور اسے کوئی اہمیت نہیں دیتیں یورپ میں لڑائی شروع ہونے سے سال ڈیڑھ سال پہلے ہی ہندوستان کو غلامی کی گرفت میں رکھنے کیلئے یہاں اس سوال کو کافی اہمیت دی گئی تھی تاکہ عین وقت پر یہی بہانہ "کام آ سکے اور ہندوستان کی آزادی کو التوا میں ڈالدیا جائے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اس سے ساری دنیا میں یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ ہندوستانی مسلمان غلامی کے حامی اور آزادی کے مخالف ہیں۔ ایک آزادی کی دلدادہ قوم اغیار کی ان سیاسی چالوں کا شکار اپنی غیرت اسلامی اپنی عزت وطنی اور اپنے جذبۂ سرفروشی کو بآسانی نہیں ہونے دے سکتی۔ اس قوم نے ہندوستان کی مٹی کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہاں کے تہذیب تمدن کو سنوارا ہے انہوں نے ہندوستان پر غیر ملکیوں کی طرح حکومت نہیں کی ہے بلکہ خود اس کے ہوگئے ہیں اور اسے اپنایا ہے۔ آج ان کی ساری قربانیوں اور محنتوں پر پانی پھیرا جا رہا ہے وہ اسے گوارا نہیں کرسکتے۔ اسی لئے ضرورت تھی کہ سچے ہندوستانی مسلمان اجتماعی طور پر دنیا کی اس غلط فہمی کو دور کریں جو انہیں رسوائے عالم کر رہی ہے۔ آزاد مسلم کانفرنس اسی لئے منعقد کی گئی ہے کہ دنیا یہ آواز بھی سن لے کہ مسلمان سچے دل سے آزادی کے حامی ہیں۔ غلامی سے انہیں نفرت ہے وہ ہر وقت ہر موجودہ غلامی کے خلاف علم جہاد بلند کرنے رہینگے۔ خدا کرے یہ کانفرنس اپنے نیک مقاصد میں کامیاب ہو۔

تار کا پتہ "میڈی سنز" ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب رئیس اعظم دہلی کا عطیہ

اکسیر زنان

وہ عورتیں جو شرم کیوجہ سے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتیں اور ماہواری اور سفید رطوبت کی تکالیف برداشت کرتے کرتے گھل جاتی ہیں ان کیلئے "اکسیر زنان" پیام زندگی ہے۔ لاکھوں عورتیں اس سے صحت اور تندرستی حاصل کر چکی ہیں۔

مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب بہادر کے خاص مجربات سے ہے۔ ماہواری کی بیقاعدگی ہمیشہ کیلئے دُور ہو جاتی ہے اور اس کیوجہ سے جو سفید رطوبت وغیرہ کی شکایات رہتی ہے اسکو قطعی طور پر بند کر دیتی ہے اور جسم کے جوڑ جوڑ کو مضبوط کرتی چہرہ کی رونق کو بڑھاتی اور حسن و خوبصورتی میں چار چاند لگانیوالی ایک سستی دوا ہے۔

جبکی ان خوبیوں کے باوجود بیس خوراک کی ایک شیشی کی قیمت صرف ۹ ر ہے۔

ایام حمل و حیض میں یہ دوا استعمال نہیں کیجاتی۔

ضروری اطلاع:۔ پبلک کی اطلاع کیلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہمارا دوا فروخت کرنیوالا ایجنٹ کسی شہر میں نہیں ہے اسلئے بعض شہروں میں جو لوگ اس نام سے کام کرتے ہوئے پائے جائیں انکو ہمارا آدمی تصور نہ کیا جائے اور نہ ایسی دواؤں کو معتبر سمجھا جائے۔

پتہ ملنے کا:۔ **منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر (۲۲) دہلی**

غزل

از حضرت فراق گورکھپوری ایم۔ اے

کوئی ساتھ نہیں دیتا ہے
اے دل کس کا کون ہوا ہے

درد محبت اُٹھا اُٹھا ہے
رنگ محبت اُڑا اُڑا ہے

کیا دھرا سب کچھ ترا ہے
مفت مجھے بدنام کیا ہے

عشق میں جھوٹ کا کب رونا ہے
مَیں سچا ہوں۔ تو سچا ہے

ذرۂ صحرا قطرۂ دریا
تنگی کیا ہے وسعت کیا ہے

بے لنگر ہیں اب زنجیریں
ایک بار ہمت کرنا ہے

دنیا کو تو دھوکا سمجھا
سب سے بڑا ہی دھوکا ہے

نیند سی آئی جاتی ہے دل کو
یاد تری یا ٹھنڈی ہوا ہے

دُکھی ہوئی بھی رچی ہوئی بھی
میری صدا؟ یا تیری صدا ہے!

جینا درد علاج بھی جینا
مر جانے سے کیا ہوتا ہے!

شغل محبت ترک محبت
دونوں کا حاصل پچھتانا ہے!

ایک محبت سو افسانے
ایک حسن لاکھوں جلوہ[1] ہے

تجھ سے بچھڑ کر صبر ہے لیکن
اِن باتوں سے کام چلا ہے!

حضرت دل مہلک ہے وہ کوچہ
جاؤ مجھکو کیا کرنا ہے

---

[1] یہ روزمرہ کی مثال ہے جیسے کہیں وہاں لاکھوں آدمی تھا۔ آتش کا مشہور مصرعہ ہے۔ ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔

عمر محبت میں یہ بتا دے — کب ہنسنا ہے کب رونا ہے
دیر ہی دیر ہوئی ہے اُسے بھی — جانے دے اسکو اگر ایسا ہے
عالم عالم حسن ہے تیرا — ذکر ترا دنیا دنیا ہے
صحرا صحرا وحشت تیری — شوق ترا دریا دریا ہے
اتنی نرمی اتنی ٹھنڈک — موجِ نگاہ کہ بادِ صبا ہے
شکوۂ جور سے روٹھ گئے کیوں — میں نے کسی کا نام لیا ہے
جاگتی دُنیا سوتی دُنیا — کچھ ہے حقیقت کچھ سپنا ہے

رہتی دنیا جاتی دنیا
تو ہی بتا دے فراق کہ کیا ہے

کیفِ جاوید

از جناب پرنس جاوید قصری صاحب

بہتر تو یہی تھا کہ مجھے پیار نہ کرتے — اور پیار کیا تھا تو گنہگار نہ کرتے
ہر حسرتِ پژمردہ کو بیدار نہ کرتے — تم پیار نہ کرتے اسے تم پیار نہ کرتے
خلوت میں ہی شکوہ کا مری جان مزا تھا — اظہارِ تمنا سرِ بازار نہ کرتے
دعوائے محبت پہ پشیمان نہ ہوتے — اقرار کیا تھا تو پھر انکار نہ کرتے
منظور نہ تھی تمکو اگر میری محبت — ہر لطف کو ہر کیف کو بیدار نہ کرتے
اے کاش دکھاتے نہ مجھے حسن کے جلوے — سوتے ہوئے جذبات کو ہشیار نہ کرتے

مجھ سے ہی محبت تھی اگر تمکو محبت
لازم تھا کسی اور کا دیدار نہ کرتے

آل انڈیا ویمنز کانفرنس ایسوسی ایشن

میں

محترمہ بیگم حامد علی صاحبہ کا خطبۂ صدارت

آل انڈیا ویمنز کانفرنس ایسوسی ایشن منعقدہ الہ آباد کے چودھویں سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مسز حامد علی صاحبہ نے ضروریات ملکی اور قومی پر جس قابلیت سے روشنی ڈالی ہے اس سے خواتین ہند کا سر فخر و مباہات سے بلند ہو جاتا ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کے امن و امان کا انحصار صرف خواتین کی ذات پر ہے۔ خواتین کو میدان عمل میں آکر اب دنیا کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے چونکہ تجربہ بتلاتا ہے کہ بیرونی دنیا کے کام بھی اب خوش اسلوبی سے انجام دینا مردوں کے بس کی بات نہیں رہی ہے۔ اس وقت انہیں عورتوں کی رہنمائی کی سخت ضرورت ہے۔ مرد کی جنگجویانہ فطرت نے بنی نوع انسان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ کر انسانیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے ہیں۔ عورت ہی ایک ہستی ہے جسکی سرشت میں محبت اور رحم بدرجہ اتم موجود ہے اور وہ دنیا کو سنوارنے اور رشک فردوس بنانے پر پوری طرح قادر ہے۔ اسے ساری دنیا کو ایک خاندان اور انسانوں کو بھائی بھائی بنا دینے میں اپنی طاقتیں صرف کر دینا چاہئیں ؛

(مدیرہ)

مَیں کن لفظوں میں آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپنے مجھ جیسی ناچیز ہستی کی عزت افزائی کی اور مجھکو اس سبھا کا صدر بنایا جو ہندوستان کی قومی انجمنوں میں سب سے ممتاز سمجھی جاتی ہے۔ ہماری سبھا عورتوں کی سبھا ہے۔ اس بات سے مجھکو اور بھی فخر ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارا کام سیوا کرنا ہے اور ہم کسی اپنی غرض سے کام نہیں کرتے۔ ہمارے ایسوسی ایشن کی کارگذاری سے ہندوستانی دنیا اچھی طرح واقف ہے اور اس کی قدر دن دونی اور رات چوگنی ہو رہی ہے ہمنے قومی اصلاح کی جو کوششیں کیں اُن کی داد اب ہمیں مِل رہی ہے۔ حکومت بھی اب ہمارے ممبروں کو موقع دیتی ہے کہ اپنے اپنے ذاتی تجربہ، علم اور دلیش بھگت صفتوں سے فائدہ پہنچائیں۔ صوبوں کی حکومتیں اور قومی انجمنیں ہماری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہیں اور دیس کے مسئلوں کو طے کرنے میں ہماری مدد لیجاتی ہے۔ ہمیں اس پر ناز ہے کہ راجکماری امرت کور سنٹرل بورڈ آف اڈیوکیشن کی ممبر ہیں اور رانی راجواڑے نیشنل پلاننگ کمیٹی کی عورتوں کی شاخ کی سبھاپتی ہیں۔

کام کی تقسیم کانفرنس کا کام اب بہت پھیل رہا ہے۔ پہلے کی بہ نسبت ہماری سب کمیٹیوں کی

گنتی بڑھ گئی ہے۔ ہر صیغہ (سب کمیٹی) کیلئے ایک خاص ماہر بیوی مقرر کی جاتی ہیں۔ جن کا کام ہے کہ اپنے مضمون سے خوب واقف ہو جائیں اور اپنی معلومات سے کانفرنس کی رہنمائی کرتی رہیں ہمیں ان کی سمجھ اور تمیز پر پورا پورا بھروسہ رہتا ہے۔ انہیں کے مشورہ سے ہم خاص خاص کام اٹھا لیتے ہیں۔ اس طرح سے ایسوسی ایشن کا کام بٹ گیا ہے۔ اور کام کی مناسب تقسیم کرنا دور اندیشی اور عقلمندی کا ثبوت ہوا کرتا ہے۔

عورتوں کی حیثیت

قومی مجلسوں میں عورتوں کا داخل ہونا کار آمد ثابت ہوا ہے۔ اس سے ہم میں ایک طرح سے جان پڑ گئی ہے۔ عورتوں کی حالت کا سب کو پتہ چل گیا ہے۔ ہم یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ ان کی حالت کچھ بہت بہتر ہو گئی ہے مگر پہلے کی سی لاپروائی تو اب نہیں برتی جا رہی ہے۔ بعض صوبوں کی کونسل اور اسمبلی میں عورتوں کی حق تلفی کو دور کرنے کے لئے بل پیش کئے گئے ہیں۔ ہمنے برابر ان بلوں کی تائید کی جو ہمارے خیال میں جدید زمانے کے مناسب تھے۔ جن سے عورتوں کے حق اور ان کی حیثیت بڑھتی تھی۔ جہاں کچھ ترمیم کرنا لازم تھا وہاں ہمنے ترمیمیں بھی پیش کیں۔ مگر سب کچھ دیکھتے ہوئے ابتک ہماری کوششیں بے سود رہی ہیں۔ اب بھی ہندو عورتوں کے حقوق کم سے بھی کم ہیں۔ اور باقی عورتوں کو بس کہنے کو حق حاصل ہیں۔ نیک ارادوں کو عملی جامہ پہنایا جائے تو ہم سمجھیں کہ کچھ ہوا ہے۔ نہ جانے ہندوستانی مردوں کو اس بات کا کب یقین ہوگا کہ جبتک عورت غلامی میں رہے گی وہ خود بھی غلام ہی رہینگے جسمانی غلامی نہ رہی تو دل اور دماغ کی غلامی اس زمانہ تک رہے گی جبتک کہ ہماری عورتیں آزاد اور خودمختار ہستیاں نہ مان لیجائیں۔

آخر اوروں سے حقوق مانگنے کا کیا مطلب۔ جب ہندوستانی اپنی عورتوں کو اپنے برابر ماننے سے پہلو بچاتے ہیں۔ اپنے مکان کو تو ڈھنگ سے سجالیں پھر بعد میں اوروں کو نصیحت کریں عورتوں کی دنیا آدھی دنیا ہے۔ مرد کیا خاک بنالیں گے جبتک کہ وہ اس آدھی نسوانی دنیا کو انصاف سے اُس کا حق نہ دیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ ابھی پچھلے سال یعنی سنہ ۱۹۲۹ء میں دہلی کی اسمبلی میں بڑا بھاری مباحثہ ہوا تھا۔ ایسی حالت میں جبکہ ہندوستانی عورتوں کے تمام جائز حقوق چھین لئے گئے ہیں، اسمبلی میں اس پر بحث کی گئی کہ آیا ایک کمیٹی مقرر کیجائے جو چھان بین کرے اور کم ازکم قانون نے عورتوں کے جو حقوق مار لئے ہیں وہ پھر دیدئے جائیں۔ اس بحث کا انجام کیا ہوا!

مجھے شرم آتی ہے اس کا اقرار کرتے ہوئے کہ ہمارے ہندوستانی بھائی جو کونسل میں تھے (سوائے چند انصاف پسند شخصوں کے) اس معاملے کو مذاق اور دل لگی کی بات سمجھ بیٹھے اور حکومت کی طرف سے بہت کم ہمدردی اور واقفیت کا اظہار ہوا ہمنے ایک بہت وسیع کمیٹی بنانے کی خواہش ظاہر کی تھی جس کا کام یہ ہوتا کہ کُل ہندوستانی عورتوں کے چھنے ہوئے حقوق کا اندازہ کرکے بے انصافی اور ظلم کو دور کرنے کی صورتیں بتائے اسمبلی کی بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک چھوٹی سی سرکاری کمیٹی مقرر کی گئی جسے حکم دیا گیا کہ قوم کے ایک ہی فرقہ کی عورتوں کے متعلق تحقیق اور جانچ ہو اور وہ بھی سب مسئلوں کی نہیں صرف ایک ہی کی۔ ہمنے مانگی تھی روٹی اور ہمیں ملا پتھر! ہمارے ان اسمبلی کے بزرگوں کا برتاؤ ایسا تھا کہ واقعی اُسے بھولنا مشکل ہے۔ کیا یہ دل لگی کا موقعہ تھا؟ کیا یہ ہنسی مذاق میں اُڑانے والی باتیں تھیں!

ہمنے جس مسئلہ کو تمام عورتوں کا مسئلہ بنا کر پیش کیا تھا وہ

ان کی نظر میں صرف خاص عورتوں کا معاملہ بن کر رہ گیا۔ نا امیدیاں تو انسان کی قسمت ہی میں لکھی ہیں بلکہ عورتوں کے حصہ میں اس قدر لکھیں ہیں بقول غالب "ہم اُن کے خوگر ہو گئے" ہمیں صبر سے کام لینا چاہیئے اور اپنے مردوں کی تعلیم کا مسئلہ اب اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیئے۔ ان کو ایسی تعلیم دینا چاہیئے کہ وہ عورتوں کے معاملوں پر غور کرتے وقت عقل سلیم سے کام لیں۔ صرف تنگ قانونی اسپنکڑوں برس پرانی روایتوں پر عمل نہ کریں۔ مگر انصاف انہی لوگوں سے مل سکتا ہے جو بے غرض ہوں۔ یہاں انصاف کی کیا امید جب ایک آنکھ جیب کی طرف دیکھتی رہتی ہے اور فکر یہ ہے کہ جو لقمہ پورا ملتا تھا وہ آدھا نہ رہ جائے۔ مرد سوچتے ہیں کہ عورتوں کا مقدمہ پیش ہوا ہے اور انہیں ہر چیز میں آدھا حصہ ملنے لگا تو ہمارے ہاتھ سے دنیا کی ہر نعمت کا آدھا حصہ نکل جائیگا۔ تعلیم حاصل کرنے کے موقعوں کا، خدمت کا، حیثیت کا، حقوق کا، زر و زیور کا اور زمین کا۔ غضب خدا کا آفت ہی آجائے گی!

اصل بات یہی ہے۔ انسانی فطرت کمزور ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ حقوق نسواں کی طرف سے ہمارے مرد استقدر لاپروا اور بے فکر ہیں۔ لیکن مہذب زندگی ہمیں تبھی نصیب ہوگی جب ہر عورت کو اپنی زندگی سنوارنے اور بنانے کا موقع ملیگا آزادی سے روزی کمانے کے وسیلے ہونگے۔ وہ اپنے گھر کی مالک ہوگی اور وہ جب چاہے گی با اور چیخانے کی تنگ حکومت چھوڑ سکے گی، اپنی مرضی سے اولاد دنیا میں لائے گی یا نہ لائیگی اور اولاد کی پرورش میں باپ کے حق کے برابر ماں کو بھی حق ہوگا۔ تبھی قوم کو سچی عزت حاصل ہوگی۔ اور یہ کہنے کا موقع ہوگا کہ تمدن کی فضیلتوں سے بے بہرہ نہیں ہیں

ہمارے ملک میں اور خاصکر ہمارے گھروں میں ہمیشہ ہٹلر پیدا ہوا کئے ہیں۔ خدا سے دعا مانگو کہ اب ہر جگہ اور ہر قسم کی ہٹلری موقوف ہو جائے۔

جنگ

پہلی ستمبر ۱۹۳۹ء کو پھر جنگ چھڑ گئی اور خون کے دریا بہنے لگے۔ اب ایک ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے۔ جس میں دشمنی، کشت و خون، اوروں کے ملک میں دست درازیاں کرنا رواج پا گیا ہے۔ جھوٹ اور فریب نے سارے جہان میں اپنا سکّہ چلا دیا ہے۔ کسی ملک کے لوگوں کو چین کی نیند میسر نہیں ہے کہ نہ جانے صبح اٹھتے کیا دیکھیں گے۔ شاید سوتے سوتے کسی بڑے ملک کا شکار بن چکے ہوں۔ ہمنے اپنی نظروں کے سامنے دوست کو دشمن بنتے دیکھ لیا اور آن کی آن میں دشمن دوست بن بیٹھے۔ نہ امن رہا نہ امان رہا بس ہی ڈراونی دل دہلا نیوالی باتیں ہو رہی ہیں۔ جو ہمنے جنگ عظیم میں دیکھی تھیں۔ اس جنگ کے ختم ہونے پر ہمنے حماقت میں سمجھ لیا تھا کہ اب پھر ایسی آفت دنیا پر کبھی نہ آئے گی۔ یہ لوگ جو خونخوار درندوں کی طرح لڑ رہے ہیں خون بہانے سے عاجز آجائینگے اور دنیا کو اس مصیبت سے نجات مل جائیگی۔ مگر یہ کہاں ہماری قسمت آخری لڑائی کسی اصول کیلئے یا سچائی یا دیانتداری سے تو لڑی نہیں گئی تھی اس وقت دو چار ملکوں نے ملکر اور دو چار مخالف قوموں کو نیچا دکھایا، گھائل کیا، محکوم بنایا، ان کی عزت مٹی میں ملا دی۔ اب جبکہ اس وقت کی ہاری ہوئی قوم پھر زور پکڑنے لگی ہے تو اس کے دل میں دشمنی کی جو آگ سلگ رہی تھی وہ بھڑک اٹھی۔ آج اسی کا نتیجہ ہے کہ پھر جنگ چھڑ گئی ہے۔ اور وہ بدلہ لینا چاہتی ہے پھر وہی کشت و خون جاری ہو گیا ہے۔

اب ہمکو ایک مسئلہ طے کرنا ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ

کہ آیا یہ لڑائی کس اصول پر لڑی جا رہی ہے یا وہی حکمرانی کے مقصد سے پھر سارا قصہ شروع ہو گیا ہے اور پھر اسی طرح لوٹ مار ہوگی اور ڈنڈا کے پڑینگے۔ اوروں کے ملک چھین کر عظیم الشان حکومتیں اور نو آبادیاں قائم کی جائیں گی۔ جن پر خدا شاہد ہے کہ ایک کا حق ہے نہ دوسرے کا۔ زبردست خواہ مخواہ چھوٹے کمزور ملکوں کو جا دبوچتے ہیں۔ ہم ہندوستانیوں نے انگریزی حکومت سے ایک سیدھا سادہ سوال پوچھا ہے کہ "تم اپنی غرض سے لڑ رہے ہو یا اس غرض سے کہ سب مظلوم اور محکوم ملکوں اور قوموں کو آزادی مل جائے؟" یہ سوال بالکل بجا اور مناسب ہے۔ دنیا کے سب سچے اور ایماندار آدمی مانتے ہیں کہ ہندوستان کو یہ سوال پوچھنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ برطانیہ کے سیدھے سچے لوگ جانتے ہیں کہ ہمیں اپنا مقصد ظاہر کر دینا چاہیئے اور یہ بتا دینا چاہیئے کہ ہم کس اصول کی خاطر لڑائی میں شریک ہوئے ہیں۔ اور لڑائی کے بعد ہمارا رویہ کیا ہوگا۔ اگر لڑائی نازی حکومت کو ختم کرنے کیلئے اور جمہوریت کی خاطر ہو رہی ہے تو کیا ہر ملک سے وعدہ کیا جائے گا کہ جنگ کے بعد پھر کبھی تم پر ظلم کی تلوار اس بری طرح نہ گر سکے گی۔ جیسے کہ ابیسینا۔ البانیہ۔ چکوسلواکیا۔ آسٹریا۔ پولینڈ اور فنلینڈ پر ایک طرف گری اور چین پر دوسری طرف، کیا جنگ کے بعد سب ملکوں کے حقوق ایک سے ہوں گے۔ کیا ان کی حیثیت ایک سی ہوگی، یا یورپ پھر جھوٹے دعوے کریگا کہ ہم تمدن اور تہذیب میں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں؟

ان کے تمدن کی حقیقت کیا ہے یہ تو ایشیا اور افریقہ کے ہر ملک کو خوب معلوم ہے مگر یہ جھوٹے اپنے بڑے بول سے باز نہیں آتے۔ ان دعووں کو ہم بہت ہی حقارت سے سنتے ہیں اور از حد نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اگر یورپ والے جھوٹ اور فریب میں سب کے سردار ہونیکا دعویٰ کریں تو بیشک سچے مانے جائیں گے۔

دنیا کی دل لگی کا سامان

دنیا کو ہنسانے کا ارادہ کرکے ہنسانا بڑا کام ہے جس کیلئے مناسب قابلیت چاہیئے۔ لیکن بھولا پن بھی کبھی ہنسا کر چھوڑتا ہے۔ ایک بہت ہی سدھری ہوئی قوم جو اپنے کو آسمان کا تارا سمجھی ہوئی ہے وہ دنیا بھر میں شکایت کرتی پھرتی ہے کہ جس مظلوم قوم کو اس نے ستایا تھا اب وہ اس کے ساتھ "دوستانہ برتاؤ" نہیں کرتی اور اس کے ساتھ سچائی سے پیش نہیں آتی۔

اسی طرح ایک اور ملک کو شکایت ہے کہ اس کا شکار اب اس کی بات پر بھروسہ نہیں کرتا اس کا کہنا نہیں مانتا۔ اور اس کے قول اور فعل پر اعتبار نہیں کرتا۔ ایسی دل لگی کی باتوں سے ذرا دل بستگی ہو جاتی ہے۔ ورنہ دنیا پر غم کا پردہ سا پڑا رہتا ہے۔ ان ستم ظریفوں کا شکریہ ادا کیجئے کہ انہوں نے دنیا کو ہنسنے کا موقعہ دینے کیلئے اپنی جگ ہنسائی کرالی۔

نیا دستور (نیا کانسٹی ٹیوشن)

ہندوستان کی ہمات گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ صوبوں میں جو محدود سوراجی حکومت کا تجربہ کیا جا رہا تھا وہ یکایک ختم ہو گیا۔ اللہ جانتا ہے اب اور کیا ہوگا۔ اس ذرا سی مہلت میں بھی ہمارے معتبر وزیروں نے دیس پر اپنا سکہ جما دیا اور ہر صوبہ میں رعیت کے عام فائدہ کے لئے اس جوش سے کام شروع کر دیا کہ باید و شاید۔ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں قوم کی خدمت پر کبھی کسی حکومت نے اس طرح کمر

نہیں باندھی اور دوستی اور اعتبار کی ایسی فضا پیدا نہیں کی کہ انگلی اٹھانے والوں کی زبانیں بند ہوجائیں - اب یہ طعنہ نہیں دیا جاسکتا کہ ہندوستان کے مرد عورت سوراج کے قابل نہیں ہیں - ہمارا فرض ہے کہ صبر کو ہاتھ سے جانے نہ دیں اور اپنے لیڈروں پر پورا پورا بھروسہ کرتے ہوئے خاموش بیٹھے رہیں - جبتک کہ صلح اور امن کا راستہ نکل نہ آئے - مگر یہ خاص موقعہ عورتوں کیلئے قدرت نے پیدا کیا ہے کہ ملک کی رہبری کریں - مردوں کو دوستی اور صلح کا راستہ بتلائیں - ہمارا کام ہے رہبری کرنا کیونکہ ہم بے غرضی اور صاف دلی سے آپس میں دوستی اور ملاپ رکھنا چاہتے ہیں - ہمارے دلوں میں کوئی آرزو نہیں ہے بجز اس کے کہ ملک کی بہتری اور ترقی ہو یہی خیال ہمارے دل و دماغ میں بسا ہوا ہے -

بین الاقوامی تعلقات

ہمارا فرض ہے کہ ہم ان رشتوں کو مضبوط کریں جو صوبے اور قوم اور ملک کی بندشوں کو نہیں جانتے ' بس آدمی کو آدمی سے ملاتے رہیں - یہ ایک ایسی زبردست زنجیر ہے جس نے سب ملکوں کو اپنے حلقہ میں گھیر لیا ہے - اور دنیا کی مخلوق اس میں جکڑی ہوئی ہے - اس سلسلہ میں ہمنے انگلستان کے ساتھ برابر مراسلت قائم رکھی ہے - اپنی (LIAISON) سمبندھی کمیٹی کے ذریعہ سے ہمنے جنیوا کے ہمدردوں سے اور امریکہ ' فرانس ' ہالینڈ ' بلجیم ' سویڈن ' ناروے ' ہسپانیہ اور آئرلینڈ سے نیز مصر ' شام ' فلسطین ' ترکی ' عراق ' چین ' ایران ' سیلان ' برہما ' جاوا وغیرہ سے تعلق پیدا کرلیا ہے - ان سب ملکوں کو ہندوستان سے ہمدردی ہے - اور ہندوستان کو بھی ان سے واسطہ ہے - ہمیں کچھ ایسا انتظام کرنا چاہیئے کہ ہم ہندوستان کی ذرا ذرا سی بات سے ان ملکوں کو آشنا کرسکیں - آج کیا گذر رہا ہے ہمارے ملک کی حالت کیا ہے - ہر ایک مسئلہ پر ہندوستانیوں کی رائے کیا ہے - اپنے سارے تفصیلی حالات ہمکو دنیا بھر میں شائع کرنا چاہیئے - تاکہ ہندوستانیوں سے واقفیت پیدا ہو - ہم جانتے ہیں کہ ان سب ملکوں کو ہندوستانیوں سے پوری پوری ہمدردی ہے اور ان میں کئی ایسے ہیں جو سمجھے ہوئے ہیں کہ دنیا کی آفتوں سے نجات پانے کا راستہ صرف ہندوستان ہی بتلا سکتا ہے - انکو ہمارے مہاتما گاندھی پر پورا اعتماد ہے اور ان کی آنکھیں انہیں کو ڈھونڈھ رہی ہیں کہ امن کا راستہ بتلائیں -

دوستی صرف ایک کے قائم کرنے سے نہیں ہوتی - اگر ہم دنیا کی ہمدردی چاہتے ہیں تو یورپ ہو یا ایشیا ' افریقہ ہو یا امریکہ ' ہمیں ہر جگہ کے لوگوں سے ہمدردی اور دوستی کا برتاؤ کرنا چاہیئے - دوستی کی روح اعتماد ہے - جب بھروسہ نہیں تب دوستی کیسی ؟ میری دانست میں تو یہی ایک نسخہ ہے جس سے ہم بہناپا اور ہمدردی پھیلا سکتے ہیں -

ہماری سمبندھی کمیٹی کئی سالوں سے اِن بندشوں کو مضبوط کرنے میں سرگرم رہی ہے - بہت سے ممالک کی عورتیں ہم سے مراسلت کررہی ہیں مگر میری نظروں میں وہ آئندہ کا نقشہ پھر رہا ہے جب ہمیں بہت سے (LIAISON OFFICERS) سمبندھی افیسر مقرر کرنے پڑینگے - چند ملکوں کو اپنی موتیوں کی لڑی کا ایک دانہ بنا کر سمبندھی کمیٹیوں کے دھاگے میں پرونا ہوگا - مثلاً ایک سمبندھی افسر ایشیا کیلئے ہوگا - ایک یورپ کیلئے وغیرہ وغیرہ - اس تعلق سے ہمیں یہ سہولت ہوجائے گی کہ ہم بین الاقوامی قانون کے علم کو بہت بڑھا سکیں گے -

اسلامی ملکوں کے قانون اور قاعدوں سے واقفیت رکھنا

ہندوستانی بہنوں کی ایک بڑی جماعت کو لازمی ہے۔ مثلاً انہیں مصری، ترکی، فلسطینی عرب قانون جاننا چاہیئے۔

ظاہر ہے کہ سویڈش۔ ترکی۔ امرکین۔ سوسی قانون کا ہمارے قانون پر بڑا گہرا اثر پڑیگا۔ خاصکر شادی بیاہ "ترکہ" اولاد کی نگرانی کے حقوق پر بجلکے ہونے سے عورتوں کی حیثیت میں فرق پڑتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم غور و فکر سے غیر ملکوں کے قانونوں کو اچھی طرح جانچیں۔ ان کی اچھی باتیں اختیار کرتے جائیں اور دیکھتے رہیں کہ ہمارے زمانہ میں مرد عورتوں کے قانون کس طرح بنائے جاتے ہیں۔ اگر ہم انسان ہیں تو دنیا کے اور انسان جو کچھ کرتے ہیں، اس سے ہم اثر پذیر ضرور ہوں گے۔ یا ہم اوروں سے رنگ پکڑینگے۔ یا اوروں پر اپنا رنگ جمائیں گے۔ جس قوم میں اثر لینے اور ڈالنے کا مادہ نہو وہ سمجھہ لیجئے کہ مردہ ہے۔ اس میں جان باقی نہیں ہے۔

شکر ہے اللہ کا کہ ابتک تو ہم مرے نہیں بلکہ بہت زندہ ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ ہندوستان نے اپنے بل پر دنیا میں آبرو عزت کی جگہ بنالی ہے۔ اگرچہ ہم محکوم ہیں پھر بھی ہماری ذہانت اور روحانیت کا جادو چل گیا ہے۔

پروگرام یہ ہمیشہ سے ہمارا دستور رہا ہے کہ ہر سال کانفرنس اپنا سال بھر کا پروگرام تیار کرلیتی ہے۔ اکثر ہم کسی ایک ہی مسئلہ کو اٹھالیتے ہیں اور اسی پر سارا زور لگادیتے ہیں سنہ ۱۹۴۰ء کے لئے میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ اپنا کام یہ ٹھہرائیں کہ ہر قسم کی اور ہر حیثیت کی عورتوں سے محبت اور یگانگی کا رشتہ پیدا کریں۔ ہم میں سے ہر ایک کے پاس تھوڑا بہت ہے جو وہ اوروں کو دے سکتی ہے۔ مگر بیشمار ایسی باتیں ہیں جو وہ خود سیکھہ سکتی ہے۔ جن عورتوں کو لکھنا پڑھنا آتا ہے وہ ان پڑھ عورتوں کو پڑھا سکتی ہیں اور ان عورتوں سے قربت حاصل کرسکتی ہیں جنکے پاس ہماری جیسی دنیوی دولت نہیں ہے یا کم ہے۔ یہ دولت ہماری کمائی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ اتفاق سے قسمت نے ہمارے حصہ میں ڈالدی ہے۔ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہماری کسی خاص خوبی کے سبب سے یہ دھن دولت ہمارے ہاتھ آئی ہے۔ انسانیت پکار رہی ہے کہ آؤ اپنی غریب بہنوں کا ہاتھ پکڑو۔ انہیں جگاؤ۔ انکو علم اور تہذیب سے سنوارو۔ جو تم سے زیادہ قابل ہے اس کے علم اور تجربے سے خود فائدہ اٹھاؤ۔ جو تم سے کم ہے اس کو ہر طرح سے سہارا دو۔ اپاہجوں اور بیماروں کیلئے تو ہماری کانفرنس کچھہ کچھہ کوششیں کرتی رہی ہے۔ مگر کیا ہمنے اس قدر زور لگایا ہے کہ عام رسم و رواج کو چھوڑ کر تمام ایسے لوگوں سے میل ملاپ کریں جو ہمارے اطراف میں رہتے ہیں؟ کیا ہمنے ہر عورت سے جو ہماری ہمسایہ ہے راہ رسم پیدا کرلی ہے؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب ہمیں اپنے دل کو ٹٹولنے کے بعد دینا چاہیئے۔

کیا ہم اپنے ہمسایہ سے وہی سلوک کرتے ہیں جس کی ہمیں اس سے امید ہوتی ہے۔ آپ ذرا سوچئے۔ کیا ہم اُن لوگوں سے جنہیں ہم ملازم یا نوکر کہتے ہیں ویسا ہی برتاؤ کرتے ہیں جیسا ان لوگوں سے جنہیں ہم دوست کہتے ہیں۔ اگر ہم اُن سے برابری کا برتاؤ کرنے لگیں تو ان کی حالت کتنی جلدی سدھر جائے۔ انکو ہم اپنی لیاقت سے لائق بنا سکتے ہیں اور اگر وہ ہمیں سکھانے کے قابل ہیں تو ہم اُن سے بہت کچھہ حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ واقعی درست ہے کہ غریبوں میں بعض ایسے گن ہوتے ہیں جو امیروں میں کم پائے جاتے ہیں۔ جیسے صبر۔ توکل اور انسانی کمزوریوں کی برداشت۔ ہمارے دیس میں تہذیب۔ پاکیزگی اور نفاست

پسندی صرف انہی لوگوں میں نہیں پائی جاتی جو پڑھے لکھے ہوں جیسے کہ اور دیسوں میں اکثر ہوا کرتا ہے۔ ہمارے یہاں تعلیم کا بہت بڑا حصہ دیکھکر اور سنکر حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح سے تہذیب بھی پھیلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں امیر و غریب سب قریب قریب ایک سے ہیں۔ ان کا دماغی جامہ ایک ہی ناپ سے کٹا اور سلا ہوا ہے۔ ہمارے مزدور ہمارے ہریجن سب ہم ہی جیسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں عام طور سے آپس کی وہ دشمنی اور فساد نہیں جو کہ اور ملکوں میں پایا جاتا ہے۔

یہ البتہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اب کارخانوں کے ساتھ ساتھ مزدور پیشہ اور سرمایہ دار لوگوں میں مالک اور ملازم کا رشتہ قائم ہو رہا ہے۔ اور جہاں ملکیت کا سوال ہے وہاں یہ کڑوی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ دراصل یہ شوشہ یورپ نے نکالا ہے جب ہم مغربی کارخانے اور کارخانوں کا رسم و رواج قائم کر رہے ہیں تو ہمیں اس کیلئے بھی تیار رہنا چاہیئے کہ یورپ جیسی باہمی بدگمانیاں اور رنجشیں بھی پیدا ہوں۔ اور پھر غریب اور امیر میں واقعی فرق محسوس ہونے لگے۔ ہماری ایسوسی ایشن میں سب سوچنے والی اور سمجھدار عورتیں ہیں۔ ہمکو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ہماری سماج میں ایسا فساد پیدا نہ ہو۔ اگر ہم اپنی کوشش سے مزدور پیشہ عورتوں سے بہناپے کا رشتہ قائم کرلیں تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جائینگی اور ملک کی فضا میں امن رہیگا۔

ہندستانی زبان

میراجی چاہتا ہے کہ آپ سے صاف صاف کہدوں کہ ایسی فضا پیدا کرنے کیسلئے ہمیں ہندستانی سیکھنا اور اس کا چرچا کرنا چاہیئے جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کو قومی زبان کی ضرورت ہے وہ آپ ہی آپ کو نہیں بڑھاتے۔ ہندوستانی زبان ہی ایک ذریعہ ہے جس سے الگ الگ صوبوں کے لوگ آپس میں میل جول پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ دیس کے پڑھے لکھے انگریزی میں بات چیت اور اپنے اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے ہیں مگر یہ ہمیں بھولنا نہ چاہیئے کہ ہمارے دیس کے قریب ۹۰ فیصدی رہنے والے انگریزی سیکھ ہی نہیں سکتے۔ ہمیں میل جول کا زیادہ سادہ اور آسان ذریعہ ڈھونڈھ کر نکالنا ہوگا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اتحاد کی بنیاد مضبوط ہو۔ جو لوگ ہندی یا اُردو بولنے والے صوبوں میں رہتے ہیں انہیں تو عام فہم ہندوستانی کو اُردو ہندی کے ساتھ سیکھنا ہوگا اور ہندوستانی کو ان کے نصاب میں شامل ہونا چاہیئے۔ یہ ہر ایک کی مرضی پر چھوڑا جا سکتا ہے کہ وہ فارسی رسم خط سیکھے یا ہندی لپی۔ حکومتوں کو دونوں سکھانے کا انتظام کرنا چاہیئے اور استادوں کو دونوں میں سند حاصل کرنا چاہیئے۔

ہندستانی کیا ہے

مختصر تعریف ہندوستانی زبان کی یہ ہے کہ یہ ہندی اور اُردو کا وہ بڑا حصہ ہے جسے اُردو و ہندی بولنے والے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اس میں اردوئے معلیٰ کی شان، شیرینی اور لطافت نہیں ہے۔ اسلئے کہ یہ جان بوجھکر بہت ہی سادہ اور آسان بنائی گئی ہے اور اس میں ہندی کے اور مقامی بولیوں کے آسان لفظ لے لئے گئے ہیں۔ ہندوستانی اور ہندی میں فرق یہ ہے کہ ہندوستانی میں عربی اور فارسی کے وہ سارے لفظ لے لئے گئے ہیں جو بول چال میں آ گئے ہیں اور سنسکرت کے بھاری علمی لفظ چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ پھر بھی ہندوستانی کی "ایک سادگی میں لاکھ بناؤ ہیں"۔

ہندوستانی میں وہی اصول برتا گیا ہے جو کہ بیسک (BASIC) یا بنیادی انگریزی میں جس میں کاٹ چھانٹ کر کل ۸۰۰ لفظ رکھے گئے ہیں۔ آپ انگریزی کی بیسک سکیم پر غور کیجے تو ہندوستانی کا اصول بہت آسانی سے سمجھ سکیں گی۔ اب ہندوستانی کی درسی یعنی سکولوں میں پڑھانے کی کتابیں ایسی زبان میں لکھی جاتی ہیں جسے اردو اور ہندی بولنے والے طالبعلم یا ودیارتھی دونوں پڑھیں اور سمجھ سکیں۔ یہ زبان اتنی آسان ہے کہ جو لوگ نہ اردو بولتے ہیں اور نہ ہندی وہ بھی اسے بہت جلد سیکھ سکتے ہیں۔ ہندوستانی کوئی نئی ہستی تو ہے نہیں جو آجکل ہی پیدا ہوئی ہو یا جو کسی خاص مطلب سے ایجاد کی گئی ہو یہ تو خود بخود قدرتی طور پر بنتی چلی آئی ہے۔ یہ ایک خودرو پودا ہے جسے اب ہم قلم لگا کر زیادہ مقبول اور خوبصورت بنا رہے ہیں زمانہ گذرا پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اپنے بے مثل فسانۂ آزاد میں ہندوستانی کا نمونہ پیش کیا تھا۔ آپکو یاد ہوگا حسن آرا بیگم اپنی سہیلی سے شرط بد کر ان کے اصرار سے ایک مضمون لکھتی ہیں جو خالص ہندوستانی ہے۔ اس میں عربی فارسی کے لفظ کم ہیں یا ہیں ہی نہیں ہندی کے بہت لفظ ہیں مگر سب سہل اور جانے بوجھے اور عام طور پر برتے جانے والے۔ سرشار کے کوئی پچاس سال بعد منشی پریم چند نے اپنی کتابیں زیادہ تر سماجی ناول لکھنا شروع کیا جنہیں اردو اور ہندی کے خوبصورت پیوندی پودے کہنا چاہیئے۔ اس دور اندیش قوم پرست نے حروف اور لکھائی پر بالکل دھیان نہ دیا۔ وہ سمجھ گئے کہ بھاشا کے آگے رسم خط ایک چھوٹی چیز ہے۔ ان کی کتابیں دونوں لپی میں چھپنے لگیں تا کہ بہت زیادہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ آپ کا نام تو بھی سنہری حرفوں میں لکھنا چاہیئے اور انکو قوم کے خادم کے لقب سے یاد کرنا چاہیئے۔ جب سے اردو زبان وجود میں آئی تب سے برابر ہمارے شاعر اور ادیب ایسی نظمیں یا مضمون لکھتے چلے آئے ہیں جنکو ہندوستانی کہنا غلط نہ ہوگا۔ اگر آپ استادوں کے کلیات کو غور سے پڑھیں گی تو ضرور ایک آدھ نظم یا مضمون کا حصہ ایسا نکل آئیگا جو خالص ہندوستانی ہو مثلاً

مولانا آزاد کی آب حیات کے کچھ حصے۔

مولانا حالی کی بہت سی نظمیں۔

مولوی عبدالحق صاحب کے کچھ مضمون

ہمارے شاعر حفیظ یا ستّار یا ملّا اور بہت سے نوجوان شاعروں کی نظمیں۔

برج نرائن چکبست کا رامائن کا ترجمہ

خوشی محمد چودھری کے اشعار۔

اِن سب نامور مصنفوں نے کچھ حصے کتابوں کے، کچھ اشعار کچھ قصے کچھ مضمون ایسے لکھے ہیں جن کی بنیاد پر بہت اچھی اور سب کو بھلی لگنے والی عمارت کھڑی کر کے ہم اسے ہندوستانی کا نام دے سکتے ہیں۔ اِن سب استادوں کو ہم مانتے ہیں۔ ہم اِنکا دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اُنہیں قوم کے محسن سمجھتے ہیں ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انہوں نے ہمیں ٹھیک رستہ پر لگایا اور ہمیں اپنی قومی زبان کے پہلے سبق پڑھائے۔

کانفرنس کا پروگرام بہت لمبا چوڑا بن چکا ہے اور ہم ہر سال ایک ایک نیا کام بڑھاتے چلے جا رہے ہیں۔ میں اب اس میں کوئی نئی بات بڑھانے کی درخواست نہ کرونگی۔ خدا ہمارے کام میں برکت دے وہ ہر بندہ کا مددگار اور اصلاح کا ہے۔ عاجزی سے مگر یقین کیساتھ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری مدد کرے اور ہم اپنے کاموں کو اسطرح پر انجام دیں کہ جس سے کسی کو دکھ نہ پہنچے بلکہ ملک کے تمام بسنے والوں میں دوستی اور اتحاد کا رشتہ قائم ہو۔ ہم اپنی ماتا ہند کی گود میں پلے ہیں ہمیں اس کا لحاظ رکھنا چاہیئے مگر ہماری بڑی ماتا تو دنیا ہے اس کا پاس اور زیادہ ہونا چاہیئے۔ آیئے انسانی محبت سے اپنے اپنے دلوں کو گرما کر اپنا کام جاری رکھیں اور اسے جلد اور حسن و خوبی کے ساتھ کرنا چاہیئے انجام دیں۔ بند مقطع

رات اندھیری تھی اور کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ پانی برس چکا تھا اور راستوں میں کیچڑ تھی۔ بازار بند ہو رہا تھا۔ اکا دکا حلوائیوں کی دوکانوں کی لالٹینیں جل رہی تھیں جن کی روشنی کو اندھیرا نگلے جا رہا تھا۔

دوسرے شو میں سنیما جانے والے دو دو چار چار کی ٹولیوں میں گزر رہے تھے۔ فلم کے متعلق سنی ہوئی باتیں دہراتے، ہنستے، بکتے، تیزی سے چلے جا رہے تھے۔

بڑھاپے سے بے دم اور سردی کا مارا ہوا ایک فقیر پھسل کر گری نالی میں گر جاتا ہے۔ "ہائے" کی ایک آواز سنائی دیتی اور سناٹے میں گونجتی معلوم ہوتی ہے اور پھر سناٹا ہو جاتا ہے۔

تین چار تماشائی جا رہے ہیں۔ "ہائے" کی آواز سن کر ایک کہتا ہے:-

"نشے میں ہوگا!"

"ابے یار اسے نالی میں سے نکالتے چلو۔" دوسرا کہتا ہے

"بڑے ترس کھانے والے ——— دیر جو ہو جائے گی!" پہلے نے کہا۔

"ذرا پیر بڑھائے چلو"۔ تیسرا کہنے لگا۔

اکشہ ہانستہ کرتی ہوئی یہ ٹولی گزر گئی۔

بوڑھا بھکاری ہوش میں آیا تو کراہنے لگا۔ ایک دوسری ٹولی پاس سے گزری تو ایک نے کہا:-

"اماں یہ کون گر پڑا ہے؟"

"ہوگا کوئی ——— ایسوں کو مرنے میں کسی مدد کی ضرورت نہیں ہوتی"

"یار کوئی فقیر ہے!"

"جی ہاں۔"

"خیرات دے دے کر ساری قوم کو فقیر بنا دیا ——— اور کیا!"

یہ باتیں بوڑھے بھکاری کے کان میں پہنچتی ہیں۔ وہ سنتا ہے اس دل سے سنتا ہے جو خون تو ساری عمر ہوا لیکن اس وقت پانی ہو گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔

سچ ہے! بھوک اور فاقے نے جان نہ لی، روگ اور بیماری نے ترس نہ کھایا۔ غریب کا کوئی خدا نہیں! مفلسی کا بڑھاپا سو موتوں کی موت ہے! دنیا تو زور والے کی ہے! غریبوں کے لئے تو ہسپتال میں بھی جگہ نہیں ——— وہ بھی بھرے ہیں! ایک بھکاری کا ٹھکانا تو بس رستے گلیاں ہیں۔ مصیبت میں پیدا ہوا اور مصیبت جھیلتے جھیلتے مر گیا! پر میری مصیبت کاٹتے تو موت بھی نہیں آتی!

جب بدن میں جان تھی اور میں محنت مزدوری کر سکتا تھا۔ گوشت سماج مجھے مزدوری کی روٹی دینے کو بھی راضی نہ ہوئی۔ بھوک میں چار گاجریں اٹھائی تھیں تو پیسے والوں کی عدالت نے مجھے جیل بھیج دیا۔ اب کوئی پیسے والا چور کو نوکری کیسے دے دیتا! جیل سے چھوٹ کے اگر میں چوریاں شروع کر دیتا تو اچھے اچھوں کے گھر صاف کر دیتا

اُس وقت مجھ میں زور بل تھا۔

مجھی سے بھول ہوئی : میں نے دعائیں دے کر پیٹ پالنا چاہا جو نہ خدا کو بھایا نہ انسانوں کو۔ ٹکڑا روٹی کے بدلے کسی نے میری دعائیں نہ خریدیں!

خدا کسی سے بھیک کیوں منگواتا ہے؟ اس لیے کہ اس کے پیسے والے پیارے بندے خیرات دے کر اپنی حرام کاریوں کو دھو لیں۔ —— خدا کو خرید لیں! ہونہہ خدا تو خود منگتا ہے! پر اب تو کوئی بھیک دے کر بھی پاپ نہیں دھوتا! اللہ میاں بھی میری طرح، پڑے ناپتے ہوں گے!

اُونہہ! میں مر رہا ہوں، میری ہڈیاں کٹ رہی ہیں! میں اپنے انسان بھائیوں سے، اپنے ہندوستانی بھائیوں سے۔ اپنے مسلمان بھائیوں سے دُور ہو رہا ہوں —— شکر ہے!

میرے انسان بھائیو! میرے ہندوستانی بھائیو اور میرے، مسلمان بھائیو، سلام! "تمہارا انسانیت کا کوڑا" بھائی، تمہارے "ملک کی لعنت" بھائی، تمہارا "کلمہ گو" بھائی، وہ بھائی جو جلیانوالہ باغ میں تمہارے اوپر گولیوں کی برسات ہوئی تو رو دیا تھا۔ جس نے تمہارے "شہیدوں" کے بچوں کی خبرگیری کے لیے اپنے تینوں پیسے دے کر اس روز فاقہ کیا تھا۔ جسے تم نے خیرات، زکات محنت، مزدوری بھی نہ دی کہ وہ بھی انسانوں کی بھلائی کا کام کر سکتا انسانوں سے محبت کر سکتا۔ آج تمہارا وہ بھائی تم سے نفرت کرتا ہوا مر رہا ہے، تم سے ——"

بھکاری کے دماغ کی مشین چلتے چلتے رُک جاتی ہے آج وہ سماج کی خدائی سے نکل گیا!

کاپی رائیٹ ریزروڈ

مسلسل

سرگذشت

از سحر

ابا جان اب بالکل نا امید ہو گئے تھے کہ وہ مجھے بہلا پھسلا کر واپس نہیں لیجا سکتے۔ ان سے ملاقات کے بعد شہر کے کئی سر کردہ اصحاب مجھ سے ملے اور ہر طرح کی کوشش کر کر کے تھک گئے کہ میں اپنے والد صاحب کے پاس۔ یا اعزہ کے پاس چلی جاؤں۔ اگر وہاں نہیں جانا چاہتی تو کم از کم اپنے ہم قوم گھرانوں میں چلی جاؤں وہاں سب مل کر میری آئندہ زندگی کا پروگرام عین میری مرضی کے مطابق بنائینگے۔ مگر میں کسی بات پر راضی نہ ہوئی۔ چونکہ اب میں اپنی زندگی کا پروگرام دوسروں کے ہاتھوں بنوانا نہ چاہتی تھی۔ نہ کسی ایسے ماحول میں جانا چاہتی تھی کہ پھر سے اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کروں۔ لہذا سب نا امید ہو کر اس فیصلے پر مجبور ہوئے کہ مقدمے کے ذریعے مجھے ڈرایا اور دھمکایا جائے اور بچے چھین لئے جائیں۔ انکا خیال تھا کہ عورت کمزور دل ہوتی ہے۔ بچوں کی مامتا سے مجبور ہو کر میں اپنے خیالات کی قربانی کر ڈالونگی اور واپس گھر چلی آؤنگی چنانچہ مقدمہ چلا اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو پریشان کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ مقدمے کی پہلی پیشی پر پولیس کا خاص انتظام تھا اور مجھے کافی اہتمام کے ساتھ عدالت لیجایا گیا۔ کیونکہ اس بات کا بہت خوف تھا کہ مجھے کوئی مار نہ ڈالے شہر کی فضا نہایت خطرناک تھی مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بہت مشتعل کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک مسلمان میرے خون کا پیاسا تھا۔ اگرچہ اس میں انکا کوئی قصور نہ تھا کیونکہ انہیں اندرونی حالات کا قطعی علم نہ تھا کہ میرے لئے خلاف مذہب خلاف انسانیت کیسے بھیانک جہنم کا عذاب تیار کیا گیا تھا۔ وہ بیچارے تو صرف یہ جانتے تھے کہ ایک مسلمان پٹھان لڑکی گھر سے بھاگ نکلی اور لامذہب ہو گئی۔ اس سے مسلمانوں کی ناک کٹی اور اسلام کی بے حرمتی ہوئی۔ حالانکہ اس تماشہ کا بانی اور ذمہ دار بھوپے تھا۔ اسلام کا جتنا زبردست دشمن وہ تھا کوئی اور نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی وہ مسلمان کہلاتا تھا۔ شریف مانا جاتا تھا۔ اور لوگ اس پر ترس کھاتے تھے کہ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر بھاگ گئی اور اسے بدنام کیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ لوگ ظالم کو مظلوم سمجھنے لگیں اور مظلوم کو ظالم۔ میرے ساتھی چونکہ بہت اچھی پوزیشن کے مالک تھے

اسلئے عدالت اور پولیس کا سلوک ہمارے ساتھ بہت اچھا تھا۔ اعزاز کے ساتھ ہمیں کمرۂ عدالت میں نشستیں پیش کیجاتیں تلاشی لئے بغیر کسی کو کمرۂ عدالت میں نہ آنے دیا جاتا۔ کیونکہ اس بات کا خطرہ تھا کہ ہمپر قاتلانہ حملہ نہ کر دیا جائے۔

پہلے دن میرا بیان عدالت کے بند کمرے میں ہؤا مجسٹریٹ کے سوالات کے جواب میں مینے کہا "کہ مینے اپنی خوشی سے اس مذہب کو چھوڑ دیا ہے جو ہم عورتوں کی خود داری اور حقوق کی پروا نہیں کرتا۔ اور نالائق سے نالائق مرد کو عورت پر فوقیت دیتا ہے۔ میری عمر ۱۸ سال کی ہے۔ مجھے بھورے سے شدید نفرت ہے، مینے خوشی سے شادی نہیں کی بلکہ زبردستی میری شادی اس سے کر دی گئی۔ اور میرے بار بار احتجاج کے باوجود مجھے اس سے مخلصی نہیں دلائی گئی۔ ہر انسان اپنے جسم اور نفس کا مالک ہوتا ہے مگر مجھے یہ حق نہیں دیا گیا۔ میرے اوپر شدید جبر کئے گئے میں اور شادی نہیں کرونگی۔ کیونکہ میں شادی کو بدترین لعنت سمجھتی ہوں اور عورت مرد کے تعلقات سے مجھے سب سے زیادہ نفرت ہے اور گھن آتی ہے۔ میں اس کے مقابلہ میں پھانسی کو زیادہ اچھا سمجھتی ہوں۔ بچے میرے ہیں اور میں ان پر سب سے زیادہ اپنا حق سمجھتی ہوں۔ اسی لئے انہیں اپنے ساتھ لے آئی۔ میرا چچا زاد بھائی جمیل چونکہ میرے ساتھ تھا اور وہ میرے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہے۔ اسلئے وہ بھی میرے ساتھ آگیا۔ مینے اسے ساتھ آنے پر مجبور نہیں کیا نہ آنے سے روکا۔ بچوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ جوان ہونے اور تعلیم پانے کے بعد ہی اپنی تحقیق و تجسس سے انسان کے خیالات بنتے ہیں۔ جمیل اور میرے بچے جوان ہونے پر جو مذہب چاہیں اختیار کر سکتے ہیں۔ چونکہ مذہب کا معاملہ انسان کا ذاتی معاملہ اپنے خدا سے ہے کسی دوسرے کو اس میں خلل انداز نہ ہونا چاہیئے۔ ماں کے ساتھ رہنے میں اگر "لامذہبیت" کا اثر پڑیگا تو باپ کے ساتھ رہنے میں بھی تو اس غلط مذہب کا اثر پڑ سکتا ہے جسپر ایک برا آدمی عمل پیرا ہے۔ اگر باپ کا اثر لینا غلط نہیں ہے تو ماں کا اثر لینا کیسے غلط ہو سکتا ہے؟۔ مجسٹریٹ کے ایک سوال پر مجھے بہت غصہ آیا۔ وہ یہ کہ "جب تم اپنے شوہر سے نفرت کرتی تھیں اور رضامند نہ تھیں تو بچے کیسے پیدا ہو گئے"؟ میں نے تڑخ کر جواب دیا کہ تم ایک نازک مزاج کم عمر لڑکی کو لے آؤ اور اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ وہ رضامند نہ ہو اور میں ایک بڑی عمر کے طاقتور حیوان صفت مرد کو لے آتی ہوں۔ یقیناً بچے پیدا ہو جائینگے۔ صرف ماں کی نارضامندی ان کی پیدائش کو نہ روک سکیگی۔ چونکہ غصہ نے مجھے پاگل کر دیا تھا اسلئے مجھے ایسا صاف جواب دیتے ہوئے شرم نہ آئی مگر مجسٹریٹ میرا جواب سنتے ہی دم بخود ہو کر رہ گیا۔ لیکن کچھ دیر خاموشی کے بعد اسنے ایک اور احمقانہ سوال کر دیا۔ کہ "اس صورت میں تمہاری شادی ناجائز تھی۔ شوہر سے تمہیں نفرت تھی لہذا بچے بھی ناجائز ہوئے پھر تمہیں بچوں سے محبت کا دعویٰ کیوں ہے اور کیوں نہیں انہیں ان کے باپ کے حوالے کر دیتیں"؟

مجھے ہنسی آگئی ـــــ مینے کہا بچے جائز ہوں یا ناجائز راضی خوشی کے ہوں یا جبر و اکراہ کے وہ نو ماہ ماں کے پیٹ میں رہتے ہیں۔ ماں کے گوشت و پوست و خون سے بنتے ہیں جائز و ناجائز سب ایک طرح کی ہی تکلیف دیکر پیدا ہوتے ہیں دودھ سب کے لئے اترتا ہے۔ اسلئے ماں کو جائز ہو یا ناجائز اپنی اولاد سے محبت ہوتی ہے اور وہ اس مشکل سے پیدا کی ہوئی اولاد کو اپنے سے کیسے جدا کر سکتی ہے اور دوسرے کے

حوالے کس دل سے کر سکتی ہے۔

انہیں دنوں میرے بہنوئی میرے بہن بھائیوں اور سوتیلی والدہ کو لیکر اسی شہر میں آ پہنچے۔ میری بہن زریں کے اصرار سے وہ میرے چھوٹے بھائی کو لیکر مجھ سے ملنے آئے پہلے انہوں نے میری بہن کا خط مجھے بھجوایا۔ زریں نے یہ خط بہت پُر درد لہجے میں لکھا تھا اور اصرار کیا تھا کہ میں اسکے شوہر سے ضرور مل لوں۔ وہ میرے بہت خیر خواہ ہیں اور میری حمایت بڑی زور و شور سے کرتے ہیں۔ اور میرے مخالفین کو ہر جگہ زک دیتے ہیں۔ ان کی نیز زریں اور بہن بھائیوں کی یہی مرضی ہے کہ اب میں کسی کے بہلانے پھسلانے میں آکر واپس گھر آنیکی حماقت نہ کروں۔ چونکہ جب آزادی کیلئے اتنی بدنامی اور تکلیفیں بھی سہیں اور خطرے میں بھی پڑی تو کئے دھرے پر پانی کیوں پھیر اجائے۔

زریں نے یہ بھی لکھا تھا کہ کل بیٹے ایک شخص کی زبانی سنا تھا کہ تم مکان کی گیلری میں بے دھڑک کھڑی تھیں اس وقت سے میرا خون خشک ہو رہا ہے کہیں کوئی تمہارے گولی نہ مارد ے۔ والد صاحب بھی آجکل بہت غصے میں ہیں۔ بھرے ہوئے ریوالور اور پستول لئے تمہارے کھوج میں پھر رہے ہیں کہتے ہیں کہ ایک نہیں بلکہ پورے تین ریوالور اور پستولوں کی گولیوں سے اُسے چھلنی بنا دونگا۔ تم موٹر میں بھی کہیں نہ جایا کرو۔ ابا کہہ رہے تھے کہ ٹائر کو گولی مار کر پنکچر کر دونگا۔ اس کے بعد موٹر ٹھیرا کر اسے زندہ ساتھ لانے کی کوشش کرونگا اگر مان گئی تو خیر ورنہ اگر اپنی ضد پر قائم رہی تو وہیں اس کا خاتمہ کر کے لاش لے آؤنگا۔ آپا سچ مانو میری روح ہر لمحہ تمہارے اردگرد رہتی ہے کہ اگر تمہاری جان لینے کو کہیں سے گولی آئے تو میری روح ڈھال کا کام کرے۔ اور گولی مجھے لگ جائے۔ میرا کام تمام ہونے کے بعد ہی تمہارے دشمنوں کو کچھ ہو۔" سچ مچ زریں بیچاری بہت ہی خوفزدہ تھی۔

میں اپنے بہنوئی سے ملی۔ یہ ملاقات ہماری پہلی ہی ملاقات تھی۔ چونکہ پہلے میرا ان سے پردہ تھا۔ وہ مجھ سے ملکر بہت خوش ہوئے۔ اور میں انکے خیالات معلوم کر کے خوش ہوئی۔ وہ بہت سلجھے ہوئے خیالات کے انسان ہیں بہنوئی سے مجھے معلوم ہوا کہ میری بہن زریں دن رات نمازیں پڑھ پڑھکر قرآن کی تلاوت کر کے۔ روزے رکھ کر میرے لئے دعائیں مانگتی ہے۔ رات رات بھر کھڑے پاؤں پر نفلیں پڑھتی ہے اور میری زندگی کی خیر مناتی ہے۔ رنج و فکر شب بیداری اور شدید ریاضت کیوجہ سے اس کا پہلا بچہ آٹھویں ماہ ہی پیدا ہو گیا اور دو دن بعد مر بھی گیا۔ خود بھی موت کے منہ سے بچی۔ اس پر میرا چھوٹا بھائی ٹھہر بولا کہ چھوٹی آپا ہر دم یہی دعائیں مانگتی رہتی تھیں کہ اگر میری بہن کی بے وقت قضا آئی ہو تو میرا یہ بچہ ان پر صدقے ہو جائے۔ اللہ میاں آپا کے بدلے میں اسے لے لے اور اس کی عمر آپا کو مل جائے۔ میری بہن کو اللہ زندہ سلامت اور اپنی حفظ و امان میں رکھے"۔

میرا بھی یقین ہے کہ اگر دعاؤں پر زندگی کا انحصار ہے تو میں اپنی بہن زریں کی دعاؤں کی بدولت زندہ ہوں، ورنہ میرے لئے تو قدم قدم پر موت تھی۔

آپ سُسر ہیں ؟
آپ ساس ہیں ؟
اور
آپ شوہر ہیں ؟
تو اپنی بہورانی کے ساتھ
ہماری
BAHURANI
بہورانی
ایکسلسیر تھیٹر میں
دیکھنے
ضرور
تشریف
لائیں
انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ
گزدر ہاؤس ہارنبی روڈ
فورٹ بمبئی
اداکار
انورادھا۔ کشور ساہو
روز۔ مبارک۔ پرتیما دیوی
وغیرہ

بھولی پریمیہ

از محترمہ منیرہ سلطانہ صاحبہ بہار

سکھی سکھی! یہ کیسی اُداسی؟ تو بہ ہے کیسی و نواسی!
کیونکر ہے تو ایسی نراسی؟ دیکھ تو آئی میں تری داسی!
سکھی سکھی! — اری دیکھ ادہر تو!

بُولنے والی چپ سی کیوں ہے کھیلنے والی بیٹھی کیوں ہے؟
ہنسنے والی روتی کیوں ہے؟ سُکھ والی تو دُکھی کیوں ہے!
سکھی سکھی! — اری دیکھ ادہر تو!

کیا کہیں تو نے پریم کیا ہے؟ پریت کا جھگڑا مول لیا ہے!
کس کو من کا میت کہا ہے؟ بول سکھی جو تو نے کیا ہے!
سکھی سکھی! — اری دیکھ ادہر تو!

اور بھی اب تو رونے لگی تُو!! کھائی ہے کیا چوٹ بڑی تو!
پریم کیا پر سمجھ سکی تو؟! راہ نہ دیکھی چلنے لگی تو!!!
سکھی سکھی! — اری دیکھ ادہر تو!

پریم میں سُکھ اور چین ہی کیسا؟ دُکھ نہیں جس میں پریم ہی کیسا؟
سکھ کا پھر وشواس ہی کیسا تُو نے یہ سمجھا ہی کیا ہے؟!
سکھی، سکھی — اری دیکھ ادہر تو!

بھولی پریمیہ! جان لے اتنا! پریم میں سب کو دُکھ ہے سہنا
پھر کیوں رو کر جان ہے دینا ہنس دے سکھی! اب مان لے کہنا
سکھی، سکھی — اری دیکھ ادہر تو!

طبعزاد مختصر افسانے

زہر کے تین گھونٹ

از جناب دُکھی پریمنگری

بھکاری

بھکاری دیر سے کھڑا بھکشا مانگ رہا تھا!

سوہا اپنے پتی کو پتر لکھ رہی تھی!

اُسے جھنجھلاہٹ آ گئی!

وہ تلملاتی ہوئی گئی اور کہا "لاج نہیں آتی کہہ دیا کہ یہاں کچھ نہ ملے گا" - اور کواڑ بند کر لئے!

نربل بھکاری آہ کرکے گر پڑا -

سوہا نے پٹ کھول کر دیکھا ——— دونوں کی آنکھیں ملیں -

ارے . . . . یہ تو وسنت تھا جسے آج دس سال ہوئے کالج سے اس لئے رسٹیکیٹ کر دیا گیا تھا کہ اُس نے اسی سوہا سے اُس کی روپ سدھا کے پریم رس کی بھکشا مانگی تھی!

بُندے

آج اُسے اچھی مزدوری ملی تھی!

سفید سفید چاندی کی اٹھنّی!

وہ پھولا نہ سماتا تھا!

ہاں آج وہ اپنی پرتیما سوہا کے لئے خوبصورت سے بُندے خریدے گا! اور جب وہ ایک دم اُس کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے بُندے رکھ دے گا تو وہ کتنی خوش ہوگی - خوشی کے مارے مجھ سے لپٹ جائے گی" وسنت سوچ رہا تھا -

بڑے سوچ بچار اور ردّو کد کے بعد اس نے ایک سُرخ نگوں والے بندوں کی جوڑی پسند کی ——— گو قیمت بہت تھی ——— پورے آٹھ آنے! مگر خیر ——— وہ سوہا کی دیرینہ خواہش پوری کرنے کے لئے آٹھ مرتبہ جان دینے کو تیار تھا!

پر آہ!

جب اُس نے اپنے پھٹے کوٹ کی جیب میں اٹھنّی کے لئے ہاتھ ڈالا تو اُس کی سخت سخت انگلیاں اس کی برہنہ پسلیوں سے جا ٹکرائیں! جیب پھٹی ہوئی تھی!!

ہار یا جیت

ہمیشہ کی طرح آج بھی بنسی کی آواز پر وہ باؤلی کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی!

جہاں ———!

رادھے گوالا ——— البیلا بانکا جوان ——— اپنی لاٹھی کا سہارا لئے اُس کی راہ تکتا تھا! ستو ہا! جوار کی روٹیاں اور چھاچھ کی لٹیا سنبھالے ہوئے رادھے کے پاس سے گذرنے لگی!

ہمیشہ کی طرح!

آج بھی رادھے بولا "سندری! دھیرے چلو ——— گگری

چھلک نہ جائے! اور اُس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر روکنے کے باوجود مسکراہٹ کھیل ہی گئی!

——— آج اُس نے پکا ارادہ کرلیا تھا ——— کہ نہ تو وہ باولی کی طرف دیکھے گی اور نہ اُس کی کسی بات پر مسکرائے گی!

مگر!

باولی کے پاس آتے ہی اسے منسی کی آواز سنائی دینے لگی۔

——— وہ اپنے کو سنبھالے ہوئے آگے بڑھتی گئی ———

آج وہ بہت خوش تھی۔ اُس نے رادھے کی پریم تان کو جیت لیا تھا۔

جونہی وہ آم کے درخت کے پاس پہنچی کسی نے آہستہ سے کہا "سندری دھیرے چلو ——— گگری چھلک نہ جائے!

ہزار ہونٹ کاٹنے کے باوجود وہ مسکائے بنا نہ رہ سکی

اُس نے شوق بھری لجائی ہوئی نینوں سے اُس طرف دیکھا!

پرنتو ——— آہ

وہاں کوئی نہ تھا!

دھرتی پر چھاچھ بہہ رہی تھی۔ پاس ہی روٹیاں پڑی تھیں۔

اور سوہا ——— !

دنیا سر تھامے بیٹھی تھی۔

نیشنل اسٹوڈیو کی پہلی تصویر
NATIONAL STUDIOS
ناقابل فراموش مناظر
ماں کی محبت
بیوی کی وفاداری
عورت کی وفاداری
ڈائرکٹر:- محبوب
عورت
اس کا ہر ایک سین آپکے دل پر نقش کریگا۔ عورت ایسی تصویر ہے کہ آپ اسکو بار بار دیکھیں گے
اداکاران:-
سریندر۔ سردار اختر۔ یعقوب۔ جیوتی
ہریش۔ ارون وغیرہ کے کام!
پاتھے سینما میں

آپ کیا چاہتے ہیں؟
منروا کا تازہ فلم "میں ہاری" ان تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے!
دلگداز مکالمے! دلنواز گانے! دلکش ناچ! دلآویز اداکاری!
ڈائرکٹر:- جاگیردار
تیسرا کامیاب ہفتہ!
MINERVA PRODUCTION
میں ہاری
موسیقی:- میر صاحب
افسانہ مکالمے اور گانے:- کمال امروہی
اداکاران خصوصی:-
پری چہرہ نسیم - مایا دیوی - نوین یاگنگ
ایرچ تارپور - ہری شیوڈاسانی -
غلام حسین - شوری - وغیرہ -
روزانہ :- ۳½ - ۷ - ۹¾ بجے رات
سنیچر، اتوار اور تہوار کے دن خاص کھیل
ساڑھے دو بجے دن
ایک حسین تماشہ کی پر درد داستان جس میں ملکۂ حسن نسیم بانو کا
دلفریب ناچ پیش کیا گیا ہے!
کرشنا ٹاکیز بمبئی

NASLEM

See her at Krishna Talkies in Minerva's "DEFEAT".

See her in New Theater's "Zindgi" at Minerva Talkies

فلمی ریویو:-

"آج کا ہندوستان" تیار کردہ شری رنجیت موویٹون۔ ڈائرکٹر مسٹر جینت ڈیسائی۔ اداکاران۔ پرتھوی راج ایشور لال۔ چارلی۔ روز۔ ستارہ۔ جائے نمائش رائل اوپیرا ہاؤس بمبئی۔ رنجیت فلم کمپنی واقعی اس کیلئے قابل مبارکباد ہے۔ کہ اس نے فلم انڈسٹری کے ذریعہ ہمیشہ ایسی فلمیں تیار کی ہیں جو ملک اور قوم کی اصلاح اور ترقی میں ممد و معاون ہوں۔ اچھوت اور ادھوری کہانی بھی ایسی ہی مفید فلمیں تھیں۔ انڈیا ٹوڈے۔ یا آج کا ہندوستان بھی اسی نقطۂ نظر سے اچھی پکچر ہے قصہ سبق آموز ہے۔ اداکاری۔ مکالمے، گانے، رقص اور مذاق سب پسندیدہ ہیں۔ فوٹوگرافی اور صدا بندی بھی اچھی ہے۔ دیہاتی منظر حقیقت کا نمونہ ہیں۔ شہری زندگی کی ترجمانی بھی خوب کی گئی ہے۔ چارلی کی اداکاری سب سے بڑھ گئی ہے۔ اس فلم میں دلنشیں سیوکوں اور دیش سیوکاؤں والے سین نے فلم کی اہمیت کو کچھ زیادہ نہیں کیا اگر یہ سین نہ ہوتا تو اپنے خیالات کے ... زیادہ موثر ثابت ہوتی۔

"زندگی" تیار کردہ نیو تھیٹرز۔ ڈائرکٹر مسٹر بروا۔ اداکاران خصوصی جمنا سیگل۔ پہاڑی وغیرہ۔ اس فلم کی اسٹوری بنگال کے ایک مشہور فسانہ نگار کی لکھی ہوئی ہے جسمیں عشق و محبت کو پاکیزگی سے غلو اور بلند درجے کی چیز دکھایا گیا ہے جذبات کے طوفان کو عقل و اصول کی بندش سے باہر نہیں ہونے دیا گیا۔ سب سے زیادہ نمایاں اور پسندیدہ چیز اس فلم میں موجودہ زمانے کے مختلف حالات کو مختلف ٹچز TOUCHES سے دکھایا گیا ہے اور یہی چیز اس فلم کی جان ہے۔ سیگل کے گانے اچھے ہیں۔ جمنا کی مخصوص سنجیدہ اداکاری پسندیدہ ہے اور پہاڑی نے شرابی کا پارٹ بھی خوب کیا ہے۔ فوٹوگرافی اور صدا بندی بھی اچھی ہے۔

"میں ہاری" تیار کردہ منروا موویٹون۔ ڈائرکٹر جاگیردار۔ کہانی اور مکالمے کمال امروہی۔ اداکاران خصوصی نسیم۔ نوین یاگنک۔ مایا۔ ایرچ تاراپور غیبو۔ داسانی۔ کہانی بلکل زبان نہایت عمدہ اور ڈرامہ پسندیدہ ہیں اسمیں ایک فیشن ایبل رنا صاحب کی محبت ایک مچھیرے سے دکھائی جاتی ہے مچھیرے یا ہیرو کا کام نوین یاگنک نے بہت حسن و خوبی سے کیا ہے۔ سب سے زیادہ شاندار اور پسندیدہ پارٹ اسی کا ہے۔ ملکہ حسن نسیم بانو کا رقص مسحور کن ہے۔ ایرچ تاراپور اور مایا دیوی کی اداکاری حقیقت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ تصنیف سوئٹزر شہری زندگی اور دیہاتی قدرتی زندگی کی کشمکش بہت دلکش انداز میں دکھائی گئی ہے۔ محبت میں ایثار کا بلند جذبہ جو خشک...

صورِ محشر

از مولینا نکہت شاہجہانپوری بی۔اے آنرز فاضل مشرقیات مقیم بمبئی

اگر زلزلہ ترکی و بہار و کوئٹہ خدائی انتباہ کے نمونے تسلیم کرلئے جائیں تو پھر ان مادہ پرست حضرات کو درس عبرت حاصل کرنا چاہیئے جو اب تک اقتربت الساعۃ وانشق القمر کو نہیں سمجھتے۔ اور اپنی عقلی گھوڑدوڑ پر نازاں ہیں۔ قرب قیامت کا مسئلہ صرف اس خیال سے غور طلب ہے کہ یہ چیز قوانین فطرت کے لحاظ سے بھی رفتہ رفتہ ہونا چاہیئے۔ یہ نظم زلزلہ ترکی کے سلسلہ میں لکھی گئی ہے اور بقول اقبال ؒ "برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر" ہماری ہمدردیاں برادران ملت کے ساتھ ہیں مگر یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ آسمانی گلہ دشمن سے نہیں بلکہ دوست ہی سے ہوسکتا ہے۔ کاش وہ آنکھیں جو شرر بصارت کیلئے وقف ہوگئی ہیں فضائے بصیرت کیطرف بھی ایک نگاہ اٹھائیں اور سمجھیں کہ صور محشر کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کبتک مکمل ہوسکتا ہے؟ (نکہت)

غضب کے طوفان اٹھ رہے ہیں، فضائے ہستی میں ہے تلاطم حیات کی ناؤ ڈولتی ہے، نگاہ ظلمت میں ہوگئی گم

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

پہاڑ مرکز سے ہٹ رہے ہیں، فلک نما قصر گر رہے ہیں زمین شق ہو رہی ہے گویا، جہان عشرت میں زلزلے ہیں

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

قدم قدم راہ پرخطر ہے، نظام عالم بگڑ رہا ہے لہو کی نہریں ابل رہی ہیں، ہر ایک آپس میں لڑ رہا ہے

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

دلوں میں دوزخ کی آگ روشن، جہاں سے امن و سکون رخصت جو زندگی تھی بہار جنت وہی بنی ہے عذاب و لعنت

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

یہ قہر کی آندھیاں اٹھی ہیں، مٹا کے چھوڑینگی باغیوں کو انہیں بھگتنا پڑیگا بے شبہ اپنی ان بد دماغیوں کو

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

یہ جنگ یورپ کہ ایشیا ہو نشانیاں ہیں تباہیوں کی یہ شان خوں ریزیوں کی بیشک علامتیں ہیں روسیاہیوں کی

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

سمجھ رہے ہیں فنا کا قانون ہاں اٹل ہے، اٹل رہا ہے یہ جانتے ہیں کہ اس سے لڑنا پیام بربادی و بلا ہے

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں

یہ خونچکاں داستان نکہت سمجھ چکے وہ تری زباں سے جو شوم بختی سے لڑ رہے ہیں خدا کے قانون جاوداں سے

مگر ابھی تک یہ دشمن عقل صور محشر سے بے خبر ہیں
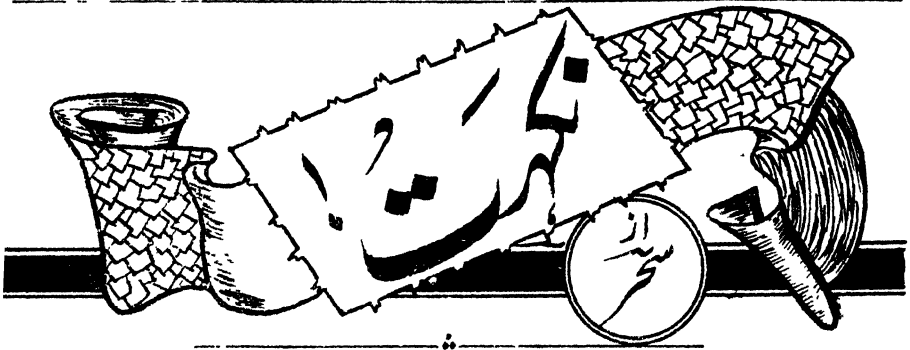
"جی نہیں، میں محبت کی قطعی قائل نہیں ہوں" مَیں نے جواب دیا۔

"مگر میں تو قائل ہوں" نادرہ نے کہا۔

"خدا کرے کہ تم ہمیشہ ہی قائل رہو۔ اور اس دلفریب التباس کی عمر تمہاری عمر سے زیادہ ہو۔ مَیں بھی کبھی کبھی محبت کے فریب میں اپنے آپ کو کھو دینا چاہتی ہوں تاکہ دنیا کی تلخیوں کو بھول جاؤں مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ بالآخر حقیقت، حقیقت ہی ہے، چاہے کتنی ہی تلخ کیوں۔ ہاں دھوکا دھوکا ہی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی دلکش ہو" مَیں نے کہا۔

"اچھا اب اس جاں بخش فریب کو درہم برہم نہ کرو۔ تم تو میرا دل بہلانے کیلئے مجھے یہاں لائی تھیں اس لئے براہِ لطف یہیں کرو۔ محبت کی کوئی عمدہ سی کہانی سناؤ جو دل کو بہلا سکے۔ نسیم کی یہ پہلی جدائی مجھے شاق گذر رہی ہے۔ اُف، دو ہفتے کیسے کٹیں گے! ـــــ آج تو دوسرا ہی دن ہے۔" یہ کہتے کہتے نادرہ نے سُرخ رنگ کا نہایت خوبصورت فاؤنٹین پن بٹوے سے دکھایا اور کہا "دیکھو یہ انہوں نے چلتے چلتے یہ تحفہ دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یہ ہماری پہلی جدائی کی یادگار ہے۔ تم اسی سے مجھے خط لکھنا۔ ان دو دنوں میں مَیں نے اسی قلم سے چار خط لکھے ہیں"

میں نے فاؤنٹین پن لیکر دیکھا واقعی بہت قیمتی اور نظر نواز تھا۔

نادرہ نے کہا "اچھا اب کہانی کہو ـــــ"

میں نے کہا "اچھا۔ مگر ایک شرط ہے مَیں محبت کی کہانی کہتی جاؤں اور تم اسی قلم سے لکھتی جاؤ"

"منظور ـــــ" نادرہ نے کہا اور سنبھل کر لکھنے بیٹھ گئی۔

اسی وقت نہ جانے کیوں بے اختیار [illegible] شعر میری زبان پر آگیا ؎

درد کی ابتدا کہوں ضبط کی انتہا کہوں
کچھ نہ کہوں تو کیا کروں کچھ جو کہوں تو کیا کہوں؟

وہ مسکرائی میں بھی مسکرانے لگی۔ [illegible] "اچھا لکھو۔

"کانگڑی گاؤں سے ذرا فاصلہ پر گنگا کے کنارے [illegible] تھا۔ گھاس پھوس کا چھپر، مٹی کی دیواریں اور لکڑی کے ستون [illegible] پاس ہی [illegible] کا ایک [illegible] درخت تھا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

گلاب، بیلا، [illegible] [illegible] وغیرہ ولائتی پھولوں [illegible] [illegible] خوشنمائی کو [illegible] نکہت کی کٹیا رشکِ فردوس نظر آتی تھی۔ یہ کٹیا ایک [illegible] سادھو کی معمولی سی جھونپڑی تھی۔ سادھو واقعی اس پاپ بھری دنیا سے نفرت کرتا تھا اور سچّا تارک الدنیا تھا۔ لیکن جب نکہت

اس کے پاس آئی۔ وہ کہا" بابا میں تمہارا سہارا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تم ہی مجھے ایسا سہارا دے سکتے ہو جیسا کہ میں چاہتی ہوں۔ اس بھری دنیا میں مجھے میری پسند کے مطابق سہارا دینے والا کوئی نہیں ملتا اور اگر تم نے بھی بے اعتنائی برتی تو گنگا میا کی گود میں جانے کے سوائے میرے لئے کوئی چارہ نہ رہے گا" تو سادھو لرز گیا اور انکار کرتے نہ بن پڑا۔ سادھو نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ نکہت اس دنیا کی چیز نہیں ہے۔

اس نے اسے اپنے پاس رہنے کی اجازت دیدی۔ اس وقت نکہت کی عمر سترہ سال کی تھی اردگرد کے تمام گاؤں والے بھی نکہت کو سادھو کی بیٹی سمجھنے لگے اور اس لئے اس کا احترام کرتے تھے۔

کچھ سال بعد سادھو نے اپنی کٹیا نکہت کو سونپ دی۔ اور خود پہاڑوں پر چلا گیا۔ البتہ کبھی کبھی نکہت کی خبر لینے کو ایک آدھ گھنٹے کے لئے وہ آجایا کرتا۔

نکہت کو پھولوں سے عشق تھا۔ پھولوں کے پودے لگانا پھولوں کی دیکھ بھال اور اپنے باغ کی خدمت کرنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس کا باغ شہر کے تمام باغوں سے بڑھکر آراستہ و پیراستہ تھا جب اُسے اپنے اس مشغلے سے فرصت ملتی تو وہ اُنہیں پھولوں کے درمیان بیٹھکر مطالعہ میں مصروف ہوجاتی۔ سادھو کے پاس "یوگ ودیا" کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔ علاوہ ازیں گنگا کی دوسری پار کے اُس پار ایک گروکل بھی تھا جس کی لائبریری بہت بڑی تھی۔ نکہت وہاں سے کتابیں اور رسالے وغیرہ لے آیا کرتی۔ اُسے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ عمر اگرچہ چھوٹی تھی مگر زمانے کے تھپیڑوں نے اس کے تجربات کو وسیع کردیا تھا۔

اوائل عمر کا زمانہ وہ کلکتہ جیسے بڑے شہر میں گذار چکی تھی۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ والدین کا ارادہ تھا کہ سینئر کیمبرج کرکے مزید تعلیم کے لئے ولایت بھیج دیں گے۔ لڑکی غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ ۱۴ سال کی عمر میں اُس نے جونیئر امتحان بہت اچھی پوزیشن سے پاس کرلیا۔ بڑی خوشیاں منانے کے سامان ہو رہے تھے کہ دفعتاً اس کی پیاری ماں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگئی۔ خوشیوں کے چاند میں گہن لگ گیا۔

وہ سینئر کیمبرج میں پڑھ رہی تھی۔ ابھی دو تین ہی ماہ گزرے تھے کہ نکہت کے والد نے ایک متموّل خاندان کی خوبصورت لڑکی سے شادی کرلی۔ اس حادثے سے نکہت کے نازک اور زخمی دل پر ایک اور گھاؤ لگا۔ ماں کی دائمی جدائی کا زخم ابھی بھرنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ باپ جیتے جی چھوٹ گیا۔ وہ صدمے پر صدمہ برداشت نہ کرسکی اور بیمار رہنے لگی۔ پڑھنا لکھنا سب بند ہوگیا۔ مگر اب اُس کی تعلیم کی کسی کو پروا نہ تھی۔ باپ کو اپنی نئی خوبصورت بیوی کے چشم و ابرو دیکھنے اور اُس کی نازبرداری سے ہی فرصت نہ تھی۔ نکہت، اُس کی صحت اور تعلیم کا خیال اُسے کیونکر آتا ——

اسی اثنا میں نکہت کی سوتیلی ماں کا بھتیجا ڈاکٹر ممتاز یورپ سے واپس آیا اُس کی آمد پر جوڈنر اور پارٹیاں دی گئیں۔ نکہت کو بھی مجبوراً اُن میں حصہ لینا پڑا —— اور وہ ڈاکٹر ممتاز کی نظروں میں کھب کر رہ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نکہت کی شادی ڈاکٹر ممتاز سے کردی گئی شادی کے بعد ایک بڑی ریاست میں ڈاکٹر کا تقرر دیوان کے عہدے پر ہوگیا۔

شروع شروع میں ڈاکٹر ممتاز نکہت پر جان چھڑکتے تھے نکہت بھی ماں کا غم بھول چکی تھی اور ممتاز کو اپنے دل کے مندر کا دیوتا بنا کر اس کی پوجا کرتی تھی۔ مگر شادی کے کچھ ہی دنوں بعد ممتاز کی بدچلنی اور آوارگی رنگ لانے لگی۔ نکہت کو اس سے بڑا رنج پہنچا وہ ممتاز سے محبت ضرور کرتی تھی لیکن اُس کی عادتیں اور چال چلن اُسے ناپسند

تھا مگر ممتاز کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ مرد ہے اور بڑی پوزیشن کا مالک ہے۔ اس لئے اُسے پُوری آزادی ہے جو چاہے کرے نکہت عورت ہے۔ اُس کے لئے رہنے کو عالیشان محل ہے۔ پہننے کو قیمتی زیورات، اعلیٰ لباس، خدمت کو نوکر چاکر اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ۲۴ گھنٹوں میں سے دو گھنٹے ممتاز کی محبت کی بھی وہ حصہ دار رہ سکتی تھی ——— ایک عورت کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیئے؟

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر ممتاز نے ریاست کے ایک بڑے جاگیردار کی فیشن ایبل لڑکی سے دوسری شادی کر لی۔ یہ لڑکی بہ لحاظ حسن وجمال نکہت کا پاسنگ بھی نہ تھی۔ مگر تھی بالکل مغربی تتلی ——— جو مردوں پر ڈورے ڈالا کرتی ہیں اور اُنہیں رجھانے اور قابو میں لانے کے لئے اس درجہ بیتاب اور بیباک ہو جاتی ہیں کہ بسا اوقات شرمناک حد تک "اظہار محبت" کے طریقے اختیار کر لیتی ہیں۔

نکہت مشرقی لڑکی تھی۔ گلاب کے پھول کی مانند، جو قدرت کا حسین ترین رُوپ ہے۔ جہاں کھلتا ہے فضا کو معطر اور خوشنما بنائے رکھتا ہے۔ وہ اپنی خوشبو اور خوشنمائی، رنگینی اور دلکشی سے دوسروں کو فرحت اور تازگی تو دے سکتا ہے۔ مگر شاخ سے بیتابانہ ٹوٹ کر کسی کے قدموں پر نہیں گرتا۔ وہ محبت کئے جانے کے لئے ہے نہ کہ محبت کرنے کے لئے ———

مشرقی عورت کا وقار اور تمکنت اُس کے حسن وجمال کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔ اُس کی عظمت کو بڑھاتا ہے۔ حسن کے سامنے بڑی سے بڑی ہستی جذبۂ عقیدت سے سر جھکا دیتی ہے۔

برعکس اس کے چھچھورپن اور والہانہ وابستگی کا اظہار جو مغربی حسن کا طرۂ امتیاز ہے۔ انسانوں میں حسن کو روند ڈالنے کی تمنا پیدا کرتا ہے

"ڈاکٹر ممتاز نے دوسری شادی بھی کر لی اور ساتھ ہی کئی طوائفوں سے بھی تعلق تھا۔ دولت اور عزت کے لالچ میں ممتاز کی دوسری بیوی کو تو کسی بات پر دھیان دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔ وہ بے حس تھی۔ اس لئے وہ اپنی زندگی بڑی خوشی سے اس طرح گذار دینے پر آمادہ تھی۔

نکہت ایک مرتبہ اس سے ملنے گئی تھی اور اس نے دیکھ لیا کہ "جیسے کو تیسا" مل گیا ہے۔ نکہت صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ لڑکی تھی وہ جانتی تھی کہ بدچلنی کا لازمی نتیجہ شرمناک بیماریاں ہوتی ہیں۔ اُسے اس بات کا شُبہ بھی تھا کہ ممتاز ایسی کئی بیماریوں میں مبتلا ہے مگر علاج معالجے اور انجکشنوں کی مدد سے بیماریاں چھپی اور دبی ہوئی ہیں۔ اُسے اس بات سے بُری نفرت تھی کہ ہندوستانی غلام رہتے رہتے اب چال چلن کے لحاظ سے اس قدر پست ہو گئے ہیں کہ اپنی بیماریوں کو چھپائے رکھ کر دوسروں کو بھی ان میں مبتلا کر کے قوم کو تباہ و برباد کرتے ہیں ورنہ اعلیٰ کیریکٹر کے انسان آج بھی جب اپنی کسی بھیانک غلطی کی وجہ سے ایسے امراض میں خود کو مبتلا پاتے ہیں تو ایک گولی سے بیماری کے ساتھ اپنا بھی خاتمہ کر لیتے ہیں۔

نکہت اُن عورتوں میں سے تو تھی نہیں۔ جو مرد کے بدترین اعمال اور گناہوں میں شریک ہو کر خود بھی اُن کی بیماریوں میں شریک ہو جاتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑا گناہ یہ کرتی ہیں کہ مریض اولاد پیدا کر کے قوم کو تباہی کے غار میں دھکیل دیتی ہیں۔

اگر مریض انسان اولاد پیدا کرنے کی حماقت نہ کیا کرتے۔ تو آج موروثی امراض کا وجود بھی نہ ہوتا۔

چنانچہ نکہت اپنے شوہر سے علی الاعلان پرہیز کرتی تھی۔

وہ ممتاز کی تصویر کو چومتی، اُسے سینے سے لگائے رکھتی مگر جب ممتاز کو دیکھتی تو اس کا دل مُنہ پھیر لینے کو چاہتا۔

انہیں باتوں کی وجہ سے شادی کے دس ماہ بعد ہی ممتاز اور نکہت میں شدید رنجش پیدا ہو گئی۔ آخر میں نکہت نے صاف کہہ دیا کہ میں ایک دوست کی حیثیت سے تو تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں۔ مگر دوسری بیوی کی موجودگی میں بیوی بن کر رہنا عورت ذات کی ہتک تصور کرتی ہوں میں ایک عورت ہوں —— اور ایک غیرت مند عورت پورے ایک مرد کی عورت بن کر رہنا چاہتی ہے —— میں مرغی نہیں ہوں اور نہ مرد کے لیے اتنی دیوانی ہوں کہ کئی مرغیوں کے ساتھ ایک مُرغ کے پیچھے پیچھے پھرتی رہوں۔

اس پر بات اتنی بڑھی کہ ممتاز نے اُسے گھر سے نکل جانے کو کہا غریب نکہت کہاں جاتی؟ میکے کے دروازے یوں بند تھے کہ سوتیلی ماں کے بھڑکانے سے باپ بھی اُس کا مخالف ہو گیا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ شوہر سے نباہ کیوں نہ کیا۔ شریف گھرانوں کی لڑکیاں ایک کیا کئی سوکنوں کو بھی برداشت کرتی ہیں اور رہی بیماریوں کی بات۔ تو جب خود شوہر ہی بیماریوں کا شکار رہے۔ تو عورت تو اُس کی ایک ادنیٰ لونڈی ہے۔ اس کا اُس کی بیماریوں سے نفرت کرنا اور بچنا کیا معنی رکھتا؟

گویا بدمعاش مردوں کا ساتھ دینا۔ شرمناک بیماریوں کو پھیلانے میں ممدّ معاون ہونا اور مریض بچے پیدا کرنا ہی عین شرافت ہے!

نکہت اچھائی بُرائی میں تمیز کرنا جانتی تھی۔ اُسے نام نہاد مذہبی احکام ناقص قانون اور بوسیدہ رسم و رواج بھلا کیا متاثر کرتے۔ وہ اُن لڑکیوں میں سے نہ تھی جو گناہ پر پردہ ڈالنے والے بڑے بڑے اور سُنہرے ناموں سے مرعوب ہو کر گناہ کو گناہ نہیں سمجھتیں۔ یا جن کی بصیرت نیکی کی اُس آبِ تاب کو نہیں دیکھ سکتی۔ جس پر شیطانوں نے سیاہی پھیر دی ہو۔ وہ گھر بار چھوڑ کر چلدی۔ اور اپنے متعیّن کئے ہوئے راستے پر چلتی رہی۔ ایک اونچ ادھر اُدھر نہیں ہٹی۔ بالآخر وہ اس مقام پر آ پہنچی۔ جہاں سادھو کی کٹیا تھی۔ پاکیزہ رُوح نے پاکیزہ ماحول کو پسند کر لیا۔ اور وہ یہاں رہنے لگی۔

پھُولوں کے مشغلے سے وقت بچتا تو وہ گاؤں والوں یا گرد کل کے برہمچاریوں کے کپڑے سی دیا کرتی۔ اس میں پانچ چھ پیسے روزانہ کی اوسط سے اِسے گزارے کے لیے مل جاتے۔

گاؤں والے اِس کی بہت عزت کرتے اور محبت سے پیش آتے کیونکہ یہ اُن کے بہت کام آتی تھی۔ کوئی بھُوکا ہوتا تو اُسے اپنے حصے کی روٹی کھلا دیتی۔ کوئی بیمار ہوتا تو یہ اُس کا علاج اور دیکھ بھال کرتی اُنہیں حفظانِ صحت کے اصول سمجھاتی، تعلیم حاصل کرنے کا شوق دلاتی اور جو پڑھنا چاہتے اُنہیں پڑھاتی۔ سچائی نیکی محبت اور انسانیت کی باتیں اُنہیں بتاتی۔ اُن کے دُکھ درد میں شریک ہوتی۔

اِسے یہاں رہتے ہوئے پُورے نو سال ہو چکے تھے۔ اُس کی جوانی کا بہترین حصہ سنیاسیوں کی طرح گزرا۔ وہ محبت کی بھوکی تھی۔ محبت کرنا جانتی تھی۔ مگر اس دنیا میں وہ کس سے محبت کرے؟

اُس نے ممتاز کو اپنی محبت کا مرکز بنایا۔ مگر اُسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ جہاں اُس نے محبت کا پودا لگایا تھا وہ جگہ اس کے لئے موزوں نہ تھی۔ نفس پرستی کا ایسا ہیبتناک زلزلہ آیا کہ "نہالِ محبت" کا پتا ہی نہ چلا کہ کہاں گیا۔

اُس نے پھُولوں سے محبت کی مگر یہ محبت بھی نہ نبھ سکی۔ وہ اپنے بستر پر پھُولوں کا انبار لگا لیتی۔ اُن میں اپنا مُنہ چھُپا لیتی۔ اُنہیں اپنے کلیجے سے لگا کر تسکین حاصل کرنا چاہتی۔ مگر صبح کے وقت جب اُنہیں مُرجھایا اور کُملایا ہوا دیکھتی تو وہ رونے لگتی —— کہ میری محبت، پھر تنہا رہ گئی۔ اگر اُسے ممتاز کے دل کا تجربہ نہ ہو چکا ہوتا تو شاید وہ چٹانوں سے محبت کرنے لگتی۔ کیونکہ پھُولوں کی نسبت چٹانیں زیادہ مدّت تک اُس کی محبت کا ساتھ دے سکتی تھیں۔

اُس نے پھُولوں کے شوق میں اپنے غم کو بھلا دینا چاہا۔ اُن کی نکہت نے

فضا میں اپنی آہوں کو کھو دینا چاہا —— معلوم نہیں اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہو سکی ——

وہ پھولوں میں ایسی منہمک ہو گئی کہ اُسے دنیا کا ہوش نہ رہا۔ سادھو نے جب شروع شروع میں اُس کا پھولوں کا شوق دیکھا تو وہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔

ساون کا مہینہ تھا۔ نکہت نے مولسری کے درخت میں جھولا ڈالا جھولے کی رسیوں کو رنگ برنگ کے پھولوں کے ہاروں سے چھپا کر قوس قزح کا منظر پیدا کر دیا۔ نکہت جوگیا رنگ کے کھدر کی ساڑھی باندھے جھولا جھول رہی تھی۔ کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ اُس کا چمپئی رنگ غزالی آنکھیں۔ پنکھڑی کی طرح گلابی ہونٹ۔ اُس پر طرّہ یہ کہ سر سے پاؤں تک پھولوں کے گہنے سے لدی ہوئی "ملکۂ بہار" یا "قزح کائنات" معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کی سفید کلائیاں اور بازو جب پینگ بڑھاتے ہوئے برہنہ ہو جاتے۔ تو ابر آلود فضا کے دھندلکے میں بجلی سی کوند جاتی ——

کچھ دیر تک سادھو خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا اور پھر بہت دیر تک سوچتا رہا۔ بالآخر اُس نے اُس کی حفاظت کی خاطر اُسے "پُشپا دیوی" یعنی پھولوں کی دیوی مشہور کر دیا۔ اُس کی خوبصورتی کو عظمت کی نظر سے دیکھنے کی عادت سارے گاؤں بھر کو ڈال دی۔ لوگ اُسے دیوی ہی سمجھنے لگے

اٹھتر سال کی عمر میں سادھو کا انتقال ہو گیا۔ نکہت اپنے آپ کو یتیم محسوس کرنے لگی۔ اُس نے جھولا اُتار ڈالا۔ پھولوں کا گہنا پہننا چھوڑ دیا باغ کے تمام پھول شاخوں میں لگے لگے مرجھا کر گر پڑتے۔ نکہت بھی مرجھا سی گئی۔ وہ حیران تھی کہ اب دنیا میں اپنا کسے کہے؟ اُس کی زندگی پہلے تو سونی ہی تھی۔ اب بنجر ہو کر رہ گئی۔ سادھو کے غم سے نڈھال ہو کر وہ شدید بیمار ہو گئی۔ بے ہوشی کے عالم میں وہ "پتاجی۔ پتاجی" پکارتی رہتی۔

—— گاؤں کے چودہری کا اٹھارہ[۱۸] سالہ لڑکا اُس کا بھگت تھا۔ دن رات خدمت کرتا اور سچ پوچھو تو اسی کی خدمت گزاری سے نکہت موت کے مُنہ سے بچی۔ افضل اُسے تنہائی میں "دیدی" کہا کرتا تھا اور سب کے سامنے دیوی جی کہا کرتا۔

نکہت نے سادھو کی ایک مورتی بنوا کر کُٹیا کے اندر صدر مقام پر رکھ لی تھی۔ وہ روزانہ صبح اُٹھ کر اشنان کے بعد ہمیشہ کی طرح، پھولوں کا گہنا پہن کر مورتی کو پرنام کرتی اور پھر فوراً ہی تمام گہنا اُتار ڈالتی یہ اُس کا معمول تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ لُو جھلسائے دیتی تھی۔ ان دنوں باغ میں پانی دیتے دیتے نکہت تکان سی محسوس کرنے لگتی۔ وہ اپنی جھونپڑی میں پڑی کروٹیں بدل رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اب اس دنیا میں میرے لئے دلچسپی کی کوئی چیز باقی نہیں ہے۔ اب تو پھولوں سے بھی دل نہیں بہلتا —— ایسی زندگی سے کیا فائدہ؟ —— اس بے کیفی کے احساس سے تو عدم کی تاریکی میں گم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

ٹھیک اسی وقت چودہری کے لڑکے نے باہر سے آواز دی "دیدی" نکہت اپنی حالت درست کر کے باہر نکلی اور پوچھا "بھیا کب آئے؟"
"آج ہی دہلی سے واپس آیا ہوں۔ یہ تحفہ تمہارے لئے لایا ہوں کتابوں اور رسالوں سے تمہیں بہت دلچسپی ہے نا؟ اس میں ایک کہانی ہے "پھولوں کی رانی" معلوم ہوتا ہے لکھنے والے نے تمہیں کو دیکھ کر کہانی لکھی ہے۔"

نکہت نے رسالہ اُس کے ہاتھ سے لے لیا۔ رسالہ کا نام "شاہراہ" تھا۔ ایڈیٹر کا نام تھا ندیم۔ نکہت کو فوراً یاد آ گیا۔ کہ یہ ندیم تو وہی ہیں جو کسی زمانے میں "شفق" نکالتے تھے۔ جس کی دھوم ملک بھر میں تھی

"شفق" کے خاص افسانہ نگار بیابانی یہاں بھی موجود تھے۔ ان کا طرزِ نگارش ندیم سے بہت ملتا جلتا تھا۔ مگر دونوں کے نظریئے میں بہت فرق تھا۔ ندیم "اشتراکی" تھے۔ لیکن اُن کی انشا میں بھی ذرا سا جھلکتی صاف دکھائی دیتی تھی۔ بیابانی ذرا شاد ادی تھے۔ مگر اُن کی ذرا شا بھی حقیقت کے زور سے معمور نظر آتی۔ اس پرچے میں بیابانی کا افسانہ "پھولوں کی رانی" پرچے کی جان تھا۔ نکہت افسانہ پڑھ کر بیابانی کو اپنا "شریکِ خیال" تصور کرنے لگی۔ اُس کی اور اپنی رُوح میں ایک وابستگی سی پانے لگی —— اُس کی آشا بندھ گئی۔ نہ معلوم اُسے کیوں یقین آگیا کہ وہ بیابانی کو اپنا کہہ سکتی ہے۔ اُسے اس اجنبی دُنیا میں اپنا ایک ہم جنس دکھائی دینے لگا اور تنہائی کی جگہ بیابانی کے خیال کو اپنا رفیق پانے لگی ——

"شاہراہ" اُس نے اپنے نام جاری کرالیا۔ رسالے کے ایڈیٹر کو تو وہ بہت مدت سے غائبانہ طور پر جانتی تھی۔ کیونکہ وہ "شفق" کی خریدار رہ چکی تھی۔ ندیم دنیا سے اپنے قلم کا لوہا منوا چکا تھا۔ بڑے سے بڑے مسئلے کو جب وہ اپنے ہاتھ میں لیتا تو دنیا کو اس کا ہمنوا ہوتے ہی بنتی۔ نکہت ندیم کے مداحوں میں سے تھی مگر بیابانی ...؟ وہ تو اس کی ہستی کے ذرّے ذرّے پر چھایا ہوا تھا۔

آخر ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر بیابانی کا پتہ دریافت کرنے کے لیئے اُس نے ایڈیٹر "شاہراہ" کو خط لکھ ہی دیا —— اور بے چینی سے اپنے خط کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

ایک روز دوپہر کے وقت پوسٹ مین نے ایک ہلکے آسمانی رنگ کا لفافہ اُسے دیا۔ نکہت نے نہایت اشتیاق سے اُسے کھولا مگر خط پڑھ کر افسردہ ہوگئی —— بڑی بیگانگی اور بے پروائی کے لہجے میں لکھا تھا کہ "آپ کون ہیں؟ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہیں؟ بیابانی اپنا پتہ کسی کو نہیں بتاتے۔ اس لیئے معذور ہوں؟" نکہت کو ایسی اُمید نہ تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جس طرح وہ ندیم کو مدت سے جانتی ہے۔ اُسی طرح ندیم کو اُسے جاننا چاہیئے تھا۔ "اور آپ کون ہیں" ایسے سخت الفاظ میں سوال کرلینا ندیم ایسے اہلِ دل انسان کا شیوہ نہیں ہونا چاہیئے اور بیابانی؟ وہ دنیا کو اپنا پتہ نہ بتائے مگر نکہت کو ضرور بتا دینا چاہیئے۔ وہ دنیا میں سب سے زیادہ نکہت کے قریب ہے۔ پھر اُسے عام اصول سے مستثنیٰ کیوں نہیں رکھا گیا۔ نکہت نے بے دھڑک اپنے تاثرات ندیم کو لکھ دیئے۔ ندیم خط پڑھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ آج تک ایسا خط اُس کی نظر سے نہ گزرا تھا وہ اُس سے غیر معمولی دلچسپی لینے لگا۔ روز یا ہر دوسرے دن خط لکھنے لگا۔ ایک آدھ مرتبہ اُسے یہ بھی خیال آیا کہ یہ بھی کوئی میرا عقیدت مند مرد ہے۔ جو عورت کا رُوپ اختیار کرکے مجھے اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ مگر ندیم اس غیر معمولی ہستی سے خط و کتابت جاری رکھنے کے لیئے اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ندیم اُس کا گرویدہ تھا۔

وہ اپنے زورِ قلم سے نکہت کے دل میں بھی گھر کرتا جاتا تھا۔ ایک روز شام کے قریب نکہت بہت افسردہ اور مضمحل اپنے باغ میں چارپائی ڈالے پڑی تھی۔ اُس نے کئی اخبار رسالے اور کتابیں اٹھائیں۔ ورق اُلٹے پلٹے اور رکھ دیں۔ اُس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی چلوں، پھولوں سے دل بہلاؤں۔ مگر دل کہتا تھا نہیں —— تب اُس نے خیال کیا، گنگا کنارے جاؤں شاید کچھ سکون حاصل ہو مگر دوسرے ہی لمحہ دل نے اس کی بھی تردید کردی۔ اسی لمحے ڈاکئے کی آواز سن کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ ندیم کا خط آیا تھا لکھا تھا "میری طبیعت صبح ہی سے ناساز تھی کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ دن بھر بستر پر پڑا رہا۔ شام کو اُٹھ کر سوچنے لگا۔ لاؤ کچھ لکھ پڑھ لوں۔ مگر میں نے اپنے آپ کو کسی کام کے قابل نہ پایا۔ لہٰذا سوچا لاؤ آپ کو بھی

خط لکھ ڈالوں" ندیم کے یہ الفاظ نکہت کی محبت کی دکھتی رگ کے لیے زخمہ زن ہو گئے "اظہار محبت" پر صفحے کے صفحے سیاہ کر دینا بھی ان "چند الفاظ" کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتا ۔ ندیم کے ان الفاظ نے نکہت کو ندیم کی طرف کھینچ لیا اور اب بیابانی کے گھر پر ندیم کا پورا قبضہ ہو گیا ۔ مگر پھر بھی جب وہ بیابانی کا کوئی افسانہ "شاہراہ" میں پڑھتی تو اُسے یہ محسوس ہوتا کہ اصل جگہ تو بیابانی کی ہی تھی ۔ جس پر ندیم نے قبضہ کر لیا ہے ۔ وہ محسوس کرتی کہ وہ دل سے بیابانی کو چاہتی تھی مگر ندیم نے زبردستی اُسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ۔

پھر بھی وہ اپنے خطوط میں ہمیشہ اس کا اظہار کرتی رہی ۔ کہ وہ غیر معمولی طور پر خود کو بیابانی سے وابستہ پاتی ہے اور ندیم صرف ایک دوست کی حیثیت رکھتا ہے ۔ ندیم نے اُس سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اُسے بیابانی سے ملا دے گا ۔ مگر کچھ دنوں بعد نہ جانے کیوں بیابانی کے مضامین چھپنے بند ہو گئے ۔ نکہت کی طبیعت پر یہ بہت شاق گذرا ـــــ اُس نے بے چین ہو کر ندیم سے پوچھا ۔ مگر ندیم بات ٹالتا ہی گیا اور اپنے خطوط میں نکہت کو اپنا بنانے میں پوری طاقت صرف کر دی اور کامیاب رہا ۔ نکہت ندیم کے خیال میں ہی آٹھوں پہر کھوئی ہوئی رہنے لگی ـــــ

نکہت زندگی اور قدرت کے شکنجوں میں پھنس گئی تھی ۔ اُس سے یہ الجھنیں برداشت نہ ہو سکیں ۔ اس لیے بیمار رہنے لگی ـــــ اور بہت دنوں تک ندیم کو خط نہ لکھ سکی ۔ افضل تھا تو گاؤں کا لڑکا ـــــ مگر اُسے نکہت کی حالت کا کچھ اندازہ ہو گیا تھا ۔ اُس نے ندیم کو نکہت کی بیماری کا حال لکھ دیا ـــــ ندیم گھبرا گیا اور نکہت کو دیکھنے کے لیے کانگڑہ روانہ ہو گیا ۔

نکہت کے نام ندیم کا تار پہنچا کہ وہ صبح چار بجے کی گاڑی سے آ رہا ہے ۔ نکہت فرطِ مسرت سے اچھل پڑی ـــــ اُسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ تندرست ہے اُس میں نہ جانے کہاں سے اس قدر توانائی آ گئی کہ اُس نے تین ہی گھنٹوں میں گھر کو جھاڑ پونچھ کر دلہن کی طرح سجا دیا باغ بھی درست کر دیا ۔ اور اس کے خیر مقدم کے لیے اسٹیشن جانے کے لیے تیار ہو گئی ۔ افضل نے اپنی بیل گاڑی درست کر لی ۔ مگر اُس نے نکہت کو منع کیا کہ "دیدی" تم بیمار ہو مت چلو ـــــ شام سے چلیں گے تو اسٹیشن پر کہیں نو بجے رات کو پہنچیں گے ۔ اور پھر اسٹیشن پر صبح کے پونے چار بجے تک گاڑی کا انتظار کرنا ہوگا ـــــ تمہیں تکلیف ہوگی ـــــ" مگر نکہت نہ مانی ۔ نکہت اور افضل بیل گاڑی میں روانہ ہو گئے ـــــ راستے میں چھوٹے چھوٹے پل تھے ـــــ کہیں گنگا کے کنارے کنارے سڑک تھی ۔ جنگل اور میدان تھے ۔ آبادی نہ تھی ۔ ایک چھوٹا سا گاؤں ۔ البتہ پل کے اُس پار سڑک سے ذرا فاصلے پر تھا ـــــ چودہری کا لڑکا بہادر تھا اور دیوی کو لوگ عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے اسی لئے یہ لوگ اس خطرناک گرد لغریب راستے سے ایسے بے وقت جا سکتے تھے ۔ ورنہ جھٹپٹا ہوتے ہی راستہ بند ہو جاتا تھا ۔

اسٹیشن پر بیٹھے بیٹھے اُنہوں نے رات گذاری ۔ ٹھیک پونے چار بجے گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچی ۔ نکہت کی عجیب کیفیت تھی ۔ اشتیاق اور خوشی اس حد تک تھے کہ وہ بے چین تھی ۔ انجن سے لے کر گارڈ کے ڈبے تک اُنہوں نے دو تین چکر لگائے ۔ مگر ندیم نہ ملا ۔ بالآخر نکہت اور افضل دونوں ایک ڈبے کے سامنے مایوس کھڑے سوچ رہے تھے کہ اب بقیہ رات بھی یہیں گزاریں اور صبح کی ساڑھے پانچ بجے والی گاڑی بھی دیکھ لیں تب گاؤں واپس ہوں ـــــ

اتنے میں مردانہ حسن و رعنائی کے مجسمے ندیم نے آ کر نکہت سے کہا

"محترم خاتون! معاف فرمائیے کیا میں آپ سے یہ دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ کسے تلاش کر رہی ہیں؟"

نکہت نے جواب دیا "ندیم صاحب ایڈیٹر شاہراہ کو۔"

ندیم نے مسکرا کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھ ہی کو ندیم کہتے ہیں۔"

نکہت نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "ندیم! کیا سچ مچ تم آگئے؟ تم ہی ندیم ہو؟" ندیم نے محسوس کیا کہ جب نکہت کا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے مس ہوا ٹھنڈا تھا اور اب یکایک گرم ہو گیا۔ فرطِ مسرت سے نکہت کا چہرہ دمک رہا تھا۔

ندیم نے کہا "ہاں ہاں یہ دیکھئے!"—— اُس نے جیب سے ایک آسمانی رنگ کا ریشمی رومال جس پر گلاب کی نیم شگفتہ کلی کڑھی ہوئی تھی نکہت کو دکھایا یہ رُومال نکہت ہی نے اُسے بھیجا تھا وہ مسکرا دی۔ اتنے میں چودھری کے لڑکے نے گلاب اور بیلے کے بڑے بڑے پھولوں کی مالا لاکر ندیم کو پہنا دی۔

نکہت اور ندیم دونوں بیل گاڑی میں بیٹھ گئے —— افضل گاڑی چلانے لگا —— ندیم نکہت کی صحت کا حال دریافت کرنے لگا اور افضل کے یہ کہنے پر کہ گذشتہ دوپہر بھی انہیں ۱۰۲ بخار تھا۔ پھر بھی باوجود منع کرنے کے یہ آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن پر آئیں —— ندیم نے شکریہ اور محبت سے بھرپور نگاہیں نکہت پر ڈالیں۔ نکہت ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکی۔ اُس کے رخسار سُرخ ہو گئے اور اُس نے یہ کہتے ہوئے مُنہ پھیر لیا کہ "نہیں میں بالکل اچھی ہوں۔ افضل تو وہمی طبیعت کا آدمی ہے۔ آپ اس کے کہنے پر دھیان نہ دیں۔"

رات کا پچھلا پہر تھا۔ چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ جنگل کا سناٹا، سبزہ زاروں کی مہک۔ میدانوں کی وسعت، اور پاس ہی گنگا کی دھار پگھلی ہوئی چاندی کی طرح بہہ رہی تھی۔ اس کے پانی کی ہلکی ہلکی آواز سے مل جل کر بڑا ہی دلکش اور سہانا منظر تیار کر دیا تھا —— چاند آسمان پر اور ان کی بیل گاڑی زمین پر دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ ندیم سفر کی وجہ سے اور نکہت بیداری اور بیماری کی وجہ سے مضمحل تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نیند کے جھونکوں کو دعوت دے رہے تھے۔ مگر یہ دونوں بیدار رہنا چاہتے تھے۔ کبھی نظر بچا کر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔ کبھی کبھی اُن کی نگاہیں چار ہو جاتیں اور نکہت شرما جاتی کبھی گاڑی کے ہچکولے سے ایک دوسرے سے مس ہو جاتے اور اُن کے جذبات میں طوفان سا برپا ہو جاتا۔ مگر دونوں ہی اپنے جذبات کو ایک دوسرے کی نظروں سے بچانے اور چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔

گھر آکر نکہت تو ندیم کا سامان رکھوانے میں مصروف ہو گئی اور ندیم چاروں طرف ٹہل ٹہل کر نکہت کی خوش ذوقی کی داد دینے لگا۔ اتنے میں افضل نے آکر ندیم سے کہا "آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں" پھوس کے برآمدے میں چارپائی پڑی ہوئی تھی ——

ندیم چارپائی پر پڑ رہا۔ اُس کی آنکھ لگ گئی —— تھوڑی دیر بعد ندیم کی آنکھ کھلی تو اُس نے نکہت کو تلاش کیا۔ نکہت اس وقت حسبِ معمول سادھو کے پرنام کو گئی تھی۔ ندیم کمرے میں آیا تھا اور نکہت کمرے سے نکل رہی تھی۔ ندیم نے ایسا حسین و جمیل پیکر کبھی نہ دیکھا تھا —— خوبصورت سفید کلائیوں میں جوہی کی چار چار لڑیوں کی پہنچیاں، سیاہی مائل خاکستری بالوں پر چنبیلی کے پھولوں کا جال جس کے ہر چار خانے پر ایک گلاب کا نیم شگفتہ پھول ٹکا ہوا۔ جوڑے پر بڑے بڑے گلاب کے پھولوں کا گجرا —— کانوں میں بیلے کے

کے پھول، گلے میں چنبیلی کی نیم شگفتہ کلیوں کی چمپا کلی - تود کی مانند سفید سینے پر جگنو کی جگہ گلاب دمک رہا تھا - سفید باریک کھدّر کی ساڑھی، پھولوں کا گہنا اور نکہت کے بے مثل حسن نے خوبصورتی اور پاکیزگی سے دنیا کو حسین اور پاک بنا دیا تھا —— ندیم بڑی مشکل سے اپنے دل پر قابو پاکر واپس ہوا اور آکر چارپائی پر لیٹ گیا - مگر نکہت کی تصویر اُس کے دل و دماغ کے پردوں پر مرتسم ہوکر رہ گئی۔ نکہت نے پھولوں کا گہنا اُتار ڈالا —— اور ندیم کی خاطر تواضع میں مصروف ہوگئی

"پیاری نکہت ایک مرتبہ اور صرف میرے لئے گہنا پہنو —— دیوتا کے لئے تو پہنتی ہی ہو - کبھی پجاری کے لئے بھی پہنو ——" ندیم نے منّت کرتے ہوئے کہا -

"جس دن بیاباں سے ملاؤ گے اُس روز پہنوگی ——" نکہت نے کہا "تمہیں اب تک یقین نہیں آیا؟ . . . تم ہی بتاؤ، کس طرح تمہیں یقین دلاؤں کہ میں ہی بیابانی کے نام سے لکھتا تھا اور اس لحاظ سے میں ہی بیابانی ہوں" —— ندیم نے کہا اور رحم طلب نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا -

"تم ہی بیابانی ہو . . . اس کا مجھے یقین آگیا ہے - مگر اس یقین نے مجھے یہ بھی یقین دلا دیا ہے کہ بالآخر بیابانی بھی میرا نہیں ہو سکتا - نکہت نے اپنی سانس کو سینے میں ہی دباتے ہوئے کہا ——

"کیوں کیوں . . . . ؟ نکہت ایسا نہ کہو —— بیابانی تمہارا ہے اور تم صرف بیابانی کی —— میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا —— تمہیں میری التجا قبول کرنا ہی پڑے گی - ندیم نے گھبراتے ہوئے لہجے میں کہا -

"یعنی —— ؟" نکہت نے پوچھا -

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور تم سے شادی کروں گا" —— ندیم نے کہا -

"یہ نہیں ہو سکتا - کیونکہ تم شادی شدہ ہو، ایک عورت اپنی کسی ہم جنس کے حقوق پر ڈاکہ نہیں ڈال سکتی" —— نکہت نے کہا -

"ڈاکہ؟ —— نکہت تم کیا کہہ رہی ہو . . . ؟ میری شادی والدین نے کردی تھی - میرا یہ حق ابھی محفوظ ہے کہ اپنے لئے اپنی رفیقۂ حیات کا انتخاب کروں - کسی کے حقوق کی خاطر کیا میرے جائز حق کا گلا گھونٹ دیا جائے گا - میں اُسے ضرور طلاق دے دیتا لیکن چار بچّوں کا کیا ہوگا؟ اور پھر سکینہ طلاق لینے سے قبل ہی خودکشی کرلے گی - مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ وہ تم سے بہت خوش ہوگی —— اور تمہاری قدر کرے گی کہ تم نے اُس کے شوہر کو دوبارہ زندگی بخشی وہ اپنے اس حق سے خود دستبردار ہوجائے گی —— ندیم نے کہا

"مگر میں ایسی عورت کی قدردانی اور خوشی کو کوئی وقعت نہیں دے سکتی جو اتنی بے غیرت ہو —— کہ بخوشی اپنے شوہر کو دوسرے کے سپرد کردے اور خود بھی ایک ذلیل قسم کی حصّہ دار بنی رہے - اور ندیم صاحب آپ تو تعدّد ازدواج کے سخت مخالف ہیں - کئی کتابیں آپ نے اس کی مخالفت میں لکھ ڈالیں - آپ خود عملاً اپنی مخالفت کیسے کریں گے؟ نکہت نے کہا -

"پیاری نکہت —— میں اب بھی اس کا سخت مخالف ہوں اور اس کی مخالفت مرتے دم تک کرتا رہوں گا - مگر تمہاری محبت کے لئے، تمہارے لئے میں بدنامی اور دنیا بھر کی لعنت ملامت سب کچھ سہوں گا - تمہیں حاصل کرنے کے لئے خواہ کتنی بڑی قیمت بھی مجھے دینا پڑے میں بخوشی دوں گا —— مجھے میری نکہت مل جائے اور میں کچھ نہیں چاہتا" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز تھرتھرانے لگی —— مگر اُس نے سلسلہ کلام جاری رکھا "میں یہ تسلیم کرلوں گا،

کہ میں نے یہ گناہ کیا ہے اور بھیانک غلطی کی ہے۔ مگر کائنات کی اعلیٰ ترین چیز کے لئے۔ جس کے بغیر میری ہستی مٹی جا رہی تھی ———"

ندیم نے یہ کہتے ہوئے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

نکہت نے جواب دیا۔ "ندیم تم کچھ بھی کہو۔ مگر میں اس کے لئے تیار نہیں ہوں ——— میں اصولاً اب اس کے لئے بھی تیار نہیں کہ تمہاری محبت کو اپنے دل میں جگہ دیئے رہوں ——— میں کوشش کروں گی کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔ تم سکینہ کے ہو۔ تمہیں اسی کا بن کر رہنا چاہئے ——— میری اس بات کو نہ بھولنا ——— اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو اس محبت کو ہمدردی میں تبدیل کرنے کی کوشش کرو اور ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ میرے خیالات اور اصولوں کی اشاعت کرو۔ خوش قسمتی سے تمہارے اور میرے خیالات ہیں بھی ایک . . . . بس اسی لحاظ سے ہم ایک دوسرے کو اپنا سمجھ لیں گے اور سمجھتے رہیں گے ——— اس سے زیادہ ہم ایک دوسرے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔

ندیم اور نکہت مردے کی طرح زرد اور بے جان دکھائی دیتے تھے۔ ندیم جا رہا تھا اور نکہت اسے اسٹیشن پر چھوڑنے آئی تھی۔ جب ٹرین چلنے لگی تو غیر شعوری طور پر نکہت نے ڈبے کا ہینڈل پکڑ لیا۔ گویا وہ ٹرین کو روک کے رکھنا چاہتی تھی۔ اس کی فطرت نہیں چاہتی تھی کہ ندیم اس سے جدا ہو ——— افضل نے کہا "ہیں ہیں دیدی یہ کیا کرتی ہو" ——— نکہت نے ہینڈل چھوڑ دیا مگر بے خودی اور بے تابی سے وہ ٹرین کے ساتھ ہی ساتھ تیز رفتاری سے چل رہی تھی۔ ندیم بھی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ پلیٹ فارم ختم ہو گیا اور نکہت کو خبر تک نہ ہوئی۔ نکہت گر پڑی۔ ندیم کے منہ سے نکلا "اف"!! مگر اتنے میں ٹرین "سر" سے نکل گئی اور ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

نکہت کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ افضل اسے گاؤں میں واپس لے آیا۔ پھر وہی نکہت تھی اور اس کی قدیم مونس تنہائی۔

شبنم رو رہی تھی۔ پھول ہنس رہے تھے۔ داغ دل ان کے ساتھی تھے۔ نکہت ایسی گری تھی کہ پھر نہ اٹھ سکی۔ کسی نے اسے بیٹھتے یا اٹھتے پھر کبھی نہ دیکھا ——— چار ماہ بعد وہ اس دنیا سے سدھار گئی۔

افضل اس کی قبر کو اب بھی پھولوں کا ڈھیر بنائے رکھتا ہے نکہت کا ساتھ آخر دم تک "پھول ہی دے سکے۔"

"بہت اچھی کہانی ہے۔ مگر تم نے نکہت کو مار کیوں ڈالا؟ یہ برا کیا ——" نادرہ بولی۔

"اس لئے کہ اس سے بہتر اس کا انجام میری سمجھ میں نہیں آیا" میں نے جواب دیا۔

پھر ہم دونوں خاموش ہو کر اس افسانے کے آغاز اور انجام پر غور کرنے لگے ——— ⁂

غم آرزو کو نہ زندہ کر دل بیخبر یہ وہ آگ ہے
جو سلگ اٹھی تو سلگ اٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی
سداماں پروڈکشن
SP
اس تنویر کی تقسیم
ڈائرکٹر:۔ سروتم بادامی
افسانہ نگار:۔ ابراہیم جی
مکالمہ:۔ کشمیری
ایک عورت کی داستان ہے
چنگاری
جسنے اپنی زندگی کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کی جستجو کی
اداکار:۔
بیبنا دیوی۔ پرتھوی راج۔
امی بلیموریا۔ کے داتے
میرا۔ خاتون۔ سنالینی دیوی
تارابائی۔ ماسٹر پانڈے
بھگوانداس
۴ مئی سے
امپیریل سنیما میں سلگ رہی ہے

فلمی خبریں

رنجیت مووی ٹون کا فلم ہرلی بہت کامیاب رہا۔ ۲۷ اپریل سے اسی کمپنی کا زبردست سوشل فلم آج کا ہندوستان دکھایا جا رہا ہے۔ اس فلم میں سب سے زیادہ دلچسپ کام چارلی کا ہے۔ فلم کے ڈائرکٹر مسٹر جینت ڈیسائی ہیں۔

واڈیا مووی ٹون کا فلم جس میں سردار منصور بطور ہیرو کے آ رہے ہیں موسیقی سے لبریز فلم ہوگا۔

کلکتہ فلم ایکسچینج کے تصرف نیو تھیٹر کی "زندگی" بڑے زور شور سے چل رہی ہے جس کے ڈائرکٹر مسٹر بروا ہیں۔ بینگل کے گانے سننے کے قابل ہیں۔ جمنا کی اداکاری بھی خوب ہے۔ کہانی اور ڈائلاگ دلچسپ ہیں۔ اسکے بعد نیو تھیٹرز کے "آندھی" اور "نرتکی" فلم آنیوالے ہیں

پربھات فلم کمپنی کا سنت دھیانیشور جسکے لئے پبلک مدت سے بیچینی کے ساتھ مشتاق تھی۔ عنقریب اسکی نمائش سنٹرل ٹاکیز میں ہوگی۔ اس فلم کو مسٹر ڈاملے اور شیخ فتح لال نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ اس کے بعد مسٹر شانتارام کی ڈائرکشن میں تیار کیا ہوا فلم "پڑوسی" آئے گا۔

منروا مووی ٹون کا تازہ فلم "مَیں ہاری" کرشنا سینما میں بڑے زور شور سے چل رہا ہے اس میں ملکہ حسن نسیم اور نوین یاگنک کام کرتے ہیں۔ ساتھ میں مایا دیوی اور ایرچ تاراپور بھی ہیں۔ اس فلم کی بڑی دھوم مچی ہوئی ہے اور پبلک بہت پسند کر رہی ہے۔ نوین یاگنک کے کام کو بہت سراہا جا رہا ہے۔

بمبئی ٹاکیز کا تازہ فلم "آزاد" راکسی ٹاکیز میں کنگن کے بعد آ رہا ہے۔ اسمیں اشوک کمار لیلا چٹنس اور مینا مہتہ خاص اداکار ہیں۔

سپریم ڈسٹری بیوٹرز کے تصرف سداماں پروڈکشنز کا تہلکہ آفرین فلم "چنگاری" ۴ مئی سے امپیریل سینما میں دکھایا جا رہا ہے اس فلم میں سیتا دیوی۔ پرتھوی راج۔ ای بلیموریا کام کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر مسٹر قیم باداھی ہیں۔

نیشنل سٹوڈیوز لمیٹڈ کا پہلا فلم "عورت" جسکو مسٹر محبوب نے ڈائرکٹ کیا ہے ۴ مئی سے پاتھے سینما میں دکھایا جا رہا ہے۔ اسمیں مسٹر سریندر اور مسز ادا اختر کا کام بہت خوب ہے۔

انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ کی بھوانی نے دنیا کو بہت پریشان کر رکھا ہے تین مہینے سے لوگ اسکا بیچینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ سنا ہے کہ مئی کے دوسرے ہفتے میں بھوانی کے درشن میٹرو سینما میں ہونگے۔ انورادھا۔ کشور ساہو اور مس روز نیز پریتما دیوی نے اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

سرکو پروڈکشن کا فلم "لکشمی" رائل فلم سرکٹ کے تصرف میجسٹک سینما میں بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس فلم میں کمار کی اداکاری کی پبلک بہت داد دے رہی ہے۔ چندر موہن پرتھوی۔ اچ درگا کھوٹے وغیرہ اسی کمپنی میں شامل ہیں۔ سٹوڈیو میں دو تین پکچرز کا شوٹنگ بھی شروع ہے۔

پرتھوی راج
روز
ایشور لال
آج کا ہندوستان
رنجیت کی زبردست تازہ فلم
ڈائرکٹر:-
جینت ڈیسائی
روزانہ:-
۳ - ۶ - ۹ بجے
INDIA TO-DAY
ستارہ
رائل اوپیرا ہاؤس
پچاری

جلد کی خوبصورتی آپ کے بس میں

"گیا گلاب کی پنکھڑی سا رنگ ہے" اس سے زیادہ کوئی کسی عورت کی تعریف نہیں کر سکتا۔ شاید یہ تعریف آپ نے بڑے حسد سے اور دل کیلئے سنی ہوگی۔ لیکن آپ کیوں ناحق حسد کرتی ہیں۔ یہ خوبصورت و نازک رنگ تو ہر ایک عورت کے بس کی بات ہے خواہ وہ غریب ہو یا امیر۔ ہم آپ کو بتلائیں کیسے۔ یہ ایک بڑی آسان ترکیب ہے۔ آپ روز باقاعدہ **پانڈز کریم** استعمال کیجئے۔ اس سے آپ کی جلد ملائم و نازک ہو جائیگی۔ آج ہی سے شروع کر دیجئے۔ روز رات کو اور صبح کو تھوڑا **پانڈز کریم** چہرے پر لگاکر آہستہ آہستہ انگلیوں سے اوپر کی طرف سہلائیے اور پھر کچھ وقت تک جلد میں جذب ہونے دیجئے تاکہ جو میل و تیل جلد پر جمع ہوا ہو وہ نرم ہو جائے۔ بعد میں ایک ملائم کپڑے یا پانڈز ٹشوز سے کریم پونچھ لیجئے۔ پھر دوبارہ اسی طرح کیجئے۔ دیکھئے! اب آپ کو کسی سے حسد کرنیکی ضرورت نہیں آپکا رنگ بھی گلاب کی پنکھڑی کا سا ہو گیا!

پانڈز کریم ہر اچھی دکان میں آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ورنہ **پانڈز۔ پی۔ او۔ بکس ۴۴۱ بمبئی** کو لکھنے سے آپ کو مل سکتا ہے۔

پانڈز کولڈ کریم۔ جلد کو بالکل صاف و ملائم بنا دیتا ہے۔ روزمرہ رات کو اور صبح استعمال کیجئے

پانڈز وانشنگ کریم۔ دن کو استعمال کیجئے یہ آپکی جلد کو دھوپ و ہوا کے اثر سے بچائیگا۔ اور نرم بناکر پاؤڈر لگانے کیلئے تیار کر دے گا۔

ماہنامہ
تنویر بمبئی
THE TANVIR
MONTHLY
BOMBAY-8
FEBRUARY
1940
مدیرہ
"سحر"
Editress
"SAHAR"

NAJMA
(A young member of Tanvir family

Lovely daughter of Mrs Tahira Abdul Qadir of Bangalore
We wish that this young child should enjoy the Independence of Motherland
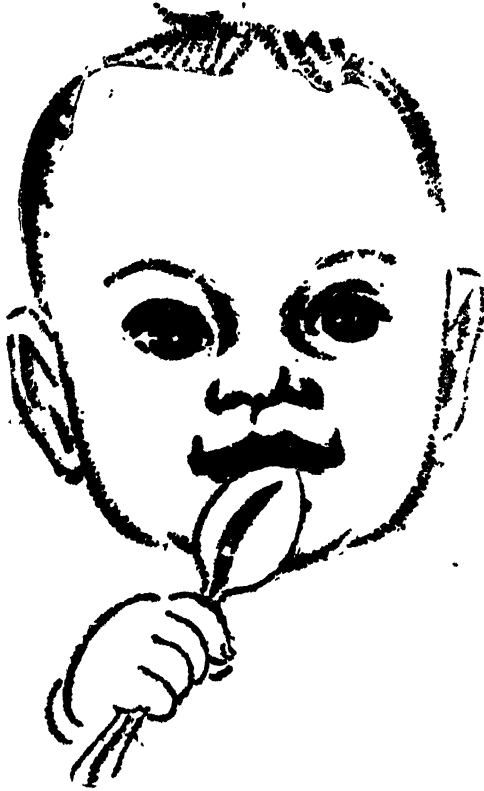
خوش و خرم
بچہ!
جب بچہ کی پرورش گلیکسو سے کیجائے تب صحت کے
بعد مسرت اسی طرح ملتی ہے جسطرح رات کے بعد دن کیونکہ
بچّہ کی ضروریات کو مدّنظر رکھتے ہوئے گلیکسو خالص ترین
دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ بہت جلد
ہضم ہوجاتا ہے۔ اس قدر خالص ہے کہ جراثیم سے قطعی
پاک صاف ہونیکی گارنٹی کیجاتی ہے۔ بچّوں کی نشوونما کیلئے
تمام ضروری اجزا کو اس میں اس حد تک جمع کردیا گیا
ہے کہ بچہ کے مستقبل کیلئے تندرستی کی بنیاد قائم
ہوجاتی ہے۔ چونکہ تندرستی توانائی اور طاقت
کے لئے اس میں بھرپور غذائیت موجود ہے۔
گلیکسو
Glaxo
ہندوستان میں
کافی اسٹاک
موجود ہے
قیمت میں کوئی
اضافہ نہیں کیا گیا۔

ماہنامہ **تنویر** بمبئی

مدیرہ:- **سحر**

نائب مدیرہ:- **انوری خانم**

شرح چندہ

سالانہ ...... ۳ روپے

قیمت فی پرچہ ۴ر

لوکل ۳ر

ممالک غیر سے دس شلنگ
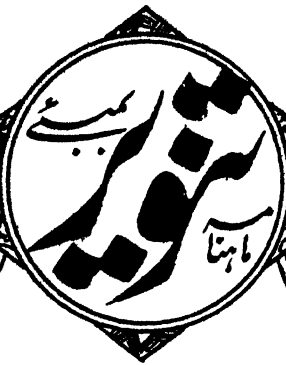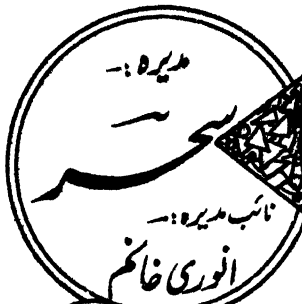
جلد ۴ — شمارہ ۲

فہرست مضامین ماہ فروری سنہ ۱۹۴۰ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا۔

بالوں کی خوبصورتی

عورت کیلئے تاج زینت ہے۔ بال سنوارنے کیلئے جسقدر تکلیف اٹھائی جائے کم ہے۔ اس کیلئے زیادہ صرفہ کی بھی ضرورت نہیں۔ بالوں کو دھونے کیلئے ٹاٹا کے ناریل کے تیل کے شیمپو استعمال کیجئے۔ اس آسان عمل کی کامیابی حیرت انگیز ثابت ہوگی۔

ٹاٹا کا بال سنوارنے کا سامان بہت دوکانوں پر ملتا ہے

اور ہمیشہ پتہ ذیل سے

ٹامکو سیلس ڈیپارٹمنٹ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۰ بمبئی

دی ٹاٹا آئیل ملس کمپنی لمیٹڈ ٹاٹا پورم اور بمبئی

غزل

از حضرت مجنوں گورکھپوری

وہ صورت سامنے ہے اور پہچانی نہیں جاتی
نہیں جاتی نگاہوں کی پریشانی نہیں جاتی

حقیقت حسن کی سو سو طرح روشن ہوئی ہمدم
مگر اپنی نظر کی جلوہ سامانی نہیں جاتی

یہی صورت کلیجے سی لگی رہتی تھی خلوت میں
یہی صورت جو اب محفل میں پہچانی نہیں جاتی

دل عزلت گزیں نے کتنی دنیائیں بسا ڈالیں
مگر معمورۂ وحشت کی ویرانی نہیں جاتی

ادھر امید کی شکلیں بگڑ جاتی ہیں بن بن کر
تمنا کی ادھر تجدید سامانی نہیں جاتی

گذشتہ منزلیں منزل بہ منزل یاد آتی ہیں
مسافر یہ خلش دل کی بہ آسانی نہیں جاتی

جہاں میں کب سے ہے ہنگامۂ دار و رسن برپا
ابھی مجلس میں یاروں کی غزل خوانی نہیں جاتی

چمن میں رنگ و بو کے راز افشا ہو چکے مجنوں
مگر چشم تماشائی کی حیرانی نہیں جاتی

(خاص تنویر کیلئے)

لمعات

قومیت کی لعنت

اس میں شک نہیں کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ اور اسی طرح ہر خاندان کو اپنے گھر میں اور ہر قوم کو اپنے ملک میں اپنی فلاح و بہبود کیلئے خود انتظام کرنے کا حق حاصل ہے چونکہ ہر قوم یا انسان اپنی ضروریات سے جتنا خود واقف ہوتا ہے دوسرے نہیں ہوسکتے۔ بس اسی حد تک ہم قومیت کے قائل ہیں۔ لیکن اگر قومیت کے جذبہ کا اتنا غلبہ ہوجائے کہ انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کا خون پینے کیلئے تیار ہوجائے تو ایسی صورت میں قومیت ایک لعنت ثابت ہوتی ہے۔

آجتک انسانی کوششیں ہمیشہ اس جدوجہد میں مصروف رہیں کہ انسانیت کی تکمیل ہو۔ مذاہب اسی لئے وجود میں آئے شروع شروع میں انہوں نے انسانیت کی قابل قدر خدمت کی مگر بعد میں سب اس عظیم مقصد سے دور جا پڑے ستم بالائے ستم یہ کہ انہیں کا نام لے لیکر انسانیت کو قتل کیا جاتا رہا۔ چنانچہ اہل بصیرت ہر اس چیز کو ترک کردینے پر آمادہ ہوگئے جو انسانی محبت اور ہمدردی کی راہ میں حائل ہو۔ بگڑے ہوئے مذاہب کے خلاف بھی اسی لئے جہاد شروع ہے کہ یہ اپنے مقاصد سے نہ صرف دور جا پڑے بلکہ متضاد شکل اختیار کرلی اور ان کی آڑ سے ہی درندگی اور بربریت کو مدد دی جانے لگی۔ انکی اہمیت کم ہوئی تو انکی جگہ قومیت نے لے لی۔ قومیت کی پُرزور حمایت کرنا آجکل ایک فیشن بنا ہوا ہے مہذب کہلانیوالے ممالک سے یہ وبا نکلی اور سارے جہان میں پھیل گئی۔ قومیت پرست اصحاب مذہب پرستوں کو تو مذہبی دیوانے یا نادان کہنے میں ذرا نہیں ہچکچاتے مگر خود اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر کبھی نہیں دیکھتے کہ بالکل انہی کی طرح ہم بھی تو سراسر نادان اور قومیت کے دیوانے ہیں۔ مذہب تو خیر ان آزاد خیال حضرات کی دنیا میں بدنام ہو ہی چکا۔ مگر ان آزاد خیال حضرات نے قومیت کے خلاف کبھی زوردار آواز نہیں اٹھائی کیا یہ جغرافیائی قسم کا تعصب نہیں ہے؟ وہ خیالی تعصب ہے یہ جغرافیائی تعصب صرف اتنا ہی فرق ہے ورنہ قومیت کو دیکھا جائے تو اسنے بھی دنیا میں اتنے ہی زور سے انسانیت کی ہڈیاں چبائی ہیں جتنی کہ مذاہب نے۔ لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیائے انسانیت سے ایسی چیزوں کو نابید کردیا جائے جو گھن کی طرح انسانیت کو کھوکھلا کئے دیرہی ہیں

ہندوستان اور قومیت

قومیت یورپ کی وباہے اور یورپ ہیں ہی زیادہ مقبول ہوئی۔ دیکھا دیکھی اور ممالک میں بھی یہ جذبہ پھیل گیا۔ اسلام نے قومیت کے جذبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی یہ ایک زبردست انسانی خدمت تھی۔ مگر افسوس کہ وہاں بھی عقائد کی بنا پر انسانی تفریق شدت سے قائم رہی۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب میں چونکہ "دیا" (رحم و کرم) کا عنصر غالب رہا ہے۔ اسلئے قومیت پر انسانیت غالب رہی۔ ظاہر ہے کہ جہاں کے لوگ کیڑے مکوڑوں اور چیونٹی کے

مار دینے پر چیخ اٹھتے ہیں وہ انسانوں کو کیونکر تکلیف پہنچا سکتے ہیں۔ مگر ان کے اس جذبۂ رحم کرم اور انسانی ہمدردی سے غلط رو انسانوں یعنی قومی متعصبوں اور مذہبی متعصبوں نے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا اور آج یہ ابتری یہ افراتفری یہ بے چینی صرف اسی لئے پائی جاتی ہے کہ انسان اپنے ہی سینے کو دوسرے کا سینہ سمجھکر اسمیں خنجر بھونک رہا ہے اسی کے نتیجے کے طور پر آج ہندوستان میں بھی قومی تعصب پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ مگر ہندوستان کی قومیت اور یورپ کی قومیت میں بڑا فرق ہے۔ یورپ کی قومیت انسانیت کو فنا کرنے کیلئے ہے اور ہندوستان کی قومیت انسانیت کے تحفظ کیلئے۔

اگر انگریزوں کا سلوک ہندوستان کے ساتھ غیروں کا سا نہ ہوتا اور وہ کالے گورے کی تفریق روا نہ رکھتے تو آج سوراج کے مطالبہ کی بجائے ہندوستانیوں کا متفقہ نعرہ یہ ہوتا کہ "انگریزوں کی حکومت بھی سوراج ہی ہے۔ انگریز بھی ہمارے ہم جنس یعنی انسان ہیں اسلئے ہماری حکومت انکی حکومت اور انکی حکومت ہماری حکومت ہے۔"

لیکن افسوس یہ ہے کہ انگریز بحیثیت انسان ہمپر حکومت نہیں کر رہے ہیں بلکہ بحیثیت انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ لہذا اس متعصب "حکومت" کو ہٹانا اور مٹانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اور بہت سے انسانیت پسند انگریز بھی اس امر میں ہمارے ساتھی اور حامی ہیں ولایت میں تو خیر وہ انگریزوں کا وطن اور گھر ہے وہاں تو وہ ہمکو کالا آدمی سمجھکر ہم سے تفریق روا رکھتے ہی ہیں حال ہی میں ہمارے محترم دوست مسٹر بابو راؤ پٹیل جو دنیا کا چکر لگا کر آئے ہیں انہوں نے اسی بات پر اپنے موقر اخبار میں ایک نوٹ لکھا ہے کہ "لنڈن میں بہت سے ایسے ہوٹل ہیں جن میں ہندوستانیوں کو نہیں ٹھہرنے دیا جاتا وہ ہوٹل خالص یورپین لوگوں کیلئے وقف ہیں" مسٹر پٹیل نے خوب لکھا ہے کہ "انگریز قوم کیلئے شرم کی بات ہے کہ جس ہندوستان کے دانے پانی پر انگریز پل رہے ہیں۔ جس ہندوستان کی دولت سے وہ عیش و عشرت کر رہے ہیں جن ہندوستانیوں کی بدولت وہ ایمپائر کے مالک کہلاتے ہیں انہیں سے اتنی مغائرت برتتے ہیں کہ ساتھ رہنے سہنے میں عار ہے۔ برعکس جرمن جو انگریزوں کے خون کے پیاسے ہیں انہیں بموں سے بھونتے رہتے ہیں اور سمندر میں غرق کرتے رہتے ہیں۔ ان جرمنوں کو بحیثیت یورپین اپنا سمجھکر ان ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی اجازت ہے" یہ ہے قومیت اور کالے گورے کا فرق!

مسٹر پٹیل کا یہ بیان ہندوستان کی آنکھیں کھولنے کو کافی ہے بشرطیکہ ہندوستانیوں کی رگوں میں بھی غیرت کا خون جوش مار رہا ہو۔ ہندوستانیوں کو بھی چاہیئے کہ یورپ کو انسانیت سوز حرکات سے باز رکھنے کیلئے ہر مناسب کاروائی کریں۔ مگر ہندوستانی تو اول درجے کے بے غیرت ہیں کہ آپس میں حیوانوں کی طرح لڑتے ہیں اور حقوق حقوق کی رٹ لگاتے ہیں مگر یورپ کے منہ پر طمانچہ رسید نہیں کر سکتے۔ اسلئے انگریزوں کی ہمت اور جرأت اس حد تک بڑھ گئی کہ خود ہمارے ملک ہندوستان میں وہ اس قسم کی تفریق روا رکھتے ہیں۔ گوروں کو جو حقوق حاصل ہیں انکا عشر عشیر بھی ہندوستانیوں کو اپنے ملک میں حاصل نہیں ہے۔

یہ ظلم اور انسانیت سوز حرکت نہیں تو اور کیا ہے۔ اور انہیں حرکتوں نے ہمیں اپنے اور پرائے راج کا فرق بتایا۔ اور سوراج کا طلبگار بنایا ورنہ اگر انگریز آج بھی انصاف اور انسانیت سے حکومت کریں تو سوراج کی آواز ہی ناپید ہو جائے انگریزوں کا ہندوستان پر کوئی احسان نہیں ہے۔ برعکس ہندوستان کے احسانات انگریزوں کے روئیں روئیں پر ہیں اس پر بھی ہندوستان اور ہندوستانیوں کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ دنیا میں انہیں بدنام کیا جاتا ہے۔ شاید بدنام کرنیوالوں کو معلوم نہیں کہ رعایا کی اچھی بری حالت کی تمامتر ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آج ہندوستانی جاہل ہیں۔ مفلس ہیں۔ بد اخلاق ہیں۔ بیمار ہیں۔ ان کی عمر کی اوسط کم ہے۔ معیار زندگی پست ہے۔ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں تو اس کی ذمہ داری ہندوستانیوں پر نہیں ہے بلکہ حکومت پر ہے۔ حکومتیں صرف ٹیکس لینے کیلئے نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ رعایا کے ہر اچھے برے فعل کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ آج ہندوستانیوں کو برا بھلا کہنے کا کسی کو حق نہیں ہندوستانیوں میں جو بھی برائیاں ہیں ان سب کی ذمہ دار برٹش گورنمنٹ ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس قوم میں حکومت کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔

عقیدتاً ہم ہندوستانیوں میں قومیت سے زیادہ انسانیت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور اگر آج برٹش حکومت ہمیں بھی اپنے برابر کا انسان سمجھکر اچھے انسانوں کی طرح راج کرے اور ہندوستان انگلینڈ آسٹریلیا۔ کناڈا۔ نیوزی لینڈ افریقہ وغیرہ برٹش ایمپائر میں ہر انسان کو وہی درجہ وہی رتبہ دے جو ایک یورپین انگریز کو دیا جاتا ہے۔ ایک سی ہی تعلیم و تربیت ہو ایک سا ہی معیار زندگی ہو یکساں حقوق حاصل ہوں تو ہم ہندوستانی بحیثیت انسان یہ پکار اٹھینگے کہ ہمیں سوراج نہیں چاہیئے۔ اچھے انسان جو دوسرے انسانوں کو سچے معنوں میں انسان بنائیں انہیں پورا حق حاصل ہے کہ وہ حکومت کے انتظام کو سنبھالیں۔ پھر اپنے اور غیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا انسان سب ایک ہیں کوئی غیر نہیں۔

پرانی اور نئی قسم کی لڑائیاں

اس مرتبہ ایک نوٹ میں بھی لکھنا چاہتی ہوں اور سحر صاحبہ سے مینے اسکی اجازت لے لی ہے۔ چونکہ وہ مجھسے کہا کرتی ہیں کہ تم تنویر کو کب ایڈیٹ کرو گی اسلئے مینے چاہا کہ ابھی سے لکھنے کی مشق کروں۔ اسمرتبہ اسکول میں تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے ایک خیال آیا وہ یہ کہ جو لڑائی ہو رہی ہے بہت غلط طریقہ پر ہو رہی ہے۔ ہم دنیا والے سمجھ رہے ہیں کہ ہم اب بہت عقلمند ہو گئے ہیں حالانکہ ہم ڈوبتے ہی جارہے ہیں۔ مینے تاریخ میں یہ پڑھا کہ جب انسانوں کو ذرا عقل آئی تو انہوں نے حکومت یا انتظام کیلئے سب سے پہلا طریقہ یہ نکالا کہ ان میں سے جو سب سے زیادہ لائق اور بہادر ہوتا تھا اسے اپنا سردار یا بادشاہ بنا لیتے تھے اس سردار کا یہ کام ہوتا تھا کہ وہ سب کی حفاظت کرے اور سب کی تکالیف کو دور کرے سبکا خیال رکھے سب کے جھگڑے نپٹائے اور سبکو آرام سے رکھے۔ اسکے بدلے میں ساری قوم یا قبیلہ اسے بہت عزت و احترام سے رکھتا تھا اسکے آرام اور آسائش کا بھی سب خیال رکھتے تھے مگر جب کبھی دوسری قوم یا قبیلہ سے شدید دشمنی یا لڑائی ٹھن جاتی تھی تو فیصلہ کی یہ صورت ہوتی تھی کہ دونوں قبیلوں کے سردار تلوار لیکر آتے اور آپس میں لڑکر فیصلہ کر لیتے تھے اس لڑائی کو ڈوئیل DUAL کہتے تھے اور اس طرح پر صرف ایک آدمی کے قتل ہونے سے ہی فیصلہ ہو جایا کرتا تھا۔ ہزاروں آدمی نہیں مرتے تھے اور نہ اتنا نقصان ہوتا تھا جتنا کہ اب ہوتا ہے اور بیچارے عوام کیلئے ڈبل مصیبت ہوتی ہے ایک تو یہ کہ سردار کے بہت بڑے اخراجات خود تکلیف اٹھا کر برداشت کریں اسے عزت و برتری بھی دیں۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مصیبت کے وقت بجائے سردار کی حفاظت میں رہنے کے خود اپنی جانیں بھی دیں۔ پھر بھلا کسی کو سردار بنانے سے انہیں کیا فائدہ چنانچہ میرا تو یہی خیال ہے کہ پرانا طریقہ جنگ ہی زیادہ اچھا تھا کیونکہ اس سے نقصان کم ہوتا تھا۔

"مینا"

طبل جنگ

از حضرت امام اکبر آبادی

یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کی ذہنی پستی ماتم کرنیکے قابل ہے۔ اس کا سبب خود غرضی و تعصب ہے۔ اور یہ دونوں جذبے انسان کو بدرجۂ اتم دنی بنا دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں مفکرین کی اگرچہ کمی ہے لیکن اس کا فقدان نہیں۔ آج ملک کے بڑے بڑے لیڈر اور رہنما، پبلک کی رہنمائی کر رہے ہیں لیکن قدامت پرستی ان سے دور نہیں ہوئی۔ کانفرنسیں ہوتی ہیں، جلوس نکالے جاتے ہیں، آتشیں تقریریں ہوتی ہیں، "بندے ماترم" اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے ریزولیشن بھی پاس کئے جاتے ہیں۔ ملک کے سچے خادموں نے جیلیں بھی بھر دیں، سخت و شدید مار سے ان کے جسموں سے خون بھی بہا۔ بھوک پیاس کی شدت کی سختیاں بھی برداشت کیں، گھوڑے اور گولیوں کے نشانے بھی بنے اور پھانسی کے تختوں پر بھی لٹکے اور لٹکائے گئے۔ غرضکہ ملک آزاد کرانے میں کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو ہند کے غریب طبقہ نے برداشت نہ کی ہو، کوئی مصیبت اور کوئی سختی ایسی نہ تھی جسکا بہادرانہ مقابلہ نہ کیا ہو، لیکن اس کے بعد ملا کیا؟ روپیہ میں چند پیسے۔ خیر مزدوری اگرچہ کم اور بہت کم ہے تاہم اس سے مستقبل امید افزا اور روشن نظر آتا ہے۔ بشرطیکہ ہمارے رہنماؤں کا معیار نظر چند پیسوں پر اکتفا نہ کرلے

یہ ظاہر ہے کہ آج دنیا کا کاروبار آگ اور خون کے کھیل کی تیاری جس شدومد کے ساتھ کر رہا ہے، اس سے پہلے ایسی تیاری کبھی نہیں کی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہندوستان نہتا ہے دانایان سیاست اس سے بھی واقف ہیں کہ اگر کسی جانب سے دشمن ملک پر حملہ کرے تو تحفظ کا کوئی سامان نہیں، باوجود اس کے خبرداران زمانہ ٹھوس کام کی طرف رجوع نہیں ہوتے۔ اور اس خبط میں مبتلا ہیں کہ ہمارا بچانیوالا اسفید نا خدا موجود ہے، اور ہمارے سروں پر اس کا سایۂ عاطفت رہنا ہی باعث برکت ہے۔

طبل جنگ کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے،

لیکن ہم دوسرے کے کاندھے پر بندوق رکھکر چلوانا چاہتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ابھی ہم اس قابل نہیں۔ ان نادانوں سے کوئی پوچھے کہ کیا تمہیں تلواروں میں بجلیاں چمکتی نظر نہیں آتیں، کیا توپوں کے کوہ شکن گولوں کی آوازیں سنائی نہیں دیتیں، اور کیا آسمان پر زہریلی گیسوں کے بادل منڈلاتے ہوئے نظر نہیں آرہے ہیں؟ پھر یہ خاموشی کیسی؟ انتظار کس کا؟ اور سوچ بچار کیسا

کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہندوستان کے فرزندوں اور نوجوانوں کی بزدلانہ ذہنیت کو سپاہیانہ ذہنیت میں تبدیل کیا جائے؟ اور ملک کے تحفظ کیلئے کوئی سامان مہیا کیا جائے؟ امراء کا طبقہ تو اس باب میں بالکل ایسا ہے، جیسے کسی سنہری مسہری پر لاش پڑی ہو؛ رہنمایان ملک کا گروہ اپنے سیاسی کھیل میں مصروف ہے، اس طرح جیسے کوئی لکیر کا فقیر بنا ہو۔ اب ضرورت ہے ایک ایسے مرد خدا کی جو ملک کے نوجوانوں کیلئے فوجی تعلیم کا انتظام کرسکے

ہندوستان کے تمام سیاسی، مذہبی، معاشرتی مسائل ایک طرف، لیکن فوجی تعلیم ایک طرف ہے۔ جس ملک میں یہ تعلیم نہیں کچھ نہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ملک وہی زندہ رہیگا، جو صاحب قلم اور صاحب شمشیر ہوگا قلم و سیف مشین کے دو پہیئے ہیں۔ پس اگر کسی مشین کا ایک پہیا غائب ہے تو وہ چل نہیں سکتی۔ قوموں کی ترقی ہو ہی نہیں سکتی جبتک کہ قلم و شمشیر پر قبضہ نہو۔ وہ قوم مردہ ہے، جو ان دونوں چیزوں سے خالی ہاتھ ہے۔

ملک میں تعلیم کی شدید ضرورت تو مدت سے محسوس کیجا رہی ہے۔ اور اس پر عمل درآمد بھی ہے لیکن فوجی تعلیم کی طرف سوائے ڈاکٹر مونجے کے اور کسی کی توجہ نہیں ہے۔ اگرچہ ان کی تعلیم کا مقصد کچھ اور ہے، تاہم اس شعبہ سے ذوق تو ہے۔ جس طرح حرف ناشناس کو جاہل کہا جاتا ہے۔ اسی طرح شمشیر ناشناس کو بزدل کہنا چاہیئے۔ اور بزدل قوم کبھی زندہ نہیں رہ سکتی، بالکل اسی طرح جس طرح آج تمہیں زندگی میسر نہیں ہے ہم زندہ نہیں ہیں، مردہ ہیں، بلکہ مردوں سے بدتر سطحی سیاست میں انقلاب برپا ہے تعلیمات کے شعبہ میں بھی انقلاب کی ضرورت محسوس کیجا رہی ہے، لیکن فوجی تعلیم کو بالکل نظر انداز کر رہا ہے۔

وقت آگیا ہے طبل جنگ کی آواز ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اب ہمیں بھی سپاہیانہ وردی پہن لینا چاہیئے۔ اسکول سے لیکر کالج تک، اور ابتدائی تعلیم سے لیکر انتہائی تعلیم تک لڑکوں کیلئے فوجی تعلیم کو لازمی قرار دیا جانا چاہیئے۔ ملک کے طول و عرض میں کوئی درسگاہ ایسی نہ بنائی جائے، جہاں فوجی تعلیم نہ ہو جس روز بچے کو الف سے روشناس کرایا جائے اسی روز تلوار ہاتھ میں دیکر یہ بھی بتایا جائے کہ یہ تمہاری جان کی محافظ ہے۔ پرائیوٹ مکتبوں میں الف سے اللہ تو پڑھایا جاتا ہے لیکن ت سے تلوار نہیں پڑھائی جاتی۔ حالانکہ جس تعلیم میں تلوار نہیں، کوئی بہادر اس تعلیم کا قائل نہیں ہوسکتا۔ وہ ایسی تعلیم کو جو نہ تو پڑھنے والے کیلئے آبرو بخش ہو اور نہ وطن کے مظلوموں کو ظالم کے پنجہ سے بچا سکتی ہو، بیکار محض سمجھتا ہے۔

وہ انسان جو عالم کی حیثیت رکھتا ہے اور علم سے

باخبر ہے، لیکن دل کا کمزور ہے، اور بزدل ہے، اس شخص کے سامنے مجبور و بیکار ہے، جس کا بازو قوی اور دل قوی ترین ہے۔ وہ فلسفی جو ایک جاہل قوی سے پٹ سکتا ہے، اپنے لئے اور اپنے خاندان کیلئے بیکار ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو اہل قلم نہیں وہ جاہل ہے، لیکن یہ اس سے زیادہ صحیح ہے کہ جو اہل شمشیر نہیں وہ مردہ ہے۔

تاوقتیکہ تلوار ہاتھ میں نہ ہوگی، اور بتانے والا کوئی استاد نہوگا، فن شمشیر سے ہم کیونکر واقف ہوسکتے ہیں؟ وہ زمانہ اور کب آئیگا، جب ہندوستان کا نوجوان تلوار پکڑنا سیکھے گا؟ دوسری قوموں کے بچے تو نشانہ بازی اور شکار بازی کی درسگاہوں میں پل رہے ہیں، لیکن ہندوستان کا بچہ اور جوان ابھی تلوار پکڑنا تو کجا، اس کا تصور تک نہیں کرسکتا۔ آندھی کی طرح جنگ کا طوفان چلا آرہا ہے، لیکن ہم ہیں کہ ابھی دیکھ ہی رہے ہیں۔

میں جس وقت کابل کی سرحد پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہاں کے چھوٹے چھوٹے بچے بھی نشانہ بازی سے واقف ہیں۔ میں نے ایک بچے سے جس کی عمر تقریباً بارہ سال کی تھی، جب دریافت کیا کہ کیا تم نشانہ بازی جانتے ہو؟ جواب دیا کہ جی ہاں جانتا ہوں۔ جب دوسرے لڑکے سے جسکی عمر دس سال کی تھی یہی سوال کیا تو اس کا جواب بھی یہی ملا جو پہلے نے دیا تھا۔ اور جب ۸ سالہ تیسرے بچے سے پوچھا تو اس نے بھی مسکرا کر یہی جواب دیا جو پہلے دو نے دیا تھا۔ اسی طرح جب میں عرب گیا تو چھوٹے چھوٹے لڑکوں کو بندوقوں اور کارتوسوں سے مسلح پایا۔

پس اگر ہندوستان میں بھی یہ طریقہ رائج ہوجائے اور از روئے قانون اس تعلیم کو جبریہ کر دیا جائے تو ہر وقت کا خوف ہمارے دلوں سے دور ہوسکتا ہے۔ اور ہم بھی کام کے آدمی بن سکتے ہیں۔ ضرورت ہے، اور بہت جلد ضرورت ہے کہ تمام اسکولوں اور کالجوں میں اس تعلیم کو رائج کر دیا جائے تاکہ ہندوستان کا ہر بچہ وقت پر ایک جانباز، ایک جاں فروش، اور ایک دلیر سپاہی نظر آئے۔ ہندوستان کو جلد سے جلد ایک ملٹری ملک ہونیکی ضرورت ہے اگر ایسا جلد نہ کیا گیا تو مکمل آزادی ناممکن ہے ؛؛

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶
تار کا پتہ:- "میڈی سنز"
عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب رئیس اعظم دہلی کا عطیہ
اکسیر زنان
وہ عورتیں جو شرم کیوجہ سے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتیں اور ماہواری اور سفید رطوبت کی تکالیف برداشت کرتے کرتے گھُل جاتی ہیں ان کیلئے "اکسیر زناں" پیام زندگی ہے۔ لاکھوں عورتیں اس سے صحت اور تندرستی حاصل کر چکی ہیں مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب بہادر کے خاص مجربات سے ہے۔ ماہواری کی بیقاعدگی ہمیشہ کیلئے دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کیوجہ سے جو سفید رطوبت وغیرہ کی شکایت رہتی ہے اسکو قطعی طور پر بند کر دیتی ہے اور جسم کے جوڑ جوڑ کو مضبوط کرتی۔ چہرہ کی رونق کو بڑھاتی اور حسن و خوبصورتی میں چار چاند لگانے والی ایک سستی دوا ہے جسکی ان خوبیوں کے باوجود بیس خوراک کی ایک شیشی کی قیمت صرف ۹ آنے ہے
اطلاع ضروری
ایام حمل و حیض میں یہ دوا استعمال نہیں کیجاتی۔
پبلک کی اطلاع کیلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہمارا یہ دوا فروخت کرنیوالا ایجنٹ کسی شہر میں نہیں ہے۔ اسلئے بعض شہروں میں جو لوگ اس نام سے کام کرتے ہوئے پائے جائیں انکو ہمارا آدمی تصور نہ کیا جائے اور نہ ایسی دواؤں کو معتبر سمجھا جائے۔
ملنے کا پتہ:- منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

میں اور

از جناب راجہ مہدی علی خاں صاحب

دریچہ جب افق کا کوئی آکر کھول جاتا ہے
نکل کر ماہ سیمیں آسماں پر جگمگاتا ہے
لرز جاتی ہے گھبراتی ہے تھرّاتی ہے تاریکی
سمٹ جاتی ہے چھٹ جاتی ہے چھپ جاتی ہے تاریکی
ترستی ہے کہ روشن چاند کو میں چوم لوں جا کر
پلٹ جاتی ہے لیکن دیکھتے ہی اسکو گھبرا کر
نہیں ممکن کبھی وہ اس سے ہم آغوش ہو جائے
وہ تاریکی ہے کیسے نور کے طوفاں کے پاس آئے
ابد تک بھی وہ روشن چاند کے پاس آ نہیں سکتی
اور اسکے سیمگوں عارض کا بوسہ پا نہیں سکتی
رہینگے عمر بھر یونہی جدا اک دوسرے سے ہم
کہ مل سکتے نہیں نور اور تاریکی کبھی باہم

ایک علمی مقالہ — خاص برائے تنویر

سماج اور شادی

از جناب وحشی آروی

انسان خواہشات نفسانی میں جانوروں سے مختلف نہ تھا۔ لیکن اس نے عقل کو متحرک کر کے زیادہ سے زیادہ افراد کی نجات اور خوش حالی کو پیش نظر رکھکر نفس پرستی اور فرض میں ارتباط پیدا کر دیا۔ اور اس طرح وہ دیگر مخلوقات عالم سے بہت اونچا اٹھ گیا۔ کہیں کہیں تو اس خصوصیت کے باعث وہ انسانیت کی حدود سے باہر نکلکر خدا کے درجہ تک پہنچ گیا ہے۔

حیوانات میں خواہشات نفسانی بقائے نسل کا باعث ہیں۔ انسان نے اسی کے ذریعہ عورت اور مرد کو شارع عام میں مرتے دم تک کا ساتھی بنا دیا تاکہ وہ خواہشات نفسانی کی شدت نہ رہنے پر بھی رنج و راحت اور زندگی کی تمام مشکلات میں ایک دوسرے کیلئے بڑے سے بڑا ایثار کرنے اور اس جسمانی تعلق کو دلکی مقدس آواز کے ماتحت کار آمد بنانے کیلئے ہر وقت تیار رہ سکیں۔

دنیا کی تمام مہذب اور غیر مہذب اقوام میں پائے جانے والے رسم و رواج میں شادی کی رسم سب سے زیادہ پرانی ہے۔ شادی نے انسانی سماج کو جانوروں کے جھنڈ سے علیحدہ کر کے سوشیل ارتقا کی بنیاد ڈالی۔ بغیر اس مستقل وابستگی کے نہ سوسائٹی کی کوئی حیثیت ہی قائم ہو سکتی تھی نہ ان خصوصیتوں میں ارتقائی رفتار کی امید کیجا سکتی تھی جن کی موجودگی نے اسے متمدن یا مہذب کہلانے کے استحقاق تخلیقی سے سرفراز فرمایا۔

جیسے جیسے انسانی سماج شعوری کیفیات سے مالا مال ہوتا گیا ویسے ہی ویسے عورت اور مرد کے اس اختلاط باہمی کا مطمح بھی بلند و بالا ہوتا ہو گیا۔ قدیم اقوام میں عورت صرف ایک "چیز" کی حیثیت رکھتی تھی جسے خواہش کے مطابق رکھا یا پھینکا جا سکتا تھا لیکن تہذیب کی ارتقا کے ساتھ ساتھ شادی کی اہمیت اور ازدواجی رشتہ میں تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ مہذب اقوام میں سب سے زیادہ پاکیزہ، اہم، اور غیر فانی تعلق شادی کو سمجھا جانے لگا۔ اور میاں بیوی زندگی بھر کے معاون تسلیم کئے جانے لگے۔ ہر ملک کی مہذب قوم میں "گھر" انسانیت کا مندر اور شادی فرض و ایثار کے

نقطۂ نظر سے ایک مقدس ترین رشتہ سمجھا گیا۔

اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ ترقی یافتہ قوموں نے ازدواجی مطمح کو اس قدر اونچا کیوں رکھا ؟ انسانی اقلیت کی فطری خواہشات کو اگر رشتہ کا نام لذت سے نہ دیا جاتا تو اس طرح ایک دوسرے کے فرائض کو سمجھنے کی قوت پیدا نہیں ہوسکتی۔ جنسی افتراق بیچ میں بری طرح حائل ہوتا۔ اور انفرادی طور پر میاں بیوی کے دل میں قربانی کا جذبہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ جنسی اتصال سے مرتبط شعوری بیداری کی برکت ہے۔ کہ ہم ماں کو ماں اور بہن کو بہن سمجھتے ہیں۔ اگر شادی کو صرف "کاروباری" شکل دیدیجاتی تو میاں بیوی کا تعلق ذاتی مفاد سے وابستہ ہو جاتا اور کسی کو کسی کے نقصان سے کوئی تکلیف نہیں پہنچتی اس کے علاوہ یہ بھی ممکن تھا کہ عورت اولاد کی پرورش سے متعلق ذمہ داریاں اپنے سر لینے سے انکار کر دیتی۔ چنانچہ اسی لئے شادی کو ایسا اہم رشتہ تسلیم کیا گیا جس میں جسم کے ساتھ روح کو بھی خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس ازدواجی مطمح کو سوسائٹی وقت اور ضرورت کے مطابق رد و بدل کرتی رہی یہاں تک کہ اب یہ صرف دنیائے تخیل کی چیز بنکر رہ گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں تو اس کی تبدیلی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اکثر افراد شادی کی ضرورت پر بھی شبہ کرنے لگے ہیں۔ مستقبل میں شادی کے رواج کی کیا شکل ہوگی ؟ اسکا جواب دینا آسان نہیں۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ سوسائٹی صرف اس کی "کاروباری" شکل کو قائم رکھے گی۔

مغربی ممالک میں "کاروباری" زاویۂ نگاہ کے باعث ازدواجی تعلق کی جس طرح تخریب ہو رہی ہے اسے دیکھکر ہمیں بہت بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ وہاں عورت اور مرد کا رشتہ فرط محبت میں قائم ہوا اور کسی وجہ سے لیکن چونکہ سوسائٹی نے صرف اس کے "کاروباری" پہلو پر غور کرنے کی تکلیف گوارا کی ہے۔ اسلئے کوئی بھی شادی شدہ جوڑا اپنا نقصان برداشت نہیں کرسکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ عورت اور مرد میں ایک محدود عرصہ تک ایسی دلکشی رہتی ہے جسے ذہنی اختلاط کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ لذت اتصال کے سیلاب میں جن کی زندگی کی آبشاریں مخلوط طور پر بہنے لگتی ہیں وہ سیلاب کے ختم ہونے کے بعد بھی علیحدہ نہ ہوکر سکون بخش رفتار کیساتھ سماج کو فیضیاب کرتی ہوئی لامحدود وسعتوں تک بہتی چلی جاتی ہیں۔ ہمیں اگر زندگی کی سب سے خوبصورت تصویر دیکھنی ہو تو ایسے جوڑے کو دیکھنا چاہیئے جو زندگی کی ناہموار خارزار میں ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے اپنی روحانی اتصال کے ذریعہ دنیا کو مستفیض کرنے کے علاوہ اپنی زندگی کی شام میں سوسائٹی پر تقدیس محبت کی بارش کر رہے ہوں جنکی تہذیب میں زندگی کی شام تک مسحور کرنے یا مسحور ہونے کی کوشش میں بھٹکنا لکھا ہوتا ہے وہ ازدواجی زندگی کی اس راحت آفرینی کا خیال بھی نہیں کرسکتے۔ جس میں مرد، عورت کے پیروں کو کانٹے سے محفوظ رکھنے کیلئے زندگی بھر اپنا دل بچھائے رہتا ہے اور عورت، مرد کے ہونٹوں پر ہنسی دیکھنے اور اس کے مشکل راستہ کو آسان بنانے کیلئے اپنی آنکھوں سے اشک مسلسل بہاتی رہتی ہے۔

اس ایثار کے جذبہ کو "کاروباری" مفاد کے خیال سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا۔ ازدواجی رشتہ میں صرف انفرادی سود و زیاں نہ کسی بھی فریق کو مطمئن کر سکتا ہے اور نہ اس جنسی تعلق کو مستقل بنا سکتا ہے۔

عورت بچہ پیدا کرنے اور اس کی پرورش کرنے کے زمانہ میں کسی بھی سماجی کام میں عملی حصہ نہیں لے سکتی۔ لیکن صرف یہی خامی اسے کمزور اور معطل ثابت نہیں کرتی۔ بچے پیدا کرنا ہی قوم اور سوسائٹی کے اجتماعی معیار کو مضبوط بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں عورت کا درجہ مرد سے کسی قدر اونچا ہو جاتا ہے۔ اگر سوسائٹی کو انتہائی عروج پر پہنچانے کیلئے دل میں لامحدود محبت نہیں ہوتی تو عورتیں بچوں کو پال پوس کر اس طرح بھول جاتیں جس طرح حیوانات بھول جایا کرتے ہیں اور پھر انسانی سماج کی جو حالت ہوتی وہ ظاہر ہے ❊ (تمام شد)

غزل

از جناب احمد سعید خاں سینا (حیدرآباد دکن)

ہاتھ روکا ہوا اے پیر طریقت کیوں ہے
لا بڑھا دستِ سبو بند یہ بیعت کیوں ہے

مجھ سے کیوں آپ ہو بے جرم و خطا آج خفا
اتنی نفرت یہ کدورت یہ عداوت کیوں ہے

دل چرائے ہو اب آنکھیں بھی چراتے ہو تم
ورنہ بدلی ہوئی یہ چشمِ مروت کیوں ہے

چٹکیاں لیتے ہو تم دلکو مسل دیتے ہو
اور پھر کہتے ہو افسردہ طبیعت کیوں ہے

نہ تو دلداری کی خو ہے نہ مروت تم میں
تم ہی بتلاؤ مجھے تم سے محبت کیوں ہے

اہلِ محشر سے نہ پوچھو وہ پریشاں ہیں خود
اپنی رفتار سے پوچھو کہ قیامت کیوں ہے

دُور بیٹھا ہے عدو پاس بٹھلائے ہیں مجھے
کچھ نہ کچھ راز ہے سیناؔ یہ عنایت کیوں ہے

راسپوٹن ـــــ مجذوب

از دُکھی پریمنگری

اس شخص کا اصلی نام جارج نوخ تھا لیکن مشہور راسپوٹن کے نام سے ہوا یہ کوئی خدارسیدہ شخص نہ تھا حالانکہ روسی اسے سمجھتے ایسا ہی تھے برخلاف اسکے راسپوٹن ایک گنہگار ہستی تھی جو مملکت روس میں بستی تھی۔ گنہگار ہونیکے باوجود روس میں اسے بہت بڑی طاقت حاصل تھی یہانتک کہ لوگ ایکدفعہ زار کی بات ٹال جاتے تھے مگر نہیں ٹلتی تھی تو راسپوٹن کی بات کیونکہ لوگ اسے ایک پہنچا ہوا فقیر اور روس کا روحانی محافظ گردانتے تھے۔ ہزاروں ان پڑھ روسیوں نے اسے ولیوں کا درجہ بخشدیا تھا انکے نزدیک اس ریاکار کا ہر کام معجزہ سے کم اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ راسپوٹن لوگوں کی جہالت اور مذہبی جنون سے فائدہ اٹھاتا اور ان کے دماغوں میں اپنے متعلق عجیب و غریب سچے جھوٹے عکس اتارتا رہتا۔ اس چالاکی سے تھوڑے ہی عرصہ میں وہ عوام و خواص، پر بغیر تاج کے حکومت کرنے لگا۔ اور اسے نوجوانی ہی میں وہ طاقت حاصل ہوگئی جو بہت سے بادشاہوں کو عمر بھر حاصل نہیں ہوتی۔ یہ شخص اپنا رعب بٹھانے کو عجب مجذوبانہ ہیئیت کذائی میں رہتا۔ میلا کچیلا، گندہ، بال بڑھے ہوئے۔ اندر گھسی ہوئی آنکھوں میں میل جما ہوا۔ مگر یہی گھناؤنا شخص روس کو اپنی انگلیوں پر نچاتا تھا۔ لیکن افسوس اس نے اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اپنے ملک کو تباہی و بربادی کے عمیق گڑھے میں دھکیل دیا۔

گو راسپوٹن اوائل عمر میں سائبیریا کا ایک معمولی کسان تھا لیکن بچپن سے عاشقانہ مزاج پایا تھا ہمیشہ عورتوں کی صحبت پسند تھی اور اب یہاں روس میں تو اس نے بیگمات تک سے تعلق پیدا کر لیا تھا۔ وہ ایکدفعہ گھوڑا چرانے کے الزام میں پکڑا بھی جا چکا تھا تاہم لوگ اس کی توقیر میں کمی نہیں کرتے تھے۔ اس سے اس بات کا پتہ چل سکتا ہے کہ لوگ کس بری طرح اس کی گرفت میں تھے اب اسنے ایک نئی چال چلی اور ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اور ہفتہ واری مجلسوں میں روسا اور امرا کے علاوہ پیٹروگریڈ کی اعلیٰ خاندان کی خاتونیں بھی شرکت کرنے لگیں اور راسپوٹن کا کام اور بھی آسان ہوگیا۔ اب روسیوں نے راسپوٹن کو پیغمبر کا درجہ دیدیا۔ اور اس کے معمولی شعبدوں کو

معجزہ کہنے لگے۔

اتفاقاً ملکہ کا چھوٹا لڑکا بیمار پڑا اور ملکہ نے راسپوٹن کو طلب کیا وہ گیا اور لڑکے کو دیکھا اور صحت کے متعلق پیشگوئیاں کرتا رہا۔ کسی روز کہتا کہ طبیعت بگڑیگی کبھی کہتا آج طبیعت بحال ہوگی اور اسکی پیشنگوئی حرف بحرف صحیح نکلتی۔ اس واقعہ سے اس نے ملکہ کو بھی اپنا معتقد بنالیا۔ حالانکہ یہ سب کرتوت ملکہ کی اس خاص ملازمہ کے تھے جسپر راسپوٹن پہلے ہی ہاتھ صاف کرچکا تھا۔ راسپوٹن کی پیشگوئی کے مطابق یہ خادمہ شہزادے کو خراب دوا پلا دیتی اور کبھی اچھی! خادمہ کی طرح تمام روس میں اس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے جو راسپوٹن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے اور جنکے ذریعہ سے روس میں بڑے بڑے کام ہوتے تھے۔ راسپوٹن کی موت کے بعد اس کے متعلق تمام رازوں کا انکشاف ہوا لیکن بعد مردن! زندگی میں تو کسی کو شک بھی نہ تھا کہ اس فقیر اور مجذوب کے چولے میں ایک پرلے درجہ کا مکار عیار اور دغا باز چھپا ہوا ہے۔ یہ ولایت اور مجذوبیت کی ٹٹی میں شکار کھیلنے والا شخص دراصل جرمنی کیطرف سے روس کی جاسوسی کے کام پر معمور تھا۔ اس کا کام تھا ضروری خبریں پہنچانا اور شاہی خاندان کو اپنے قبضہ میں رکھنا جسکے صلہ میں اسے جرمنی سے بڑی بڑی رقمیں ملتی تھیں اسطرح راسپوٹن کے پاس بیشمار دولت جمع ہوگئی۔ لیکن یہ سرمایہ کہاں گیا یہ ابھی تک ایک عقدہ لاینحل ہے کیونکہ راسپوٹن کے قتل کے بعد اس پر بہت قرض نکلا۔ موت کے بعد جو خطوط اور دستاویز برآمد ہوئیں ان سے پتہ چلا کہ راسپوٹن جرمنی کے جاسوس کی حیثیت سے روس کی تباہی کیلئے بہت زبردست سازشیں کیا کرتا تھا۔ ان خطوں میں سے چند مبارکباد اور آفریں کے خطوط ملے تھے جو جرمنی کی طرف سے اسے چند ضروری اطلاعات پہنچانے پر بھیجے گئے تھے اور کچھ ایسی دستاویزیں تھیں جن میں وہ کارنامے جو اسنے اپنے ملک روس کی تباہی کیلئے کئے تھے درج تھے ہاں یہی ملک جسکا وہ روحانی محافظ بنا ہوا تھا مختصر یہ کہ "پدر پاک" HOLY FATHER جیسا کہ روسیوں نے اسکو لقب دیا تھا ایک سرتا پا غدار تھا۔ جسنے دولت کی لالچ میں اپنے ملک کو دشمنوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔

موت سے کچھ دن قبل چند بڑے آفیسروں کو راسپوٹن پر شبہ ہوگیا تھا اور انہوں نے کچھ ثبوت بھی بہم پہنچائے تھے اور وہ انتظار کر رہے تھے کہ اس کی پاکبازی کا پردہ چاک کرکے اس کے رکیک کارناموں کو عریاں کیا جائے لیکن فی الحال جبکہ تمام روس اس کے ایک لفظ پر اپنی جان قربان کرنیکو تیار تھا یہ کام موزوں نہ تھا کیونکہ عوام اپنے مذہبی پیشواؤں چاہے وہ کتنے ہی خراب ہوں کے متعلق کوئی خراب بات سننے کیلئے تیار نہیں ہوتے آخر ایکروز کو حکومت نے اسپر زناکاری کا جرم عائد کرہی دیا۔ اور وہ اسے عمیق نظروں سے دیکھنے لگے۔ جب راسپوٹن کو اپنی عزت خطروں میں نظر آئی تو فوراً اپنی عبادت گاہ کو چلدیا جو پکرولسکی کے گاؤں میں واقع تھی۔ جب یہ بات دب دبا گئی تو پھر وہ پٹروگریڈ آگیا۔ جہاں اسے معلوم ہوا کہ لوگ اس سے بدظن ہوگئے ہیں اور اس کے خلاف خطرناک سازشوں میں مشغول ہیں اور اس شہر میں اس کی زندگی کی خیریت نہیں ان سب باتوں کو سنکر وہ ہنس دیا حالانکہ اس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔

جیسا کہ ہر شخص کو معلوم تھا کہ راسپوٹن عورتوں سے بہت دلچسپی لیتا ہے اور جہاں کوئی خوبصورت چہرہ نظر پڑے فوراً پھسل جاتا ہے۔ راسپوٹن کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک روز نوجوان شہزادے یوسوپف کے گھر پر اسے مدعو کیا گیا اور یہ بتلایا گیا کہ ایک معزز اور حسین خاتون شہزادے کے توسط سے راسپوٹن سے ملاقات کرنا چاہتی ہے تاکہ نئے مذہب کے متعلق معلومات حاصل کرے دعوت فوراً قبول کر لی گئی کیونکہ راسپوٹن کے ہاتھ نیا شکار چڑھ رہا تھا، میز پر دو بوتلیں بہترین شراب سے پُر رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک میں زہر ملا دیا گیا تھا جب راسپوٹن اپنا گلاس ختم کر چکا تو شہزادہ اور اس کے چھ ہمراہی جو پردوں میں پوشیدہ تھے اس کی موت کا بےچینی سے انتظار کرنے لگے راسپوٹن کے چہرے پر دفعتاً شکنیں پڑ گئیں سامنے پر غضب چہرے سے شہزادے کو گھورا۔ اور فوراً اپنی جیب سے ایک سفید سا سفوف نکالا اور پھانک لیا۔ زہر ایک درجن آدمیوں کی جان لینے کو کافی تھا مگر راسپوٹن بہترین تریاق کھا چکا تھا شہزادے نے اسے سفوف کھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ اسکی جان لینے کی نئی تدبیر سوچ رہا تھا جونہی راسپوٹن خاتون کیطرف متوجہ ہوا شہزادے نے چپکے سے اپنا ریوالور نکالا اور راسپر فیر کر دیا۔ راسپوٹن فوراً چیخ مار کر منہ کے بل گر پڑا اور تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ سب لوگ اپنی کمین گاہوں سے نکل آئے اور اس کی موت پر خوشی کا جام چڑھانے لگے۔ مگر راسپوٹن اپنے کام میں مشغول تھا وہ چپ چاپ سرکتے سرکتے دروازہ تک پہنچ گیا تھا کہ بدقسمتی سے ایک شخص کی نظر جا پڑی اور اس نے اپنا پستول اس پر خالی کر دیا۔ راسپوٹن وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ اس کی لاش کو موٹر میں لیجا کر دریا برد کر دیا گیا اور اس طرح ایک غدار کا خاتمہ ہوا جس نے اپنے ملک کی ثروت دشمنوں کیلئے حاصل کی تھی۔

تف ہے وطن فروش غداروں پر !!!

(تمام شد)

غزل

از جناب شاد عارفی صاحب

اس کا خط آیا ہے آج	قدرت ہی رکھتی ہے لاج
شاد اسے پھر دیکھا آج	دل کی دنیا ہے تاراج
آنکھ نہ ہو تو جلوہ کیا؟	برق حسن مری محتاج
دل مل جانا کفر نہیں	ہٹ دھرمی کا نام سماج
اسکی محفل ہے اور ہم	یوں بھی ہوتی ہے معراج
دیکھ وفاداری کا پھل	تیرے دل پر میرا راج
پائی میں نے چپ کی داد	پوچھ رہے ہیں آپ مزاج
ساقی کو توبہ سے ضد	یا وہاب یا وصاج
لاکھوں فتوے ہیں اور شیخ	خالی بندہ۔ کام نہ کاج
جو کچھ مانگے اس سے مانگ	کل عالم جس کا محتاج

برتے جا خودداری شاد
پاؤں برہنہ۔ سر پر تاج

مغل لائن لمیٹڈ
جو ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئی اور حجاج کے سفر کیلئے سب سے اعلیٰ و ارفع انتظام کر رہی ہے!
مغل لائن سے سفر کیجئے
یہ کمپنی حاجیوں کے سفر کیلئے بمبئی کراچی اور کلکتے سے جدّہ تک حاجیوں کیلئے ماڈرن اسٹیمر پیش کرتی ہے
جہازوں کا بیڑا
ایس ایس اکبر ۴۰۴۳ ٹن
ایس ایس اسلامی ۵۰۷۹ ٹن
ایس ایس خسرو ۴۰۴۳ ٹن
ایس ایس رضوانی ۵۴۴۸ ٹن
〃 〃 علوی ۳۵۶۶ 〃
〃 〃 جہانگیر ۳۵۶۶ 〃
〃 〃 رحمانی ۵۴۶۳ 〃
اور دوسرے کارگو پاسنجر جہازات
بمبئی کراچی سے مکلا، عدن، باربرا، جبوتی، سواکن اور جدہ میں مہینے میں دو بار بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی مارشیس ہر دو ماہ کے بعد!
رہائش:۔ ہر اسٹیمر میں عرشے اور کیبن کے مسافروں کیلئے جگہ مل سکتی ہے۔ ہر اسٹیمر میں قیام و طعام کا بندوبست اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے
تفصیلات کیلئے پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں
مینجنگ ایجنٹ
ٹرنر موریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ
۱۶ بینک اسٹریٹ

اگر یہ وادیٔ رنگیں ہے کوئی خواب حسیں
الٰہی وقفۂ ہستی بھی خواب ہو جائے

از حضرت روش صدیقی

دور شورش کدۂ دہر کے نظاروں سے — نزد تر راحتِ جاوید کے گہواروں سے

ایک وادی ہے جو معمورۂ تنہائی ہے — جسکے آغوش میں اک عالمِ رعنائی ہے

ہو بہو جنتِ آدم ہے وہ بزم تنہا — منزلِ عشرتِ پیہم ہے وہ بزم تنہا

جانِ آبادیٔ عالم ہے وہ بزم تنہا — ہر ادا نقش کشِ انجمن آرائی ہے

یہیں محدود ہے رنگینیٔ دنیا شاید — اٹھ گیا ہے رخِ فردوس سے پردا شاید

سبزہ زاروں میں وہ شمشاد و صنوبر کی بہار — لالہ زاروں میں فروغِ گلِ احمر کی بہار

جوئباروں میں وہ شادابیٔ کوثر کی بہار — حسنِ معصوم ہے خود محوِ تماشا، شاید

خامشی وہ کہ کرے حسن ترنم پیدا — وہ ترنم کہ ہوں جس سے مہ و انجم پیدا

سازِ دل کیلئے مضراب ہے ہر خاموشی — قاصدِ نغمۂ بیتاب ہے ہر خاموشی

کہیں تعبیر کہیں خواب ہے ہر خاموشی ——— حُسن خاموش سے ہے معجزۂ قُم پیدا

سرو شمشاد کے سایہ میں زر افشانی نور — زر پاشیدہ سے داماںؑ زمرّد معمور

چشمِ حیراں نے عجب تابشِ ہستی دیکھی — برق پر برق فضاؤں سے برستی دیکھی

اک شعاعوں سے بسائی ہوئی بستی دیکھی ——— وہ شعاعیں کہ جو ہوں راقمِ افسانۂ طور

محرمِ ظلمتِ بیداد و ستم کوئی نہیں — ان فضاؤں میں شناسائے الم کوئی نہیں

کوئی گردش میں نہیں ساغرِ عشرت کے سوا — کوئی بیتاب نہیں نغمۂ راحت کے سوا

کچھ نہیں آہ! مسرت ہی مسرت کے سوا ——— جیسے معمورۂ کونین میں غم کوئی نہیں

حسن عام کو یہاں فرشِ قدم دیکھا ہے — سنگریزوں کو بھی ہمشکلِ صنم دیکھا ہے

سبزہ ایسا کہ جہانگیر نزاکت کہیئے — وہ گل و برگ کہ جاں بخشِ لطافت کہیئے

وہ خیاباں کہ جنہیں حاصلِ جنت کہیئے ——— ایسا نظارہ کسی آنکھ نے کم دیکھا ہے

نہ مکاں ہے کوئی ایسا، نہ مکیں ایسے ہیں — نہ کہیں حسن ہی ایسا نہ حسیں ایسے ہیں

رخ گلگوں کو مرادِ رخِ سلمےٰ کہیئے — خمِ گیسو کو کمندِ دلِ لیلےٰ کہیئے

ہائے ہر شاہدِ معصوم کو کیا کیا کہیئے ——— حوریں ایسی ہیں نہ خوبانِ زمیں ایسی ہیں

وہ لطافت، کہ صنم خانۂ امکاں میں نہیں
گل و نسریں میں نہیں، لالہ و ریحاں میں نہیں

وہ پری زاد، فرشتے بھی جنہیں پیار کریں
زلف شبگوں میں ستاروں کو گرفتار کریں

حوریں دیکھیں، تو وہیں عشق کا اظہار کریں ——— ایسے محبوب تو کاشانۂ رضواں میں نہیں

ذرہ ذرہ میں ہے اک عشرتِ مستور یہاں
مختصر یہ ہے کہ احساس ہی مجبور یہاں

شام نزہت کی ادا، صبح لطافت کا جمال
حسن کی جلوہ گری، عشق و محبت کا جمال

رونما چار طرف شاہد قدرت کا جمال ——— کہیں جنت سے یہاں، اور کہیں طور یہاں

سازشِ رہزنِ بدبیں کو مٹائے یزداں
فتنہ پردازیٔ گلچیں سے بچائے یزداں

اس خیاباں ہی سے مشرق کے چمن کی زینت
اسی معبد سے ہے اس دیرِ کہن کی زینت

ہے یہی ارضِ حسیں میرے وطن کی زینت ——— اسے اک جنتِ آزاد بنائے یزداں

نالۂ شام غریباں میں اثر پیدا ہو
دور آزادیٔ مشرق کی سحر پیدا ہو

روحِ خوابیدۂ احساس ہو بیدار عمل
ارض کشمیر کے فرزند ہوں سرشار عمل

نوجوانانِ وطن پھر ہوں جہاندارِ عمل ——— اس افق سے کوئی خورشیدِ دگر پیدا ہو

لہ دامانِ زمرد۔ گلمرگ کا وہ شہرۂ آفاق کوہستانی میدان جو اپنی ہمواری و سبز پوشی میں عدیم المثال ہے۔ طلوع و غروب آفتاب کے وقت یہاں زر آفریں کرنوں کا رقص ایک عجیب منظر پیش کرتا ہے۔

تیسرا ہفتہ
MINERVA PRODUCTION
شیلا
آسمان سے ایک ستارہ ٹوٹا
زمین والوں نے اُسے اٹھا لیا
فلم والوں نے اسے پھر آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا ۔ اس جگمگاتے ستارے کو فلم
وصیّت میں دیکھئے
شیلا ایک الھڑ لڑکی کے روپ میں نمودار ہو رہی ہے !
ایک اندھیرے گھر میں اُجالا کرنے کے لئے
اپنی بھولی بھالی صورت سے
اپنی معصوم اداکاری سے
اپنی دلکش موسیقی سے
مکالمے و گانے :- منشی عبدالباقی
میوزک :- خان مستانہ
وصیّت
ڈائرکٹر :- کے، ایم ملتانی
اداکار :- شیلا، جاگیردار، ایرچ تاراپور، سنالینی دیوی، عباس، پرتاپ کامنی، شوبھا، غلام حسین وغیرہ
منروا موویٹون کا تازہ ترین معاشرتی ڈرامہ
نیو ویسٹ اینڈ ٹاکیز
لیمنگٹن روڈ بمبئی
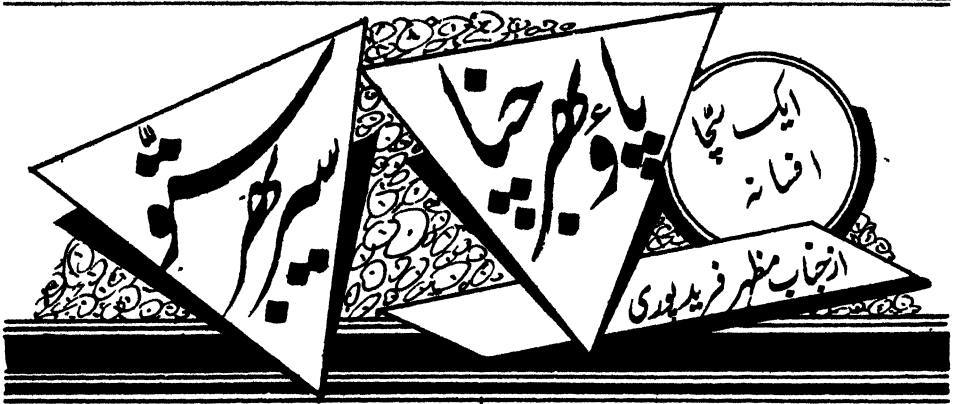
مٹھوا کی بھولی بھالی سیدھی سادھی بھوکی پیاسی اور آدھی ننگی استری نے کہا "آج کھانے کو کچھ نہیں بچے بھوک سے بلک رہے ہیں"

کسی زمانے کے مست اور رنگیلے مگر اب بخار اور کھانسی کے شکار مٹھوا نے جواب دیا "جا ہی رہا ہوں بدھوا کی ماں جا ہی رہا ہوں۔ مزدوری کر کے کما کر لانے مگر جانتا ہوں۔ اس کال کے زمانے میں ہم کھیت مزدوروں کو مزدوری ملنا بھی مشکل ہے۔ اسمجھو ہے"

بدھوا کی مائی نے اپنے پتی کو سڈول مگر روڑے کندھوں کا سہارا دیتے اور ہاتھ میں لاٹھی تھماتے ہوئے کھڑا کر دیا۔

مٹھوا جا رہا تھا۔ ہانپتا کانپتا۔ اپنے روگی شریر کو لاٹھی کے بل پر گھسیٹتا ہوا۔ اپنے گسی۔ سیئے کے زمیندار کے مکان کی اور۔ آشاؤں کا سنہرا اسنسار لئے۔

آخر غریبوں کا بھی خدا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ کیا یہ خدا کیلئے بیرحمی اور ناانصافی کی بات نہ ہوتی؟ کہ وہ اپنے چند بچوں کو تو تنکہ چین عیش و آرام میں رکھے اور باقی کو بھوک پیاس اور دکھ درد میں بلک بلک کر مر جانے دے۔

مٹھوا کو مزدوری کرنے کا موقعہ مل گیا وہ بھی کیسا موقع کام نہ کاج صرف بابو صاحب کی پھلواری میں بیٹھ پاؤ بھر چنے سیر بھر ستو پر چڑیوں کا اڑانا۔

بھانت بھانت کی چڑیوں کا رنگ برنگ کی چڑیوں کا جو طرح طرح کے میٹھے راگ سُنا کر رکھوالے کا دل موہ لیتیں۔ اور پھر ٹھاکہ ڈالتیں۔ سرکار کے زمینداری قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے دن دہاڑے بابو صاحب کی نظروں کے سامنے۔ کہاں مع ببوائی کی ٹھاٹ باٹ یہ پنکھ پنکھیروں کی گستاخیاں۔

بابو صاحب نے ہنستے ہوئے کہا "ابے مٹھوا! اب تجھ سے کیا کام ہو سکے گا۔ تو ہل چلانے سے رہا۔ کوڑنی سوہنی سے رہا۔ دونی اوسونی سے رہا۔ اچھا جا میں بھونگا کسی پن کے کار میں دان کر دیا۔ جا پاؤ بھر چنے اور سیر بھر ستو پیر میری پھلواری میں چڑیوں کو اڑایا کر۔ مگر دیکھ اگر ایک پھل بھی خراب ہوا تو اچھا نہ ہوگا تیری خیر نہیں!!

پاؤ بھر چنا۔ سیر بھر ستو۔ مٹھوا کی آنکھیں جگمگا

اٹھیں۔ چت پرسنّاٹا ہوگیا۔ مانو گاندھی بابا کا سوراج مل گیا ہو اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "سرکار کی دیا ہے تو دیکھئے گا مجھ سے کبھی بھول نہ ہوگی۔"

سرکار کی دیا۔ پاؤ بھر چنے اور سیر بھر ستو کی دیا۔ اسکی کیا اہمیت۔ مگر جس بدنصیب دیش میں مٹھی بھر چنے پر پریوار (خاندان) پلتا ہو اس میں پاؤ بھر چنا۔ سیر بھر ستو تو نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی کٹھن کام کے صلہ ہی میں کیوں نہو۔

جیٹھ بیساکھ کی جلتی بھنتی اور تپتی دوپہریوں میں مٹھوا کسی آم کے درخت کے نیچے پھٹا پرانا بوریا بچھائے ہل ہل ہل کیا کرتا۔ جیٹھ بیساکھ کی دوپہر جب چیل بھی انڈا چھوڑ دیا کرتی ہے مٹھوا اپنا بوریا اور آم کے درخت کا سایہ کبھی نہ چھوڑتا۔ چاہے شیطانی پچھوا کے شریر جھونکے اسکی روگی اور مدھم ہوتی چلی آنکھوں میں من بھر دھول ہی کیوں نہ بھر دیں۔ وہ آم کے سائے میں بیٹھا ہل ہل ہل ہل کیا کرتا اور جب ہل ہل ہل ہل کرتے کرتے تھک جاتا تو لاٹھی کے سہارے اٹھ سارے باغ کا چکّر لگا آتا۔ چالیس بیگھے میں ڈوپ۔ ایک ایک درخت کے چاروں اور اور پھر وہی ہل ہل ہل ہل۔ گرمی کا موسم۔ زمین سے بھاپ سی نکلتی۔ پچھوا کے لپٹوں میں شعلے سے چلتے۔ جدھر دیکھئے اُدھر ساری چیزیں جھُلسی نظر آتیں۔ آم کے درخت کنوئیں پر کے روپ کیلئے۔ زمین کی گھاس۔ غرض سارا کا سارا باغ مرجھایا دیکھ پڑتا۔ سوائے ایک مٹھوا کے۔ کیونکہ اسے مرجھانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ موقع نہ تھا۔ پاؤ بھر چنے اور سیر بھر ستو کے لئے۔

مٹھوا کا بے ہنگم شر۔ دن دوپہر۔ سانجھ سویرے۔ لولو لالا ہل ہل ہلا ہلا کے بے معنی اور بے مطلب ٹکڑوں کا روپ دھارن کئے بابو صاحب کی پھلواری میں گونجا کرتا۔ وہ شام ہوتے گھر جاکر بلکتے بچوں کو پاؤ بھر چنے اور سیر بھر ستو کی گٹھری دینے کا سنہرا سوپن دیکھتا اور اس گٹھری سے بندھی آشاؤں کی دنیا میں مگن رہتا۔

مگر چڑیاں بابو صاحب کی ملکیت کے حقوق، سرکار کے زمینداری قانون اور کارندوں کی لٹھ بند فوج کا مذاق اڑانے والی چڑیاں کیا مٹھوا کی ہل ہل سے ڈر جاتیں۔ نہیں وہ اور بھی زیادہ ٹوٹتیں۔ اگر پہلے اکّے دوکے تو سنگھٹ (مجتمع) ہوکر پھلوں کو نوچتیں کھسوٹتیں۔ خراب کرتیں کیونکہ انہیں یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ ذاتی ملکیت گرانین کا حق کوئی سناتن دھرم نہیں منش کی بنائی دھوکہ بازی ہے۔ وہ پھلوں کو خراب کرتیں۔ مٹھوا کی آنکھوں کے سامنے۔ مٹھوا کی بے ہنگم ہل ہل کے بیچ اور جب مٹھوا لاٹھی ٹیکتے اٹھتا تو اڑ جاتیں۔ اس کی بیماری اور بڑھاپے کا مذاق اڑاتی ہوئیں ہُل ہَل اور ہَل ہَل کی ہنگامی دوپہریوں میں سے ایک دوپہر کی بات ہے کہ مٹھوا اپنا پھٹا پرانا بوریا بچھائے بیٹھا ہل ہل کر رہا تھا کہ یکایک اس کی آنکھ جھپک گئی۔ اور آخر کیوں نہ جھپک جاتی۔ کیا آج صبح اسکے منہ سے خون کی دھار نہ پھوٹ نکلی تھی؟ کیا آج سویرے اسے بڑے زور کا بخار نہ آیا تھا؟ کیا آج اس نے اپنی تمام منتوں سماجتوں کو ٹھکرا کر لاٹھی نہ اٹھائی تھی؟ مارنے کیلئے نہیں بلکہ سہارا لیکر بابو صاحب کی پھلواری کی اور چلنے کیلئے ہُا، ہُل کا بے ہنگم شور مچانے کیلئے۔ کیونکہ اب اسے اس

ہل ہل کے شور سے سہم سا ہوگیا تھا اور آخر کیوں نہ ہوتا اسی ہل ہل ہی پر تو اس کے پریوار (خاندان) کی جیو کا (روزگار) نربھر تھی۔

اس کی آنکھ جھپکی ہی تھی کہ ایک آم گرا ٹپ سے ایک رس بھرا سنہرا سنہرا آم۔ اس کی بند آنکھیں کھل پڑیں اسنے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھانا چاہا کہ ایک بلبل اس پر آ بیٹھا اور اوپر سے آواز آئی چوں چوں چوں چوں، چوں۔ اسے چھوڑ دو۔ اسے چھوڑ دو۔ ہم بھوکے ہیں۔ ہم بھوکے ہیں۔ اس نے اوپر نظر اٹھائی تو دیکھا بلبل کے بھوکے بچوں کو اسے اپنے بچے یاد آگئے۔ [illegible] سوچا چھوڑ دو اس آم کو ایک آم سے بابو صاحب کا کیا بگڑ جائے گا اور چڑیونکا پیٹ بھی تو بھر جاتا ہے۔ اس نے بڑھے ہوئے ہاتھ کو واپس کھینچ لیا اور سوچنے لگا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ بند ہوگئی اور وہ اس نیند کی دنیا سے دور خوابوں کی دنیا میں جا بسا وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا بلبل کے گھونسلے کو اپنی جھونپڑی [illegible] بناتے اور برباد بلبل کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح بھوک [illegible] بلکتے ہوئے جنکے پیٹ ستے اور زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ وہ بے طرح چوں چوں چوں چوں۔ کھانا دو۔ کھانا دو۔ بھوک لگی کھانا دو" کا شور مچائے ہوئے تھے۔ اسنے دیکھا بلبل کی ترائش اور اداس نظروں کو ایک پکے اور رسیلے آم کی طرف جس کا گرانا بلبل کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر پچھوا کے ایک جھونکے نے اسے ٹپکا دیا۔ اور بلبل اس پر بجلی کی طرح جھپٹا۔ اسنے دیکھا اپنے ہی طرح ایک روگی اور بوڑھے مٹھوا کو ایک آم کے باغ میں پہرہ دیتے۔ اور آم گرتے ہی اس کے اٹھانے کے واسطے ہاتھ بڑھانے۔ مگر کچھ دیر بعد کچھ سوچ سمجھکر ہاتھ کھینچ لینے۔ اور پھر آخری بار اس نے دیکھا بلبل کے گھونسلے کو مگر اس دفعہ اس میں وہ اجاڑپن نہ تھا وہ بربادی نہ تھی بلکہ ایک طرح کی شانتی بھوک پیاس کی آشانتی سے چند ریشے آم کے پیٹ میں پڑ جانیکی شانتی اور بلبل مٹھوا رکھوالے کا گن گا رہا تھا۔

سوئے ہوئے مٹھوا کا شریر کانپ اٹھا۔ بند آنکھیں نیم وا ہوگئیں۔ لب سے ایک سرد آہ نکلی اور منہ سے خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ ایک ہچکی اور پھر مکمل سکون۔ اب روگی اور بوڑھا مٹھوا روگی اور بوڑھا نہیں رہا تھا۔ اس نے ان دکھوں اور کشٹوں کی دنیا کو تیاگ دیا تھا۔ اب وہ آزاد تھا سکھی تھا۔

شام ہوتے بابو صاحب باغ کی سیر کو نکلے مگر آج مٹھوا کی ہل ہل نہ تھی۔ وہ روز کے شور وغل والے باغ کی چپی سادھے ہوئی ویرانی میں ٹہلتے ہوئے۔ مٹھوا کے بسترے والے درخت کے نیچے پہنچے۔ بلبل ابھی تک آم کے ریشے نوچ نوچ کر اپنے بچوں کو کھلا رہا تھا اپنے آم کی یہ ہتک دیکھ کر بابو صاحب سے نہ رہا گیا وہ مردہ مٹھوا کو غصے بھری نظروں سے دیکھ کر بولے "مرگیا سالا کہیں کا۔ اچھا ہوا کہ مرگیا۔ ورنہ میرے باغ کے سارے کے سارے پھل چڑیوں کے پیٹ میں چلے جاتے اور یہ کوڑھی یونہی بیٹھا دیکھتا رہ جاتا۔ اچھا اب کل کسی دوسرے ہٹے کٹے نوجوان کو پاؤ بھر چنے اور سیر بھر ستو پہ نوکر رکھ لیا جائیگا۔

نہ معلوم ہندوستان کی ۳۰ کروڑ جنتا (عوام) میں کتنے مٹھوا کتنے بابو صاحب اور کتنی بلبلیں بسا کرتی ہیں جنکی کہانی کسی نے بھی نہ لکھی ۔ (فقط)

۲۷
ستائیسواں ہفتہ
MINERVA PRODUCTION
منروا کا تاریخی شاہکار
ڈائرکٹر:- سہراب مودی
اسٹوری و مکالمے:- امیر حیدر کمال
میوزک:- میر صاحب
پکار
کا
سلور جوبلی ہفتہ
سنیچر ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کو منایا گیا
اداکار:-
سہراب مودی، چندر موہن، نسیم، شیلا، صادق علی،
سردار اختر، جلو، سعادت، مایا دیوی، شاکر، ابوبکر، غلام حسین، رمیش، رام آپٹے
منروا ٹاکیز بمبئی

گدازِ دل

از جناب ادیب مالیگانوی

بخشدی دردِ محبت نے پریشانی مجھے
وہ پریشانی کہ ہے تسکین روحانی مجھے

دفعتاً پھر چھا گیا، کوئی حواس و ہوش پر
لیگئی پھر چھین کر اک موج پنہانی مجھے

اک تجلی دور کی وہ بھی نہایت مختصر
اپنی حیرانی پہ ہی اب تک پشیمانی مجھے

دل کی بیتابی، حریفِ اضطرابِ موج ہے
مژدۂ ساحل سناتی ہے پریشانی مجھے

انکو اپنی بے نیازی پر پسینہ آ گیا
ہو مبارک، انتہائے خانہ ویرانی مجھے

گردشِ قسمت، ترے ہوتے ہوئے افسردگی؟
لا کہیں سے ڈھونڈھ کر تازہ پریشانی مجھے

ہر ادائے حسن تھی دل کیلئے دیوانہ ساز
عمر بھر کرنی پڑی، اپنی نگہبانی مجھے

انکشافِ رازِ دل پردم بخودی کائنات
کر گئی بے پردہ، میری چاک دامانی مجھے

محفل ہستی میں ہے ہستی مری مانند شمع
پردہ دارِ زندگی ہے شعلہ افشانی مجھے

عشق نے سمجھا دئے رازِ حیات جاوداں
خاک کرنا چاہتا تھا عالمِ فانی مجھے

اپنے احسانوں سے وہ محروم ہی رکھیں ادیب
اس پشیمانی سے اچھی یہ پریشانی مجھے

جس طرح شیر اپنے شکار کو کھلا کھلا کر مارتا ہے
بالکل اسی طرح بہادروں نے اپنے کثیر التعداد دشمنوں کو مارا اور اس مارپیٹ میں دونوں جماعتوں کے لوگوں سے وہ وہ حرکتیں سرزد ہوئیں کہ آپ انہیں دیکھکر پیٹ پکڑ کر ہنسینگے اسٹنٹ کیساتھ عشق و محبت اور بے پناہ ظرافت نہایت ہی موثر انداز میں جدت کے ساتھ پیش کرنے کا فخر واڈیا ہی کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے۔
تیسرا ہفتہ
واڈیا کا سنسنی خیز
کامیڈی تھریلر
جسے دیکھکر آپ
ہنستے ہنستے لوٹ جائینگے
ہنٹر والی کا لال
اس فلم میں گھوڑا پنجاب کا بیٹا
اور کتا گن بوٹ ایسے
دلکش کام کرتے ہیں کہ بیساختہ ان
جانوروں پر پیار آتا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ
جانوروں کے کام میں تصنع نام کو نہیں ہوتا۔ لہذا قدرتی اداکاری
کی کیا ہی بات ہے خاصکر گن بوٹ
کتے کے
کام تو خوب ہی ہنساتے
ہیں
ڈائرکٹر:-
ہومی واڈیا
خاص اداکار:-
سردار منصور۔ رادھا رانی۔ پنجاب کا بیٹا
گن بوٹ۔ نظیرہ۔ مٹھو میاں۔ دلپت
احمد دلاور۔ ماسٹر چھوٹو۔ بومن۔
ماسٹر محمد بسم اللہ سنگھانی
ہندوستان کی مشہور رقاصہ
آزوری
کے رقص کے کمالات آپکو محو حیرت
کر دینگے
لیمنگٹن ٹاکیز
لیمنگٹن روڈ بمبئی
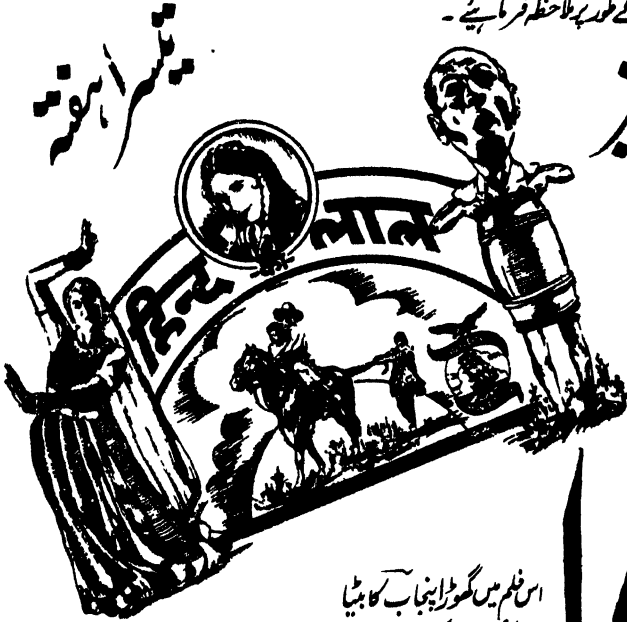
پیٹڈرنا کے چھوٹے سے گاؤں میں جو ملک گیلیشیا میں تھا تقریباً ۱۸۰۰ء میں ایک پارڈینز کا گارشیا رہتا تھا جو عطاری کی دوکان کے ساتھ ساتھ نال نکالنے کیلئے مینڈک۔ سانپ اور مینہ کا پانی بیچا کرتا تھا۔ وہ انسان سے نفرت کرنے والا مجرد تھا اور غالباً اس نامور آدمی کی اولاد میں سے تھا جس نے ایک گھونسے میں سانڈ کو مار ڈالا تھا۔

یہ موسم خزاں کی ایک سرد اور تاریک رات تھی۔ آسمان پر گھنے بادلوں کی وجہ سے اندھیرا چھا رہا تھا اور دنیاوی روشنی کی قطعی عدم موجودگی نے تاریکی کو تمام قصبہ کی گلیوں اور تفریح گاہوں پر، یا جگہ پر قائم رہنے کو چھوڑ دیا تھا۔

اس خوفناک رات کے تقریباً دس بجے جس ناخوشگوار واقعے نے ملک میں بہت زیادہ نحوست پھیلائی۔ اس تفریح گاہ میں جو آجکل باضابطہ تفریح گاہ کہلاتا ہے پرچھائیوں کا ایک گروہ آیا جو آسمان اور زمین کی تاریکی سے بھی زیادہ کالا تھا۔ یہ پرچھائیاں پارڈینز کے گارشیا کے دواخانہ کی طرف بڑھیں جو اس وقت سے قطعی بند تھا جبکہ "مُردوں کی گھنٹیاں" بجتی ہیں یا ٹھیک ۸½ بجے

"ہم کیا کریں؟" پرچھائیوں میں سے ایک نے ٹھیک گیلیشیا زبان میں کہا۔

"کسی نے ہمکو نہیں دیکھا ہے" دوسرے نے کہا۔

"ہمکو کواڑ توڑ دینے چاہئیں!" ایک عورت نے تجویز کیا

"اور انکو مار ڈالو!" تقریباً پندرہ آدمیوں کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔

"عطار کو میں اپنی نگرانی میں رکھونگا!" ایک لڑکا چلّایا

"ہم سب اسکو دیکھیں گے!"

"اس کے یہودی ہونے پر!"

"فرانسیسیوں کی طرفداری کرنے پر!"

"لوگ کہتے ہیں کہ آج بیس ہزار سے زیادہ فرانسیسی اس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں!"

"دراصل مجھے اس کا یقین ہے! وہ جانتے ہیں کہ ہم جہاں محفوظ ہیں لیکن اب وہ ایک جھگمٹ میں پھنس گئی ہیں"

"آہ۔ اگر یہ میرے گھر میں ہوتے! میں تین کرائے داروں کو کنوئیں میں پھینک دیتا!"

"میری بیوی نے تو کل ایک کو قتل کر دیا!"

"اور میں" ایک فقیر نے بھدّی آواز میں کہا "میں نے دو کپتانوں کا دم ان کی کوٹھری میں کوئلہ سلگا کر گھونٹ دیا!"

"اور یہ نامعقول عطار انکو پناہ دیتا ہے!"

"وہ کل کس قدر مؤدب تھا جبکہ ان کمینہ برادری سے خارج لوگوں کے ساتھ گھوم رہا تھا!"

"اسے کس نے ہارڈیز کا گارشیا خیال کیا ہوگا! ایک مہینہ بھی نہیں گذرا کہ وہ گاؤں کا سب سے زیادہ دلیر سب زیادہ محب وطن اور سب سے زیادہ بادشاہ پرور تھا!"

"ہاں اس نے شاہزادہ فرڈیننڈ کی تصویریں اپنی دوکان میں کس طرح فروخت کیں!"

"اور اب وہ نپولین کی تصویریں بیچتا ہے!"

"وہ ہم کو حملہ آوروں کے خلاف اپنی حفاظت کیلئے ابھارا کرتا تھا ——"

"اور جب سے وہ ہیڈرن آئے ہیں اور ان کے ساتھ ملکر سازش کر رہا ہے!"

"اور آج رات وہ سب سرداروں کو دعوت دیتا ہے!"

"سنو وہ کیسا شور مچا رہے ہیں! یہ اچھا ہے کہ وہ یہ نہیں چیخ رہے ہیں کہ خدا شہنشاہ کو سلامت رکھے!"

"صبر کرو" فقیر بڑبڑایا "اب بھی بہت سویرا ہے!"

"ان کو خوب شراب پی لینے دو!" ایک بوڑھی عورت نے کہا "تب ہم داخل ہونگے —— اور ایک بھی زندہ باقی نہ بچے گا!"

"میں کہتا ہوں کہ عطار کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو"

"اس کے آٹھ ٹکڑے کر دو۔ اگر تم چاہو! فرانسیسیوں کا ہمدرد فرانسیسی سے زیادہ قابل نفرت ہے۔ فرانسیسی ایک غیر ملک کو پامال کرتا ہے۔ فرانسیسیوں کا ہمدرد اپنے وطن کو بیچتا اور اس کی بے حرمتی کرتا ہے۔ فرانسیسی دغا کر کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے۔ فرانسیسیوں کا طرفدار باپ یا ماں کو قتل کرتا ہے!"

جبکہ عطار کی دوکان کے دروازے پر یہ سوانگ ہو رہا تھا تو پارڈیز کا گارشیا اور اس کے مست ساتھی خوش خوش کھانے میں بے انتہا محو تھے!

وہ بیس فرانسیسی تھے جنہیں دوا فروش نے اپنے دسترخوان پر مدعو کیا تھا اور وہ سب کے سب سردار اور افسر تھے۔

پارڈیز کا گارشیا پینتالیس سال کا تھا۔ وہ لمبا اور پژمردہ تھا اور ممی سے زیادہ زرد۔ کوئی کہے گا کہ اسکی کھال مرنے کے بعد لمبی تھی۔ اس کی پیشانی گردن کی گدّی تک پہنچتی تھی۔ خدا بھلا کرے چمکتے ہوئے گنجے پن کا کہ اس کے چاروں طرف کچھ کچھ چمک تھی۔ اس کی خواب آلود سیاہ آنکھیں بغیر گوشت کے گڑھوں میں گہری دھنسی ہوئی ان جھیلوں کے مانند تھیں جو پہاڑوں میں گھری ہوتی ہیں جو صرف تاریکی۔ چکر اور حیران کو دیکھتا ہے اسے موت پیش کرتی ہیں۔ جھیلیں جو کسی چیز کا بھی عکس نہیں ڈالتیں جو کبھی بڑا شور کرتی ہیں لیکن بغیر کوئی تبدیلی کئے ہوئے جو ہر اس چیز کو نگل جاتی ہیں جو ان کی سطح پر گرتی ہے۔ جو کوئی چیز واپس نہیں کرتیں جسکی گہرائی کوئی معلوم نہیں کر سکتا۔ جن میں کسی دریا سے پانی نہیں آتا اور جن کیلئے قوت متخیلہ ساکنان تحت الارض کے سمندر کی زمین دیکھتی ہے۔

کھانا کثرت سے تھا۔ شراب عمدہ۔ گفتگو دلچسپ اور پرجوش۔ فرانسیسی ہنسے قسم کھائی۔ خدا اور مذہب کی

توہین کی ۔ گائے ۔ سگریٹ پی ۔ کھایا اور پیا ۔ سب کا سب ایک ساتھ ـــــ

ان میں سے ایک نے نپولین کے در پردہ تعشق کی داستان سنائی ۔ دوسرے نے میڈرڈ میں ۲ مئی کی رات کا قصہ دہرایا ۔ ایک اور نے مخروطی میناروں کی لڑائیوں کے متعلق کچھ کہا ۔ ہنوز ایک اور لوئس شانز دہم کے قتل کے بارے میں کچھ بڑبڑایا ۔

پارڈینز کے گارشیا نے شراب پی ۔ ہنسا اور دوسروں کی طرح بے تکلف گفتگو کرتا رہا ۔ شاید اسے زیادہ اور وہ شاہی وجوہات کے حق میں اس قدر خوش گفتار تھا کہ سیزر کے سپاہی اس کو گلے سے لگا لیتے واہ واہ کرتے اور اس کی شان میں قصائد پڑھتے تھے ۔

"جناب" عطار نے کہا "لڑائی جو ہم ہسپانوی تمہارے خلاف کر رہے ہیں اسی قدر لغو ہے جتنی کہ لاحاصل تم سلطنت کے فرزند اسپین کو اس کی روایتی ذلت سے نکالنے اسکو نقصان سے نجات دلانے ۔ مذہبی تاریکی کو دور کرنے نرالے رسم و رواج کو بہتر بنانے اور ہمیں ان مفید اور مسلّم صداقت کی تعلیم دینے کیلئے آئے ہو کہ کوئی خدا نہیں ہے زندگی کے بعد کوئی روح نہیں ہے ۔ کہ توبہ ۔ روزہ داری پاکیزگی اور دوسرے عام اور صاف بے سروپا بیہودگی ہیں جو ایک مہذب انسان کیلئے غیر مناسب ہیں اور نپولین حقیقی مسیح ہے جو انسانوں کو نجات دلانیوالا ہے اور بنی نوع انسان کا دوست ہے ۔ جناب شہنشاہ خدا کرے اس وقت تک زندہ رہے جیسا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ رہے"

"واہ واہ ! شاباش !" دوسری ٹولی کے آدمی چلائے

عطار نے اپنی پیشانی ناگفتہ بہ اضطراب کے عالم میں جھکا دی ۔

جلدی ہی اس نے پیشانی کو پہلے کی طرح مضبوطی اور سکون سے اٹھا لیا ۔ اس نے شراب کا ایک جام پیا اور اس طرح گویا ہوا ۔

میرے ایک بزرگ نے جو ایک پارڈینز کا گارشیا ایک وحشی ۔ ایک ملاح اور ایک بہت مضبوط آدمی تھا ۔ ایک دن میں دو سو فرانسیسی قتل کر دئے تھے ـــــ میرا خیال ہے کہ یہ اٹلی کا واقعہ ہے ۔ تم دیکھتے ہو کہ وہ میری طرح فرانسیسیوں پر فریفتہ نہ تھا ! اس نے بڑی بہادری سے لڑائی میں سلطنت گراناڈا کے حبشیوں سے اپنے آپ کو چھڑا لیا ۔ عیسائی بادشاہ نے خود اسے بہادری کا خطاب دیا ۔ اور وہ اٹلی میں ایک مرتبہ سے زیادہ محافظ بنا ۔ اس وقت ہمارا چچا الگزنڈر بورجیا پوپ تھا ۔ اور ہو تم نے خیال نہیں کیا کہ میرا خاندان کس قدر بہادر ہے ۔ اس پارڈینز کے گارشیا نے جو میرا جد امجد ہے ـــــ جس کی اولاد میں ایک عطار ہوں ـــــ کوسینزا اور مین فریڈونیا کو فتح کیا ۔ حملہ کر کے سیر نیولا میں داخل ہو گیا ۔ اور پیویا کی لڑائی میں شاندار کارنمایاں کئے ۔ وہاں ہم نے فرانس کے بادشاہ کو جسکی تلوار تقریباً تین صدی میڈرڈ میں رہی گرفتار کر لیا تھا ۔ حتیٰ کہ تین ماہ کا عرصہ ہوا کہ وہ ہم سے بھٹیارے کے اس لڑکے نے لے لی جو تمہارے کمروں پر آتا ہے اور جسے آپ مورات کہتے ہیں"۔

یہاں دوا فروش نے ایک مرتبہ اور بس پیش کیا کچھ فرانسیسی اسے جواب دینے کی خواہش کرتے ہوئے معلوم

ہوئے لیکن اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اور اپنے انداز سے تمام خاموشی پر ایک رعب سا ڈالتے ہوئے بلا کر ایک گلاس اٹھالیا اور بجلی کی گرج کی طرح چلایا۔

صاحبان! میں آپکی صحت کا جام پیتا ہوں اور میرے جد پر لعنت ہو کیونکہ وہ ایک وحشی تھا اور اب وہ دوزخ کی گہرائیوں میں ہے۔ خدا کرے کہ فرانس اول اور نپولین بوناپارٹ کے فرانسیسی بہت دن تک زندہ رہیں!"

"وہ لوگ بہت دن تک زندہ رہیں!" حملہ آوروں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور سب نے اپنے اپنے گلاس خالی کر دیئے۔

اسی درمیان میں انہوں نے گلی میں یا غالباً دوکان کے دروازہ پر شور و غل سنا۔

"کیا تم سنتے ہو؟" فرانسیسیوں نے پوچھا

پارٹڈیز کا گارشیا مسکرایا۔

"وہ مجھے قتل کرنے آئے ہیں" اسنے کہا

"کون؟"

"میرے پیڈرن کے پڑوسی"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں فرانسیسیوں سے ہمدردی کرتا ہوں کچھ راتوں سے انہوں نے میرے مکان کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ لیکن اس میں ہم سے کیا اختلاف ہے؟ ہمیں اپنی دعوت جاری رکھنی چاہیئے۔"

"ہاں بسم اللہ کیجئے۔" مست لوگ چلائے "ہم یہاں تمہاری حفاظت کیلئے موجود ہیں"

اور گلاس سے گلاس ٹکرانے کی بجائے وہ بوتل سے بوتل ٹکراتے ہوئے ایک ساتھ چلائے "نپولین بہت دن زندہ رہے! فرڈی نینڈ کو موت آئے! گیلیشیا کا خاتمہ ہو جائے!"

پارٹڈیز کے گارشیا کو یقین تھا کہ جام صحت انہیں بالکل ساکت کر دیگا۔ اور وہ رنجیدہ لہجہ میں بولا۔

"کیلی ڈونیا!"

کلرک نے دوکان میں گھسنے کی ہمت نہ کرتے ہوئے اپنا زرد اور خوفزدہ چہرہ ایک دروازہ سے نکالا۔

کیلی ڈونیا۔ کاغذ اور دوات لے آؤ" عطار نے اطمینان سے کہا۔

لڑکا لکھنے کا تمام سامان لیکر آیا۔

"بیٹھ جاؤ" اس کے آقا نے کہا "اب ان ہندسوں کو لکھتے جاؤ۔ جو میں تمہیں بتلانے والا ہوں۔ انکو دو کالم میں تقسیم کرو۔ سیدھے ہاتھ کے کالم کے اوپر خرچ لکھو اور دوسرے کالم کے اوپر آمد"

"جناب" کلرک کپکپایا۔ "دروازہ پر شور ہو رہا ہے وہ چلا رہے ہیں کہ عطار کو موت آئے! اور وہ دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں"

"چپ رہو اور انہیں بکنے دو۔ بالکھو جو میں بتاتا ہوں"

فرانسیسی اس وقت دوا فروش کو حساب درست کرنے میں مشغول دیکھکر تعجب و خوشی سے مسکرائے جبکہ موت اور تباہی اس کے گرد منڈلا رہی تھی۔ کیلی ڈونیا نے اپنا سر اٹھایا اور اعداد کو لکھنے کیلئے اپنا قلم تیار کیا۔

"صاحبان۔ دیکھیئے" پارٹڈیز کے گارشیا نے اپنے میز پر بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم میری صرف ایک شراب کے گلاس سے

دعوت جاری رکھنے میں مدد کرو۔ ہمیں میز پر نشست کی ترتیب میں شروع کرنا چاہیئے۔ تم کپتان مجھے بتاؤ کہ تم نے جب سے پری نیز کو عبور کیا ہے کتنے ہسپانویوں کو قتل کیا ہے؟"

"کیا خوب! شاندار خیال!" فرانسیسی چلائے۔

"میں نے۔" مخاطب کئے ہوئے آدمی نے اوپر کو بیٹھتے ہوئے اور اپنی مونچھوں کو شوخی سے کھینچتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے قتل کئے ہیں ذاتی طور سے اپنی ہی تلوار سے ـــــ اوہ۔ دس بارہ لکھ لو"

"ٹھیک ٹھیک گیارہ!" دوا فروش نے اپنے کلرک سے چلا کر کہا

کلرک نے لکھنے کے بعد دہرایا

"خرچ گیارہ"

"اپنا کام کیجئے" میزبان نے کہا "اور آپنے ایم۔ جولی اکیس؟"

"میں نے چھ"

"اور تم نے سردار؟"

"میں نے بیس!"

"میں نے آٹھ!"

"میں نے چودہ!"

"میں نے ایک بھی نہیں!"

"مجھے معلوم نہیں ـــ میں نے تو اندھا دھند گولیاں چلائیں!"

پس ہر ایک نے جوں ہی کہ اس کا نمبر آیا کہ جواب دیا اور کلرک سیدھے ہاتھ پر اعداد لکھتا رہا۔

"کپتان۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے" پارٹنر کے گارشیا نے کہا "ہم پھر آپ ہی سے شروع کرتے ہیں۔ یہ قیاس کرتے ہوئے کہ لڑائی تین سال تک جاری رہیگی۔ آپ باقی لڑائی میں کتنے ہسپانوی قتل کرنیکی امید کرتے ہیں؟"

"اوہ!" کپتان نے جواب دیا "اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے!"

"تخمینہ لگاؤ" میں آپ سے استدعا کرتا ہوں۔

"گیارہ اور لکھ لیجئے!"

"بائیں طرف گیارہ" پارٹنر کے گارشیا نے حکم دیا اور کیلی ڈونیا نے دوہرایا

"آمد گیارہ"

"اور آپ؟" دوا فروش نے اسی ترتیب سے پوچھا جیسا کہ اس نے پہلے عمل کیا تھا۔

"میں۔ پندرہ!"

"میں بیس!"

"میں ایک سو!"

"میں ـــــ ایک ہزار!"

فرانسیسیوں نے اس طرح جواب دیا

"کیلی ڈونیا۔ ان سبکو دس کے نیچے لکھو" ـــ دوا فروش نے طنزیہ کہا۔ "اب دونوں کالموں کو علیحدہ علیحدہ جمع کرو!"

غریب نوجوان جس نے اعداد اپنے بہت زیادہ پسینہ کے قطروں کے ساتھ ساتھ لکھے تھے بوڑھی عورت کی طرح اپنی انگلیوں پر جوڑنے کیلئے مجبور تھا اسکو خوف اس قدر زیادہ تھا۔

ایک ہیبتناک خاموشی کے وقفہ کے بعد اس نے اپنے آقا سے کہا!

" نوج دو سو پچاسی ۔ آمد ذو سو"

" یعنی یہ کہنا چاہیئے" پارڈیز کے گارشیا نے کہا " دو سو پچاسی قتل اور دو سو سزا۔ میزان چار سو پچاسی مظلوم"

اور اس نے ان الفاظ کو اس قدر عمیق اور زوردار آواز سے ادا کیا کہ فرانسیسیوں نے ڈر کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اسی درمیان میں عطار ایک دوسرا حساب قائم کر رہا تھا۔

"ہم غازی ہیں!" وہ اس کو ختم کر کے چلایا۔ ہم نے ستر بوتلیں پی ہیں یا شاید ایک سو پانچ اور شراب کا آدھا پیمانہ جو کیس کے درمیان تقسیم ہو کر ــــ کیونکہ ہر ایک نے اپنا اپنا حصہ پیا ہے ــــ ہر ایک آدمی کے حصے میں پانچ پیمانے آتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہم غازی ہیں!"

اس کے ساتھ ہی دروازے کے جوڑ ترخ گئے اور لڑ کا لڑکھڑاتے ہوئے ہکلا کر بولا!

" اب وہ گھس رہے ہیں!"

" کیا وقت ہے؟" عطار نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"گیارہ ۔ لیکن کیا آپ انہیں کواڑ توڑ کر اندر گھستے ہوئے نہیں دیکھتے؟"

" انہیں آنے دو۔ یہی تو وقت ہے!"

" یہی وقت! کس لئے؟" فرانسیسی اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے دبی زبان سے بولے۔ لیکن وہ اس قدر پیئے ہوئے تھے کہ اپنی کرسیوں پر سے نہ اٹھ سکے

" انہیں گھسنے دو!" انہوں نے اپنی تلواریں بڑی دقت سے کھینچتے ہوئے اور کھڑے ہونے میں کامیاب نہ ہوتے ہوئے شراب سے مست لہجہ میں کہا " ہجوم کو اندر گھسنے دو! ہم انہیں دیکھیں گے!"

اس کے ساتھ ہی دو کان میں نیچے سے ٹوٹ برتن اور بوتلوں کی آواز آئی۔ جنہیں لوگ توڑ رہے تھے اور زینہ سے اوپر سب لوگوں کی ملی ہوئی اور دہشتناک شور و غل کی آواز سنائی دی۔

" فرانسیسی ہمدرد کو موت آئے"

پارڈیز کا گارشیا اپنے مکان میں اس شور و غل کو سنکر اس طرح اٹھا کہ گویا کوئی چیز فوارہ سے اچھل پڑی ہو اور اپنے آپ کو میز کا سہارا دیا تاکہ پھر کرسی پر نہ گر پڑے۔ اس نے اپنے چاروں طرف غیر ممکن الاظہار خوشی سے ایک نظر ڈالی اور اپنے ہونٹوں پر ایک فتحمند و ظفریاب آدمی کی طرح غیر فانی مسکراہٹ پیدا کی۔ پس اس نے موت کے خوف اور دل میں جوش کیوجہ سے صورت بدل کر جب وہ حسین معلوم ہو رہا تھا مندرجہ ذیل الفاظ جو شکستہ اور سنجیدہ تھے اور اس طرح ادا کئے جیسے کہ ماتمی گھنٹے کی پُر درد ضرب کی آواز نکلتی ہے۔

ہسپانویو! اگر تم میں سے کوئی یاس کے سبب دو سو پچاسی ہموطنوں کی موت کا بدلہ اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے دو سو کی زندگی بچانے کا کوئی مبارک موقعہ پاؤ

اگر تم اپنے وجود کو قربان کر کے اپنے اسلاف کی حقیر بدبختی کو دور کر سکو تو دو سو پچاسی بہادروں کے قاتلوں کو سزا دو اور دو سو بھائیوں کو موت سے آزاد کر دو تاکہ محب وطن فوج کے میزبانوں کی تعداد کو دو سو قومی آزادی کے غازیوں سے زیادہ کیا جا سکے۔ کیا تم اپنی نکمی زندگی بچانے کیلئے ایک لمحہ کا بھی توقف کرو گے؟ کیا تم سیمسن کی طرح گر جا کے ستونوں اور مرتے ہوئے لوگوں کو خدا کے دشمنوں کو قتل کرنے کی قیمت کے بطور بغلگیر کرنے میں ایک لحظہ بھی تامل کرو گے؟"

"یہ کیا کہتا ہے؟" فرانسیسیوں نے سوال کیا۔

"جناب۔ باغی لوگ پچھلے کمرہ میں ہیں!" کیلی ٹرونیا چلایا۔

"انہیں گھسنے دو!" پارڈیز کے گارشیا نے کہا۔ "ان کیلئے نشستگاہ کا دروازہ کھول دو! ان سب کو آنے دو ―― یہ دیکھنے کیلئے کہ پیویا کے سپاہی کی اولاد کس طرح مرتی ہے!"

بیوقوف فرانسیسی متعجب ہو کر اور یہ یقین رکھتے ہوئے کہ موت جس کا ذکر ہسپانوی کر رہے تھے۔ فتنہ انگیزوں کی تحریک سے کمرہ میں داخل ہونیوالی تھی۔ شدید خواب غفلت میں اپنی کرسیوں پر جمے رہے اور تلواروں کو اٹھانے کیلئے جو میز پر پڑی ہوئی تھیں بڑی سخت جدوجہد کی۔ لیکن وہ اپنی کمزور انگلیوں سے ان کے قبضے پکڑنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوہا تختہ سے زبردست کشش کیوجہ سے چمٹا ہوا تھا۔

اسی وقت پچاس سے زیادہ آدمی اور عورتیں جو لکڑیوں۔ خنجروں اور پستولوں سے مسلح تھے چیختے ہوئے چمکتی ہوئی آنکھوں سے کمرے میں جھپٹے۔

"ان سب کو مرنے دو!" ایک عورت جو سب سے پہلے داخل ہوئی چلائی۔

"ٹھہرو!" پارڈیز کا گارشیا۔ اس طرح کی آواز۔ ایسے انداز۔ ایسی صورت سے چلایا کہ آواز نے فرانسیسیوں کے سکون اور خاموشی کو اور بھی بڑھا دیا اور ہجوم پر جو اس بلا مزاحمت اور غمگین استقبال کی امید نہیں کر رہا تھا ایک قسم کا خوف طاری کر دیا۔

تمہیں اپنے خنجروں کو چمکانے کی ضرورت نہیں" عطار نے معدوم ہوتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا "میں نے تم سب سے زیادہ مادر وطن کی آزادی کیلئے کام کیا ہے۔ میں نے فرانسیسی ہمدرد ہونیکا بہانہ کیا! اور تم دیکھتے ہو بیس سردار اور افسر ―― حملہ آور ―― بیس۔ انہیں ہاتھ نہ لگاؤ! انہیں زہر دیدیا گیا ہے!"

ہسپانویوں کے دلوں سے فوراً ایک خوف اور تحسین کا نعرہ بلند ہوا۔ انہوں نے بدمستوں کی طرح ایک اور قدم بڑھایا اور دیکھا کہ ان میں سے بڑی تعداد پہلے ہی سے مر گئی تھی۔ جن کے سر آگے کو گرے ہوئے تھے۔ بازو میز پر پھیلے ہوئے تھے اور ہاتھ تلواروں کے قبضوں پر جمے ہوئے تھے۔ باقی جاں کنی کے عالم میں تھے

"پارڈیز کا گارشیا سلامت رہے!" ہسپانوی جو مرتے ہوئے غازی کو گھیرے ہوئے تھے چلائے

"کیلی ٹرونیا" عطار نے آہستہ سے کہا "افیون ختم ہو گئی ہے۔ افیون کیلئے بھیجو ―― کورونا کو" اور

وہ اپنے گھٹنوں پر گر پڑا۔

تب اس کے پیڈرن کے ہمسایوں کو معلوم ہؤا کہ عطار پر بھی زہر اثر کر گیا ہے۔

اس وقت ہر شخص وہ شبیہہ دیکھ سکتا تھا جو اسی قدر ممتاز تھی جتنی کہ خوفناک۔

عورتیں جو زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں اور جنہوں نے اپنی گودوں اور اپنی باہوں میں مرتے ہوئے محب وطن کو لے رکھا تھا اسی طرح اسے دعا دینے اور چھاتی سے لگا کر چھپا لینے میں سبقت کر رہی تھیں جس طرح وہ پہلے اس کی موت کی جستجو میں پیش پیش تھیں۔

آدمیوں نے میز کی تمام بتیاں اکٹھا کر لی تھیں اور جھک کر اس محب وطن اور رحمدل گروہ کے اوپر تھامے ہوئے تھے۔ آخر کار تاریکی میں بیس مردہ یا مرنے والے آدمی پڑے ہوئے تھے۔ جن میں سے کچھ کبھی کبھی خوفناک وزن سے گرتے تھے۔

اور ہر ایک موت کی آہ پر جوسنی جاتی تھی۔ ہر ایک فرانسیسی کے زمین پر گرنے پر ایک شاندار مسکراہٹ پارٹیزن کے گارشیا کے چہرے کو روشن کر دیتی تھی۔ جس کی روح جلد ہی بہشت کو سدھار گئی۔ جسے ایک پادری نے تسکین دی۔ اور جس کیلئے اسکے وطن ہی کے بھائیوں نے ماتم کیا۔

عِلم اور اخلاق

از محترمہ زیب عثمانیہ لودیانوی

جس علم نے اخلاق میں ہمکو نہ اُبھارا
اس علم کے بیوپار سے غالب ہے خسارا

جب عشق ہٹا دیتا ہے میداں سے خرد کو
یہ دور دکھائیگا تجھے ایک نظارا

ہم مشرق و مغرب پہ بھی قابض ہوں تو بے سود
لادیں ہے اگر قوتِ بازو کا سہارا

آزادئ تقدیر کہ پابندئ تدبیر
دونوں میں نہیں ایک بھی انداز ہمارا

ہے خوف تنِ زار سے آتلاف خودی کا
اس چیز کو کافی نہیں تنکوں کا سہارا

اسبابِ علل جب حکما نہ ہوں معلوم
دشوار ہے اس عہد کے بیمار کا چارا

وہ خاتم عالم میں رہی بن کے نگیں زیب
جس قوم نے کی کاوشِ ایام گوارا

(مسلسل)

از سحر

غرضکہ مجھ پر اور میرے مددگاروں پر بھورے کی طرف سے مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ میرے مددگاروں پر تو یہ الزام تھا کہ انہوں نے مجھے اغوا کر کے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے اور مجھپر کئی الزام تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مَیں بدچلن ہوں۔ غضب خدا کا کہ بھورے جیسا بدچلن بداخلاق اور اوباش انسان مجھپر بدچلنی کا الزام لگائے۔ حالانکہ وہ دل میں بخوبی جانتا تھا کہ اس کے بامال کر دینے کے باوجود میرا دامن اب بھی اس قدر پاک تھا کہ اس پر فرشتے نماز پڑھ سکتے تھے۔ اسلئے کہ میرے دلمیں کبھی گناہ کے خیال تک کا بھی گزر نہیں ہوا تھا۔ ایک الزام یہ تھا کہ میں گھر سے چوری کر کے تقریباً ۷ ہزار روپیہ کا مال لیکر بھاگی ہوں۔ ایک الزام یہ بھی تھا کہ مینے جمیل اور بچوں کا اغوا کیا ہے۔ گویا بچّے صرف بھورے ہی کے تھے۔ میرے پیٹ میں ۹ ماہ رہنے' میرے گوشت و خون سے بننے' اور میرا دودھ پینے کے باوجود وہ میرے کوئی نہ تھے۔ اور نہ معلوم کیا کیا الزام لگائے گئے تھے۔ مقدمہ عدالت فوجداری میں کیا گیا تھا۔ مگر دوسری طرف میرے والد شہر کے اصلاح پسند حضرات صلح کی کوشش میں بھی مصروف تھے چنانچہ شہر کے معززین کی معرفت گفت و شنید جاری تھی ایک سرکردہ ڈاکٹر لیڈر اور ایک معزز بیرسٹر صلح سمجھوتے کیلئے پیغامبر بنے۔ مگر میرے اعزہ کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ لڑکی جس ماحول میں ہے۔ اس کے اثر سے نکالکر علیحدہ رکھی جائے۔ تب گفت و شنید ہو سکتی ہے۔ میرے مددگار بھی اسپر آمادہ تھے کہ اگر لڑکی خوشی سے جانا چاہے تو اُسے لے جایا جائے۔ میرے مددگاروں نے مجھپر کبھی کسی قسم کا زور نہیں ڈالا کہ میں انکے پاس ہی رہوں اور اپنے عزیزوں یا اپنی قوم میں نہ جاؤں۔ بلکہ وہ تو مجھے یہی مشورہ دیتے رہے کہ عزیزوں میں نہ سہی تم صلح کے حامیوں کے یہاں رہ سکتی ہو۔ تمہارا کوئی کچھہ نہیں بگاڑ سکتا ہم ہر جگہ تمہاری مدد کرینگے اور خبر لیتے رہینگے۔

مگر میں ایسی ناسمجھہ نہیں تھی کہ اپنے کئے دھرے پر پانی پھیر دیتی۔ اور اپنے مددگاروں سے دور ہو کر اپنے

آپکو آگ میں جھونک دیتی۔ مجھے معلوم تھا کہ عورتوں کو ناقص العقل اور غیر مستقل مزاج کہنے اور سمجھنے والے کس طرح ہمیں بناکر عورتوں کی نرم دلی اور نیکی کا فائدہ اٹھا کر انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔ مرد ذات ہمیشہ یہ سمجھتی آئی ہے کہ عورت کو جس طرح چاہیں بہلا پھسلا کر اپنے کہنے پر عمل کرنے کیلئے مجبور کیا جاسکتا ہے۔ عورت کی اپنی مرضی اور ارادہ کچھ نہیں ہے"۔ اسلئے میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ میں صرف اپنے ضمیر کی آواز پر چلونگی اور اپنی عقل پر بھروسہ کرونگی اور کسی پر اعتماد نہیں کرونگی۔ چنانچہ سختی کا جواب نہایت سختی سے تو میں نے ہی سکتی تھی مگر مجھے خدشہ تھا کہ کہیں نرمی اور مہربانی سے مجھپر قابو نہ پالیا جائے اس کیلئے میں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ کسی کو نرمی یا ملائمیت برتنے اور سمجھانے (کنولیسنگ) کا موقعہ ہی نہ دیتی۔ سلام کے جواب میں "خاموش رہو" اور مزاج پرسی کے جواب میں "تمہیں اس سے کیا؟" غرضکہ شروع ہی میں سیدھی بات کا جواب بھی اُلٹا اور کرخت لہجے میں دیتی تاکہ مخاطب کے دل میں نرمی کا جذبہ ہی پیدا نہ ہوسکے۔

میں اپنی قوم کی ہر سختی اور تشدد برداشت کرنے کو تیار تھی چونکہ جانتی تھی کہ اس سے زیادہ ظلم اور تشدد مجھپر اور کیا ہوسکتا ہے جو کیا جاچکا ہے۔ لیکن میں انکی نرمی اور مہربانی کی متحمل نہ ہوسکتی تھی کیونکہ اپنی فطرت سے واقف تھی کہ نرمی کی زد سے میں نہیں بچ سکتی۔ نرمی کا جادو میرے دل پر ضرور اثر کرتا اور ان کے جال میں پھنسا دیتا۔ اور پھر کیا ہوتا اس کا جواب میرا دماغ قصے کہانیوں کی شکل میں میرے سامنے پیش کر دیتا کہ

"فرض کرو فلاں خاندان کی لڑکی شدید مظالم سے تنگ آکر اسی طرح گھر سے بھاگ گئی تھی اسنے یہ غلطی کی تھی کہ لامذہبی یا الحاد کا اعلان نہیں کیا تھا جس سے تنگ خیال انسانوں کے نزدیک ان کے مابین ایک آہنی دیوار کھڑی ہوجاتی ہے اور قریبی عزیزوں میں دوری پیدا ہوجاتی ہے اس لڑکی نے اپنے ہی ہم مذہبوں میں پناہ لی تھی۔ بہت کوششوں کے بعد اس کے رشتہ دار اسے بہلا پھسلا کر واپس گھر لے آئے۔ دو چار دن تو اسے اچھی طرح رکھا۔ بعد میں اسے بے عزت اور بُرا سمجھکر ہتک آمیز سلوک کرنے لگے کہ اس لڑکی کو سوائے خودکشی کے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ وہ اپنی جان سے گئی مگر گھر والوں نے سجدۂ شکر ادا کیا کہ عزت پہ پردہ پڑا رہ گیا۔

ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا کہ ایک مسلمان لڑکی ناقابل برداشت مظالم اور خلاف فطرت خودساختہ مذہبی پاکھنڈوں سے تنگ آکر عیسائی ہوگئی بہت جدوجہد کے بعد اعزہ اس بات میں کامیاب ہوگئے کہ اس لڑکی کے قدموں میں سر رکھ رکھکر اور قسمیں کھا کھا کر۔ اسے وعدہ دیئے گئے کہ جو وہ کہے گی اسپر عمل کیا جائے گا اور اسے عزت و آبرو سے رکھا جائیگا اس کے تمام مطالبات مانے جائینگے۔ غرضکہ اسے اعتماد کے شکنجے میں کس کر گھر لایا گیا اور جب وہ انکے پھندے میں پھنس گئی تو اسے جان سے مار ڈالا گیا اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ میں اپنا یہ حشر نہ کرانا چاہتی تھی۔ ممکن تھا کہ میرے اعزہ میرے ساتھ

بُرا سلوک نہ کرتے میری شکایتوں کو دور کرتے اور میرا ہر طرح خیال کرتے اور میری زندگی میرے خیالات کے مطابق آرام سے گزارنے میں میری مدد کرتے مگر میں اب اپنی زندگی اور آزادی کے لئے دوسروں کی دست نگر بنکر رہنا نہ چاہتی تھی بلکہ مینے اپنی زندگی اور آزادی کی تمامتر ذمہ داری اور اپنی عقل سمجھہ اور اپنے بازوؤں پر لے لی تھی۔ چنانچہ مینے اس کا اہتمام رکھا کہ کسی کو انگلی ہی نہ پکڑنے دی کہ پہنچہ پکڑنیکی نوبت آتی۔ چنانچہ جو لوگ بھی مجھہ سے ملنے جلنے کیلئے آتے میں ملنے سے انکار کر دیتی اس پر ان لوگوں کو یہ شبہ کیا یقین ہو جاتا کہ میرے مددگار مجھے ان سے ملنے نہیں دیتے۔ چنانچہ وہ مقامی اخبارات میں اس خیال کا زوردار الفاظ میں اظہار کرتے۔ اسلئے بسا اوقات مجھے ان سے ملنا پڑتا۔ مگر میں دو یا تین منٹ سے زیادہ کبھی کسی سے نہیں ملی۔ ایک حضرت اس زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا کے دفاتر میں ایک بڑے عہدے کے مالک تھے۔ چار ہزار تنخواہ تھی صورت شکل بھی اچھی تھی تعلیم یافتہ اور آزاد خیال بھی تھے۔ انکو اپنی دولت پوزیشن صورت اور علم و عقل پر بڑا ناز تھا۔ انہوں نے میرے اعزہ سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ایک مقامی تبلیغی جماعت سے بھی ناطہ جوڑا۔ دولت کا ہر جگہ رعب اور اثر چل جاتا ہے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ مجھے ضرور حاصل کرلیں گے میرے اعزہ اور دیگر ہمقوم حضرات کا بھی یہی خیال تھا کہ بس اب میں ضرور واپس آجاؤنگی۔ یہ حضرت دو ایک مبلغین اور دوستوں کے ہمراہ دن رات میں تین چار مرتبہ ہمیشہ میرے مکان کے گرد چکر کاٹتے اور ایک ہی رٹ تھی کہ "ہم لوگ تخلیہ میں ملنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم اسے واپس لیجانے پر تیار کر لینگے"۔ چنانچہ مقامی پریس کی مدد سے بھی خوب پروپاگنڈا کیا گیا اور میرے مددگاروں کو اس پر مجبور کر دیا گیا کہ مجھے پندرہ منٹ کیلئے ان لوگوں سے ملنے دیں۔ خیر میں ان لوگوں سے مل لیتی مگر تخلیہ کی شرط میرا خون کھولا دیتی تھی۔ چنانچہ مینے مجبور ہو کر اُن سے دو منٹ بات چیت کرنا منظور کر لیا۔ اس شرط پر کہ میرے مددگاروں میں سے کوئی موجود نہ ہوگا۔ مگر وہ اپنے دو دوستوں کے ہمراہ آئیں۔ جائے ملاقات میرے مکان کا ایک کمرہ قرار پایا۔ وہ بڑے خوش ہوگئے اور خوب بن ٹھن کر بڑی کرو فر سے تشریف لائے۔ میں حسب معمول سفید کھدر کی ساڑی پہنے تیور بدلے اپنے چھوٹے بچے کو گود میں لئے ہوئے اس کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر آکھڑی ہوئی۔ جس کمرے میں یہ حضرات تشریف فرما تھے۔ ان لوگوں نے مجھے سلام کیا۔ مینے ڈپٹ کر جواب دیا جبکہ تم میری عزت و آبرو کی بربادی پر تُلے ہوئے ہو کس منہ سے مجھے سلام کرتے ہو۔ اور میں تمہیں کیونکر اپنی سلامتی کا خواہاں تصور کر سکتی ہوں۔ تم میرے ساتھ منافقت نہیں برت سکتے اسپر وہ حضرت ممیانے لگے۔ میری سمجھہ میں صرف اتنا ہی آیا کہ وہ کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں اور اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ وہ میری عزت آبرو کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ اس پر مینے کہا کہ تمہاری یہ جرأت کہ تم مجھے تخلیہ میں گفتگو کیلئے مطالبہ کرو۔ اگر تم اسے معیوب نہیں سمجھتے تو جاؤ پہلے اپنی جوان بہن کو یہاں لے آؤ اور گھنٹہ بھر میرے اس بھائی کیساتھ تخلیہ میں گفتگو کرنے کیلئے چھوڑ دو

جو تمسے پڑھا شریف لڑکی ہوں اس بات کا تمہیں یقین دلائے دیتی ہوں کہ وہ اسے اپنی بیٹی اور بہن ہی سمجھے گا۔ اس کے بعد تم مجھے یہ مطالبہ کرنا اور میں بھی پھر تم سے ایک گھنٹہ کی بجائے دو گھنٹہ تخلیہ میں مل لونگی۔ بس پھر کیا تھا بغلیں جھانکنے لگے۔ مینے کہنا جاری رکھا کہ تم جو پردے کے حامی ہو تمہیں دوسروں کی بہو بیٹیوں سے ملنا جلنا کہانتک زیب دیتا ہے! ہم تم لوگوں کو خطرناک سمجھتے ہیں اور تم سے کبھی نہیں مل جل سکتے تم اپنی بہن بیٹیوں اور ماؤں کو اسلئے پردے کی قید میں گھونٹ کر رکھتے ہو کہ تم دنیا کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو تمکو دوسروں کی شرافت پر اسلئے بھروسہ نہیں ہے کہ تمہیں خود اپنے پر بھروسہ نہیں ہے تم جانتے ہو کہ جو سلوک تم دوسروں کی بہو بیٹیوں سے کرتے ہو یا جس نظر سے انہیں دیکھتے ہو کہیں اسی نظر سے دوسرے تمہاری بہو بیٹیوں کو نہ دیکھیں۔ یہ مروجہ پردہ تمہاری خباثت باطنی کا مظہر ہے۔ ورنہ جو سچے دل سے پردے کا حامی ہو اسے کسی بھی بے پردہ عورت سے ملنا جلنا نہیں چاہیئے۔ اور ہم لاکھ بے پردہ سہی پردے کے مخالف سہی مگر ہم تمہارے جیسے پردے کے حامیوں سے ملنا جلنا کبھی پسند نہیں کرسکتے۔ اسلئے کہ ہمیں تمہاری نیتوں پر شک ہے ہمنے مروجہ پردہ چھوڑا ہے۔ شرافت نہیں چھوڑی ہے، اور تم نے اپنی خباثت باطنی پر پردہ ڈال رکھا ہے خبردار جو آئندہ کبھی مجھسے ملنے کا لفظ بھی اپنی زبان سے نکالا۔ اس غلط فہمی میں نہ رہنا کہ آزاد خیال لڑکی ہوں۔ پردہ چھوڑ چکی ہوں۔ ماں باپ یا اعزہ کی قیدو بند مجھپر عائد نہیں ہے اسلئے میں نرم نوالہ ہوں۔ میں خود اپنی سب سے بڑی محافظ ہوں

مینے گھر اسی وقت چھوڑا ہے جب اپنے آپ میں یہ استعداد پیدا کرلی ہے کہ کوئی مجھے بہکا نہ سکے۔ کوئی مجھے کھلونہ نہ بنا سکے کوئی مجھے پھول سمجھکر مل ڈالنے کا حوصلہ نہ کرسکے۔ یاد رکھو ایسوں کیلئے میرا روپ کالی ماتا، چنڈی دیوی، درگا بائی، زہر سے بجھی ہوئی تلوار کی دھار اور کانٹوں کا ڈھیر ہوگا۔ میرا موہنی روپ وہی دیکھ سکتے ہیں جنکے دل فرشتوں کی طرح پاک اور معصوم ہیں جو عورتوں کو "ماں" سمجھتے ہیں "ماں" کے عزت واحترام کے جذبے سے معمور ہوکر جو سر ہمارے قدموں میں جھکیگا اس سر کے لئے جگہ ہمارے دل میں، آنکھوں میں اور سر پر ہوگی۔ اور جو سر جنسی جذبات سے بیتاب ہوکر ہمارے قدموں میں آئیگا اس کی تواضع صرف ہماری ٹھوکریں ہی کرسکتی ہیں۔ بحیثیت باپ اور بھائی کے ہم مرد کو دنیا کی اعلیٰ ترین نعمت سمجھتے ہیں اور اپنی محبت اور شفقت کے خزانے انپر نثار کرنیکو تیار ہیں۔ مگر جب غلیظ جنسی رشتوں پر میری نظر جاتی ہے تو میں مرد کو عورت کیلئے چھوت، بیماری اور موت سمجھتی ہوں" یہ کہنے کی تو ضرورت نہیں کہ یہ تمام باتیں مینے انکی بے سروپا باتوں اور حرکتوں کے جواب میں کہی تھیں۔

انہی دنوں مجھے یہ تلخ تجربہ ہوا کہ جتنے میری قوم کے نوجوان یا بڑی عمر کے مرد تھے ان میں سے اکثریت ایسی تھی جسکے دل میں مینے برا جذبہ پایا۔ انہیں اگر مجھسے ہمدردی بھی تھی تو یہ رخ لئے ہوئے کہ بعض کا خیال تھا کہ وہ ازراہ ہمدردی ومہربانی مجھسے شادی کرلینگے۔ گویا مجھپر کوئی احسان کرینگے۔ کچھ نوجوان ایک عجوبہ سمجھکر مجھسے غائبانہ محبت کا دم بھرتے تھے کچھ آزاد خیال اور اپٹوڈیٹ حضرات کا خیال تھا کہ چونکہ میں بھی

آزاد خیال ہوں اور انکی نگی نظروں میں آزادی کے معنی صرف اس قدر تھے کہ مرد عورت کا آزادانہ خلاملا اور ایکدوسرے کو اپنی جنسی تفریح کا ذریعہ بنانا ہی معراج آزادی یا مقصد زندگی ہے۔ غالباً انکو مجھ سے اس قسم کی غلط توقعات تھیں۔ برعکس میں جس ماحول میں تھی وہاں کے نوجوان تو نوجوان بوڑھے انسان بھی جو میرے باپ دادا کی عمر کے تھے ہمیشہ مجھے بہن اور ماں کی طرح سمجھتے اور سلوک کرتے رہے عورتوں کیلئے سب سے بڑے اعزاز و مرتبہ کے احساس کا انکے دل میں مجھے اس سے اندازہ ہوا کہ بوڑھے سے بوڑھے انسان نے بھی مجھے "ماتا" کے لفظ سے مخاطب کیا۔ مینے دل ہی دل میں ہر دو قوموں کی ذہنی اور اخلاقی حالت کا موازنہ کیا۔ اور مجھے اس امر کا اعتراف کرنا پڑا کہ مذہب انسانوں کی ذہنی اور اخلاقی تربیت اس بہتر طریقے پر نہیں کر سکتا جیسی تربیت پاکیزہ ماحول اور ماؤوں کے ہاتھوں ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مذہب کے نام پر دیوانے اور شیدائی لوگوں کی اخلاقی گراوٹ مینے بچشم خود دیکھی ہے اور دوسروں کو بھی یہ حالت دکھلانے کیلئے تیار ہوں اور یہ میرا دعویٰ ہے کہ چلے ہے میں اس دنیا میں موجود ہوں یا نہ ہوں کسی بھی زمانے میں جو محقق ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیں وہ مذہبی دعویدار حلقے میں جاکر مذہبی کہلانیوالے لوگوں کے عادات و اطوار اور اخلاق کو بچشم خود ملاحظہ فرمائیں۔ اکثریت میرے دعوی کی تصدیق کریگی اور محقق کو اس کا اعتراف کرنا ہی پڑیگا کہ سزا و جزا کی دہشت اور لالچ انسانی اخلاق کو سدھارنے سے معذور رہا ہے۔ برعکس اس کے پاکیزہ ماحول ذہن انسانی کی ایسی اچھی تربیت کر سکتا ہے کہ نیکی اور پاکیزگی انسانی فطرت کا جزو بنکر رہ جائے اور برائی نیست و نابود ہوجائے۔

(باقی)

صہبائے فکاہ کا ایک چھلکتا ہوا جام

میز کی دراز

از جناب سید مسیح الزماں جائسی

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

لالچ بہت بری چیز ہے۔ تصویر بتاں اور حسینوں کے خطوط کی تلاش میں ایکدن اپنے میز کی دراز کھولی۔ لیکن قسمت کی خوبی دیکھئے کہ جب اس دراز کے مافی الضمیر پر غور کیا اور اسکے تمام پہلوؤں پر نظر دوڑائی تو یہ نقشہ نظر آیا کہ ؎

بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ان معزز دوکانداروں کے بل جو ہمیں ایسا ادھار مال دیتے ہیں جسکو ہم مال غنیمت سمجھتے ہیں۔ ان غیر تند تاجروں کی یاد دہانی جن کے حوصلے بلند ہیں اور جنکا اصول "ادھار آج نقد کل" ان عالی ہمت بزازوں کے تقاضے جنہوں نے باوجود اس امر کے کہ انکی دوکان پر "ادھار مانگ کر شرمندہ نہ کریں" ایک سنہری چوکھٹے میں لگا لٹک رہا ہے ہمیں شرمندگی کا موقع دیکر اپنے دوکان کے سامنے کا راستہ ہمارے لئے بند کر دیا۔ ان دوستوں کے خطوط جنکی کتابیں ہماری الماری کی زینت بن چکی تھیں اور اسلئے اپنے اصلی مالکوں کے پاس جانا نہیں چاہتی تھیں۔ صاحب خانہ کے وہ خطوط جن میں ہمیں ہجرت کر جانیکی متعدد بار ترغیب دی گئی تھی سینما کے وہ ٹکٹ جو ہمارے ایک نوساختہ دوست نے غلطی سے اور فرط محبت سے ہمارے لئے خرید کر دیئے تھے اور بالآخر ایسے ہر دلعزیز ثابت ہوئے کہ گیٹ کیپر نے بعد منت و سماجت ان ٹکٹوں میں اپنا آدھا حصہ بانٹ لیا تھا۔ اس ڈربی کے ٹکٹ جو ہمارے نام نہیں نکلا تھا جو کبھی کسی شریف آدمی کے نام نہیں نکلتی۔ جو ہمیشہ بری صحبت میں بیٹھنا پسند کرتی ہے اور اسلئے کہ اکثر نیچی قوموں کے نام نکلتی ہے ... انعامی معموں کے وہ حل جنہیں معمہ بنانیوالے کی چالاکی و عیاری اور ہماری سادگی سے صرف دو غلطیوں کیوجہ سے ہمارے انعام ... رہ گیا۔ سگریٹ اور چائے کے وہ کوپن جنکی تاریخ گذر چکی تھی اور جنکو ہمنے بطور تنبیہ الغافلین اپنے پاس رکھ لیا تھا اور وہ جراب جو بیوہ ہو گئی تھی یعنی جسکا وہ جوڑ جو دوسرے پیر میں پہنا جا سکے کھو گیا تھا ... وہ دستانہ جو اپنے ساتھی کے فراق میں مدتوں سے کف افسوس مل رہا تھا۔ یہ تھیں وہ چیزیں جو ہمارے میز کی دراز میں پڑی تھیں اور توجہ کی محتاج نہیں۔ لیکن ان میں چند چیزیں ایسی تھیں جنہیں دیکھکر زمانہ ماضی کی تلخیاں کام و دہن میں تازہ ہو گئیں اور کچھ کاغذات ایسے بھی نظر آئے جنہیں دیکھکر ہمنے زہر خندہ کیا۔

ایک دوست کا خط ملا۔ جس میں ہم سے پچاس روپے بطور قرض حسنہ مانگے گئے تھے اور اخیر میں ہمکو بڑی تاکید کی گئی تھی کہ جواب جلد دیا جائے۔

اور لکھا تھا خط کو تار سمجھنا۔ حالانکہ یہ بالکل ناممکن سی بات ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ خط پر ایک آنہ خرچ ہوتا ہے اور تار کم از کم نو آنے کی قیمت ادا کرنے سے بھیجا جاتا ہے۔ اور بالغرض انکے ایسا کہنے سے ہمنے خط کو تار سمجھ بھی لیا اور اپنے آپکو دن دہاڑے دھوکہ سے بھی بیا تو ڈاکخانہ والوں کی آنکھ میں خاک کیسے جھونکی جاسکتی تھی۔ پھر اس کے یہ معنی ہیں ایک تو قرض دیں اور دوسرے دھوکہ بازی کو فروغ بخشیں تاکہ حکام کو معلوم ہو جائے کہ خط کو تار سمجھا گیا ہے۔ گویا گانٹھ سے روپے بھی جائیں اور پولیس کی نظر میں بھی آجائیں۔ یہ کیسا نادان دوست ہے ایک تو قرض مانگتا ہے اور پھر ہمسے مفلس ہونا کوئی ایسی بری بات نہیں کیونکہ ہم بھی مفلس ہیں اور ہم پر کیا منحصر ہے۔ تمام قوم کے لیڈر مفلس ہوتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کا کیا علاج ہے جو مردم شناس نہیں ہیں یکم۔ ہے کم اپنے جیسوں کو پہچان لینے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے جی میں تو آیا کہ ان حضرت کو حماقت کی سزا دینے کیلئے اپنے میز کے تمام کاغذات بھیجدیں تاکہ انکی آنکھیں کھل جائیں اور بخوبی معلوم ہو جائے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ کاغذات میں چچا جان کے خطوط بھی ہیں جن میں ہمارے چال چلن کی زندگی پر نہایت واضح الفاظ میں تنقید کی گئی ہے اور ہماری وضعداری اور دیرینہ عادتوں پر نکتہ چینی کی گئی ہے کہ دیکھو رات کے وقت دیر تک مت آیا کرو اور صبح ۹ بجے نہیں سوا کرو بلکہ پانچ بجے بعد دن نکلتا ہے اور انگریزی لباس نے ڈھیلا پاجامہ اور لمبی اچکن بہتر ہے اور چائے کو ترک کرکے دودھ اور گھی کی عادت ڈالو۔ مسدس حالی زبانی یاد کرو۔ اپنے دوستوں کو شکوہ، جواب شکوہ اور مناجات بیوہ پڑھنے کی ترغیب دو۔ کچھ تو خود داری نے روک لیا اور کچھ یہ بھی خیال آیا کہ اتنے ملبوں اور بیکار رسیدوں اور ناکامی کے آثار کا مقابلہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ ہمیں ہیں کہ قرض پر قرض لئے جاتے ہیں اور ادائیگی کے فرض کو یکقلم فراموش کر چکے ہیں۔ ہماری جگہ کوئی اور ہو تو فرط فکر سے تپ دق میں مبتلا ہو جائے۔ غرضا ہمیں اپنے اس نادان دوست پر کچھ ترس آہی گیا۔

اور ایک خط جسے دیکھکر ہمیں بے حد طیش آیا وہ مسٹر مدما کا ایک خط تھا جس کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا کہ اب بھی پڑھتا ہوں تو نبض کی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک سزا کے متعلق اعلان کیا گیا تھا کہ چونکہ ایک کتاب لائبریری سے میری کتابوں میں افسران بالا کی رضامندی حاصل کرتی ہوئی آپہنچی تھی اور الماری میں ایک مہینہ تک اسی طرح چھپی بیٹھی رہی کہ دیکھنے والے کو یہ محسوس ہو کہ

مت کھائیو ہاں فریب ہستی
ہر چند کہے کہ ہے نہیں ہے

اور اس وجہ سے ہم اس گمشدہ بھیڑ کو واپس گلہ میں نہ پہنچا سکے۔ اسلئے ہمسے حاکمانہ لہجہ میں درخواست کیگئی تھی، کہ سرکاری خزانہ میں فیس کے ساتھ کچھ نذرانہ بھی پیش کردیں ہم اس سب کو ٹھنڈے دل سے برداشت کر لیتے لیکن ہمیں سب سے زیادہ قلق اس کا ہوا کہ اس نذرانہ کو جو ہمنے خود جاکر پیش کیا تھا جرمانہ کا نفرت انگیز لقب دیکر منظر عام پر لایا گیا۔ انہیں باتوں کو سوچنے سے میرا خون ابلنے لگا۔ اور ممکن ہے اور بھی ابلتا اگر اس لفافہ کے ساتھ ایک مکتوب نہ ملجاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مکتوب نے تمام کلفتیں دھو ڈالیں۔ اور میں میز کی دراز کی چیزیں چھوڑ کر اس خط میں ایسا کھو گیا کہ جسے کہنا چاہیئے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

(فقط)

کیشو کیچڑ میں پیدا ہوا تھا، مگر دل سونے کا رکھتا تھا
شمبھو سونے کے اندر پیدا ہوا تھا مگر دل اسکا کیچڑ سے بھی زیادہ غلیظ تھا
کیچڑ اور سونے کی داستان
ہندوستان سینےٹون کا دوسرا معاشرتی فلم
ڈائرکٹر:- گنجال
افسانہ:- باغی ادیب منٹو
میوزک:- رفیق غزنوی
عرف
دوسرا ہفتہ (۲)
اداکار:- سوبھنا سمرتھ۔ نذیر۔ رسنکا
جینت۔ شانا۔ درت۔ مجید وغیرہ
پیراڈائز سینما
(لیمنگٹن روڈ بمبئی)
سرمایہ اور محبت کی زبردست ٹکر

مغل لائن کو اسلامی کمپنی

بنا دینے کی تجویز

سر عبداللہ ہارون نے جو کہ مغل لائن کے جدید ڈائرکٹر ہیں حال ہی میں مغل لائن کو خاص اسلامی کمپنی بنانیکی تجویز پیش کی ہے اس تجویز کے متعلق سر عبداللہ ہارون صاحب نے پریس کو مندرجہ ذیل بیان دیا ہے جس سے اس خوشخبری پر کافی روشنی پڑتی ہے :-

میں نے مغل لائن کی ڈائرکٹری کو اسلئے قبول کیا کہ میں مسلمانان ہند کو آمادہ کروں کہ وہ اس کمپنی سے صرف دلچسپی نہ لیں بلکہ اپنا سرمایہ بھی اسمیں لگائیں میں مغل لائن کے انگریز حصہ داروں سے ملا۔ اور ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے حصے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کردیں ۔ مجھے یہ اعلان کرنے میں مسرت محسوس ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے حصے فروخت کرنا قبول کرلیا اور بالکل اصلی و ابتدائی قیمت لینا منظور کرلیا یعنی سو روپیہ کے حصہ کی قیمت سو ہی روپیہ لینگے میں برطانوی حصہ داروں کی اس رواداری کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ مغل لائن کی موجودہ مالی حالت مجھ جیسے معمولی تاجر کے تخمینہ کے مطابق ایسی بہتر ہے کہ اسکے ایکسو روپیہ حصہ کی قیمت اسوقت کم سے کم ایکسو پچاس روپیہ ہوتی ہے ۔ میرا اندازہ ان حقائق کی بنا پر ہے کہ کمپنی نے جتنا سرمایہ لگایا تھا اسوقت وہ پورے کا پورا سرمایہ ریزرو ہے علاوہ ازیں اسکے سات جہازات بہتر ساخت کے اور اچھی حالت میں ہیں چند تو ابھی حال ہی میں تیار ہوئے ہیں اور چند ۱۵ سال کے اندر اندر کے ہیں ۔ برطانوی حصہ داروں نے ایک تحریری ضمانت اس بات کی بھی دی ہے کہ انکے جتنے حصے مسلمان اب خریدینگے اگر ۲۰ سال کے بعد وہ انکو فروخت کرنا چاہینگے تو برطانوی حصہ داران اسی قیمت پر واپس خرید لینگے میں مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ مغل لائن کے حصے خریدیں اور جتنے زیادہ حصے خرید سکتے ہوں وہ خریدیں تاکہ انکی نصب العین یعنی ایک اسلامی جہازراں کمپنی قائم کرنیکی بھی پوری ہو جائے۔"

اگر ایسا ہو تو بہت خوشی کی بات ہے ۔ مغل لائن کو خالص اسلامی کمپنی بنا دینے کی تجویز کے ساتھ کمپنی کے انگریز ڈائرکٹروں کا لبیک کہنا قابل شکر گزاری ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغل لائن کمپنی کے بانی مبانی مسلمان ایرانی ہی تھے چنانچہ یہی علت نمائی اسکے نام کی ہے اور یہ کمپنی ایک زمانہ سے مسلمانوں کی خدمت کر رہی ہے لیکن اس کا خالص اسلامی ہو جانا ایک بہت ہی مبارک چیز ہوگی ۔ مغل لائن کے ڈائرکٹروں کے موجودہ بورڈ میں اسوقت سات ارکان ہیں جن میں سے تین مسلمان ہیں لیکن اگر جیسا کہ سر عبداللہ ہارون صاحب کی تجویز ہے مسلمان اس کمپنی کے حصے خریدیں اور بہت بڑی تعداد میں خریدیں تو خود بخود ایک وقت یہ چار غیر اسلامی ڈائرکٹر علیحدہ ہونے پر مجبور ہو جائیں گے اور کمپنی کا تمام نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائیگا ۔

مغل لائن کے ارباب حل و عقد کی اس قربانی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے احسانمند ہیں جن سے وہ نفع حاصل کرتے رہے ہیں ؛

بہو رانی

ہر ہندوستانی گھر کا چاند ہے!

مگر ستاروں کے بغیر چاند کا حُسن

پھیکا نظر آنے لگتا ہے

کشور ساہو — انورادھا

انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ بمبئی کی

کے گرد آسمانِ فلم کے بہترین ستاروں کا جھرمٹ ہے

روز — مبارک

مثلاً

کشور ساہو - روز

انورادھا - مبارک - پریتما دیوی

یہ سب بہت جلد آپکی نگاہوںکو روشن کرنے کیلئے آ رہے ہیں

خوبصورت جلد کی
حفاظت کرنا چاہیئے۔
چہرہ تمام دن کھلا رہتا ہے۔ اسلیئے تیز گرمی اور ہوا کیوجہ سے چہرہ کی نرم کھال پر داغ پڑجاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ جلد بھدی ہوجاتی ہے جب حُسن کی رونق پھیکی پڑجاتی ہے، تب کہیں آپ کو خیال آتا ہے۔
جلد ہی کے نکھار کیوجہ سے عورت کی تعریف اور اس سے محبت کیجاتی ہے۔ جبتک اُس میں پھول کے مانند تازگی اور نرمی رہتی ہے، تب ہی تک اس پر انسان کی للچائی نظریں پڑتی ہیں۔ عورت کو اپنی جلد کی حفاظت کرنا چاہیئے جس کیلئے صرف غسل ہی کافی نہیں ہے۔ پانڈس کریم جلد کے مساموں میں سے مَیل اور چکناہٹ خارج کردیتی ہے۔ پانڈس کریم کی ایک ڈبیہ خرید لیجئے۔ اُنگلیوں کے پوروں سے اسکو جلد پر مل لیجئے کسی نرم کپڑے سے پونچھ دیجئے پھر ذرا سی کریم اور لیکر اسکو جلد پر لگا لیجئے۔ رات بھر اسکو ایسے ہی رہنے دیجئے۔ قریب دو ہفتہ پانڈس کریم کا استعمال جاری رکھنا چاہیئے اس کے بعد آپکی جلد نرم اور ترو تازہ ہو جائے گی۔ پانڈس وینشنگ کریم (پانڈس کی بنائی ہوئی کریم جو لگاتے ہی جذب ہوجاتی ہے) بہت عمدہ ہوتی ہے۔ یہ دن بھر ہوا اور گرد و غبار سے حفاظت کرتی ہے
پانڈس کریم
سب ہی بڑی دوکانوں پر ملتی ہے
اور اس پتہ پر بھی لکھ سکتے ہیں:۔
پانڈس، پوسٹ بکس نمبر ۴ ۴ بمبئی
POND'S
پانڈس کریم

رسائل
۵۲

Mrs. FATIMA HASHAM ISMAIL

(with her son and daughter)

Mrs. Fatima is our well-known writer. She has returned from Mombasa last month. In this issue we are publishing her speech delivered at her departure from Africa.

ماہنامہ تنویر بمبئی

مدیرہ: سحر
نائب مدیرہ: انوری خانم

شرح چندہ
سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ۳ روپے
قیمت فی پرچہ ۴ر
لوکل ۳ر
ممالک غیر سے دس شلنگ

جلد ۴
شمارہ (۱)

فہرست مضامین ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر تھرڈ سانکلی اسٹریٹ بمبئی ۸ سے شائع کیا۔

عراقی سٹیٹ ریلوے

عراقی سٹیٹ ریلوے نجف اشرف۔ کربلائے معلیٰ۔ کاظمین اور بصرہ کے مقامات مقدسہ کے زائرین کیلئے تیز ترین آرام دہ۔ ارزاں ترین ذریعہ سفر ہے مشہد، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے یا واپسی پر عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کیجئے۔ اس طرح آپکو دو مختلف زیارتوں کے اخراجات میں کفایت ہو جائے گی۔

خاص آسانیاں اور تخفیف شدہ کرائے

حجاج کو ۱۵۰ ۔ ایام کیلئے خاص کوپن ٹکٹ مل سکتے ہیں۔ جنکی رو سے ۵۰ کلو سامان مفت لیجایا جا سکتا ہے۔ تفصیل یہ ہے۔

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ	
۲۴ روپے	۱۴ روپے	بک "A" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلیٰ اور پھر بغداد کاظمین (الجوادین سٹیشن) تک اور کاظمین سے سامرہ اور واپس براہ کاظمین ماقل (بصرہ) تک سفر ہو سکتا ہے۔
۲۰ روپے	۱۲ روپے آٹھ آنے	بک "B" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلیٰ اور پھر بغداد یا ظمین (الجوادین سٹیشن) اور واپس ماقل تک سفر ہو سکتا ہے۔

تین برس سے کم عمر کے بچے مفت اور بارہ برس سے کم آدھے ٹکٹ پر

ماقل (بصرہ) پر ہمارا ایجنٹ حجاج کو ملتا ہے

تمام اہم مقامات مقدسہ کے درمیان روزانہ ٹرینیں نجف اشرف سے براہ راست مدینہ منورہ کو ایک (نیا خشکی کا راستہ جو صحرا میں سے ہو کر گزرتا ہے کھولا گیا ہے) جاتی ہیں۔ یہ عراق گورنمنٹ کے زیر انتظام ہے۔ راستہ نجف اشرف سے براہ جمیمہ اور حنیل کے کرائے یہ ہیں:۔

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ
۲۰۰ روپے	۱۳۴ روپے

مفصل معلومات، ٹکٹ۔ حج۔ کوپن۔ بکیں وغیرہ مختلف سب ایجنٹوں سے بمبئی اور کراچی میں مل سکتے۔ جنکے پتے یہ ہیں:۔

۱۔ مولوی محمد باقر حاجی ویرجی جمال کا مسافر خانہ جیل روڈ عمر کھاڑی بمبئی

۲۔ دی آنریری جائنٹ سیکرٹری۔ فیض پنجتنی پالاگلی بمبئی

۳۔ مسٹر اے۔ ای لوٹیا مانڈوی کو لبواڑا بمبئی نمبر ۳

۴۔ حبیب جی رحمت کھارادار کراچی

۵۔ مسٹر عبد العلی شیخ عیسیٰ جی معرفت میسرز یوسف علی علی بھائی کریم جی اینڈ کو نیپیر روڈ کراچی

۶۔ دی آنریری سیکرٹری فیض پنجتنی معرفت حاجی جیٹھا بھائی گوکل گودی گارڈنز۔ کراچی

ٹیلیفون نمبر:-
تار کا پتہ:-
عالیجناب مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب رئیس اعظم دہلی کا عطیہ!
اکسیر زنان
وہ عورتیں جو شرم کیوجہ سے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتیں اور ماہواری اور سفید رطوبت کی تکالیف برداشت کرتے کرتے گھل جاتی ہیں۔ ان کیلئے "اکسیر زنان" پیام زندگی ہے۔ لاکھوں عورتیں اس سے صحت اور تندرستی حاصل کر چکی ہیں۔
مسیح الملک حکیم جمیل خانصاحب بہادر کے خاص مجربات سے ہے۔ ماہواری کی بیقاعدگی ہمیشہ کیلئے دور ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے جو سفید رطوبت وغیرہ کی شکایت رہتی ہے۔ اسکو قطعی طور پر بند کر دیتی ہے اور جسم کے جوڑ جوڑ کو مضبوط کرتی۔ چہرہ کی رونق کو بڑھاتی اور حسن و خوبصورتی میں چار چاند لگانیوالی ایک سستی دوا ہے۔ جسکی ان خوبیوں کے باوجود بیس خوراک کی ایک شیشی کی قیمت صرف ۹ ر ہے۔
ایام حمل و حیض میں یہ دوا استعمال نہیں کیجاتی ؛
ضروری اطلاع!
پبلک کی اطلاع کیلئے اعلان کیا جاتا ہے کہ ہمارا دوا فروخت کرنیوالا ایجنٹ کسی شہر میں نہیں ہے اسلئے بعض شہروں میں جو لوگ اس نام سے کام کرتے ہوئے پائے جائیں انکو ہمارا آدمی تصور نہ کیا جائے اور نہ ایسی دواؤں کو معتبر سمجھا جائے۔
ملنے کا پتہ: مینیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی

لمعات

یوم نجات

مکتی یا نجات انسانی جدوجہد کی کامیابی کی آخری منزل کو سمجھا جاتا ہے۔ اور مشکل ترین کامیابی کو نجات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے مگر "ہر کس بقدر ہمت اوست" کے مصداق نجات کے مدارج بھی علحدہ علحدہ ہیں۔ برٹش غلامی کی سب سے بڑی حامی اور علمبردار جماعت مسلم لیگ کے صدر مسٹر جناح "مسلم لیگیوں کی" نجات صرف اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ کانگریسی منسٹروں کے استعفا دینے پر وہ سب جمع ہوکر تجدید غلامی پر خدا کا شکر ادا کریں کہ اچھی یا بری برائے نام سہی قومی حکومت سے نجات ملی۔ اور دیرینہ آقا یعنی غیر ملکی حکومت کی غلامی میں سانس لینا نصیب ہوا۔ یہ ہے یہاں کے قائد اعظم کہلانیوالے لیڈر کی بلندی خیال کی پہنچ۔ اور غلامانہ ذہنیت کا حال! ؎

گر ہمیں است مکتب و ملّا کار طفلاں تمام خواہد شد

جس نے اپنی جماعت کی سرگرمیاں حصول آزادی کیخلاف محدود کر رکھی ہیں۔ اور یہ حرکت اور زندگی بھی کسی اصول کے تحت میں نہیں ہے بلکہ صرف اپنے برطانوی آقاؤں کو خوش کرنے کیلئے ورنہ بے عملی اور پست ہمتی کا کھلا ہوا ثبوت تو یوم نجات ہی ہے۔

اگر مسلم لیگ یا مسٹر جناح کو کانگریسی حکومت سے واقعی اختلاف شدید اختلاف تھا کہ اسکے مقابلے میں انہیں گورنروں کے اختیارات خصوصی اور شخصی حکومت غیر مترقبہ معلوم ہوئی جسکے لئے نماز شکرانہ ادا کی گئی تو انہیں مردمیدان بنکر ٹھیک اسی طرح کانگریسی وزارتوں اور حکومت کے خلاف جدوجہد کرنا چاہیئے تھی جسطرح کانگریس نے غیر ملکی حکومت کیخلاف سوراج کیلئے کی۔ مگر مسٹر جناح کو نہ تو سوراج حاصل کرنا ہے ورنہ مسلم راج انہیں تو برٹش راج چاہیئے۔ غلامی کی حمایت سے بدرجہا بہتر یہ تھا کہ وہ خاص مسلم راج کیلئے کوشش کرتے۔ کانگریسی حکومت کیخلاف جدوجہد کرتے ہوئے جیلیں بھر دیتے۔ پھانسیوں پر لٹکتے جلاوطن ہوتے۔ اور کانگریسی وزارتوں کو توڑنے کیلئے کچھ محنت کرتے اور جب انکی محنت نتیجہ کے طور پر کانگریس کا تختہ الٹ جاتا۔ اسوقت انہیں یوم نجات منانیکا پورا حق حاصل ہوتا اور خوشیاں منانا زیب بھی دیتیں۔ مگر یہاں تو ہمیشہ ہی دوسروں کا مارا ہوا شکار کھانا جزو مذہب بنا دیا گیا ہے۔ کانگریسی وزارتیں خود حکومت کو ٹھکرا کر چلی گئیں اور اس موقعہ کو غنیمت جانکر قائد اعظم مسٹر جناح نے ایک بڑا تیر مار لیا کہ اپنے پیروؤں سے نماز شکرانہ پڑھوا دی چلو نجات حاصل ہوئی اتنے سستے داموں نجات اور لیڈری حاصل کر لینا واقعی مسٹر جناح کی ڈپلومیسی کا ایک معجزہ ہے لیکن ایسے لیڈروں کے اسلام کے نام پر بہکائے ہوئے ہمارے معصوم اور بھولے بھالے مسلم لیگی بھائیوں کو ذرا یہ سوچنا چاہیئے کہ کیا انکا معیار اب یہی رہ گیا ہے کہ وہ ایسی خوشیوں پر صبر وشکر کر کے بیٹھ جایا کریں جو جنگلوں میں روزانہ شیروں کے جھوٹے بچے ہوئے شکار سے لومڑیوں اور گیدڑوں کو حاصل ہوا کرتی ہے؟ مسٹر جناح کو چاہیئے کہ اس تاریخ کو بھی یوم نجات منایا کریں جس تاریخ کو انگریزوں نے مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سے بیدخل کر دیا تھا۔

قومی اتحاد

آزادئی وطن کے حامیوں کیلئے سب سے پہلا کام اتحاد قومی ہے اور اس کیلئے بڑی سے بڑی قربانی دیدینا بھی بجا ہے۔ مگر اس کیلئے کانگریس کا مسلم لیگ سے گفت و شنید کرنا بے معنی سا ہے۔ کیونکہ یہ بات تو سورج کی طرح عیاں ہے اور ہر موقعہ پر یہ ظاہر ہوتا رہا ہے کہ مسلم لیگ کی زندگی کا مقصد

ہندوستان میں برٹش راج قائم رکھا ہے۔ لعنت و تنقید سے اگر کوئی فائدہ ہوا تو وہ صرف یہ کہ عوام پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ مسلم لیگ آزادیٔ وطن کی مخالف ہے اور انگریزوں کی حامی۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ مسلم لیگ کی موجودہ ترقی کی تہ میں کس کا ہاتھ ہے اور یہ کس کی شہ پر کام کر رہی ہے۔

مسلم لیگ آج ایک منظم جماعت کہلائی جا سکتی ہے۔ مگر غداران وطن کی۔ غلامی کے حامیوں کی۔ وہ سچے مسلمانوں کی جماعت ہرگز نہیں کہلائی جا سکتی۔ کیونکہ ایک سچا مسلمان غلامی کی حمایت کبھی نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہندوؤں کی موہوم غلامی کے خوف سے انگریزوں کی موجودہ غلامی کو قائم رکھنے پر اصرار کر سکتا ہے۔ اسے ہر قسم کی غلامی کو توڑنا ہے۔ جو موجود ہے اسے پہلے اور آنے والی کو بعد میں۔

محب وطن اور آزادی کے دلدادہ مسلمان کانگریس کے ساتھ اسلئے ہیں کہ اس کا مقصد آزادی حاصل کرنا ہے وہی ایک ایسی انجمن ہے جسنے آزادی کیلئے کام کیا ہے قربانیاں دی ہیں۔ مصیبتیں جھیلی ہیں۔

لیکن بحیثیت مسلمان انہیں مسلم لیگ کے لگائے ہوئے کلنکوں کو بھی اپنے روشن چہروں پر سے دھونے کے لئے کوئی عملی قدم ضرور اٹھانا چاہیئے اور منظم ہو کر دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان آزادی کے حامی ہیں اور غلامی سے نفرت کرتے ہیں۔

کیونکہ ہم یہ ذلت کبھی نہیں برداشت کر سکتے۔ جو مسلم لیگ کی وجہ سے ہمیں اُٹھانی پڑی۔ اور تمام دنیا میں خیال پھیل گیا۔ کہ ہندوستان کے مسلمان اِتنے بزدل اور بے غیرت ہیں کہ اپنے وطن کی آزادی کے مخالف ہیں۔ اور غلامی کے حامی۔

یا اہلِ وطن کے مقابلے میں انگریزوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ انگریز بھی بحیثیت اِنسان ہمیں عزیز ہیں، لیکن یہ حقیقت ہے۔ کہ ہمیں اپنے اہلِ وطن ہندو، پارسی، سکھ عیسائی زیادہ عزیز ہیں۔ ہم اپنی جان کی بازی لگا کر بھی ملک کی آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

آزادی کے حامی مسلمانوں کو چاہیئے، کہ سب سے پہلے وہ دنیا کے اِس غلط خیال کی تردید کر دیں، کہ "مسلم لیگ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔" کیونکہ اسے اِسلام کی تعلیم سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ بلکہ وہ حریت کُش علمبردارِ دینِ اسلام کے لئے باعثِ ننگ و ندامت ہے۔

رائل کمیشن

مسٹر جناح "اپنی ملکی حکومت" کے فرضی مظالم کے خلاف اپنے پُرانے آقاؤں کی مدد کے لئے دُہائیاں دے دے کر پکار رہے ہیں مگر نہ گورنر سنتے ہیں، نہ وائسرائے صاحب داد دیتے ہیں۔ کیونکہ برطانوی سیاست کے نقطۂ نظر سے اُن سے ایک غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ کانگریسی حکومتوں کے حسنِ انتظام اور لیاقت کی داد دے چکے ہیں، اب کس منہ سے مسٹر جناح کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ بہرحال اب مسٹر جناح نے ایک خاص قسم کے برطانی رائل کمیشن کا مطالبہ کیا ہے، جو آکر یہ ثابت کرے، کہ ہندوستانی ابھی اِس قابل ہرگز نہیں ہیں کہ اپنے ملک کا انتظام کر سکیں، اسلئے آزادیٔ ہند کا سوال اُٹھانا ہی ابھی سراسر بیجا ہے۔

لیکن ہمارا کہنا یہ ہے۔ کہ ہم رائل کمیشن پر کیونکر اعتماد کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں گورنمنٹ برطانیہ کا بنیادی پتھر لٹا دا اور حکومت کردہ ہے۔ رائل کمیشن برطانوی امپیریلزم کی بنیاد کھوکھلی کرنے سے تو رہا، وہ تو اسے اور مضبوط کریگا۔ لیکن اِس دلیل سے چشم پوشی کرنا نہ مسٹر جناح

کے بس کی بات ہے اور نہ برطانوی حکومت کی کہ تحقیقاتی کمیشن کے لئے لازمی امر یہ ہے کہ اُسے فریقین کا اعتماد حاصل ہو نہ کہ صرف ایک فریق کا۔ تحقیقاتی کمیشن کے ارکان مسلم لیگ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ذمہ دار حضرات دونوں ہی کے متفقہ طور پر انتخاب کئے ہوئے ہونا چاہئیں۔

اُردو کانفرنس کے اجلاس

دہلی میں ۲۹ و ۳۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوئے۔ حامیانِ اُردو کیا ہندو کیا مسلمان سب ہی نے ملکر اسے کامیاب بنانے کی پوری کوشش کی۔ حامیانِ اُردو کی زبان کی خدمت کیلئے جدوجہد ہر لحاظ سے قابلِ داد و تحسین ہے۔ مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو کے پیغامات اور ہمدردی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اُردو زبان ہر لحاظ سے ہندوستان کی قومی زبان کہلائی جانے کی مستحق ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہندو مسلمان کے اتحاد کی یادگار اور سب سے پہلی مضبوط کڑی ہے۔ دونوں قوموں کے اتحاد سے اس نے جنم لیا۔ دونوں کی گود میں اس نے پرورش پائی۔ دونوں قوموں کی متحدہ کوششوں سے یہ پروان چڑھی۔ جن ہاتھوں نے اسے بنایا سجایا انہیں اب اس کی تخریب میں حصہ نہ لینا چاہئے۔ حامیانِ اُردو اور ہندی ایک بہت بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ ان دونوں سگی بہنوں کو رقیب خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک کے مٹنے سے دوسری پر بُرا اثر پڑے گا۔ اُردو ہندی حقیقی بہنیں ہیں صرف لباس مختلف پہنے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں اُردو پیاری ہے تو ہندی بھی عزیز ہونا چاہئے۔ اور اگر ہم ہندی کے دلدادہ ہیں تو اس کی ہی دوسری وضع یعنی اُردو سے ہم کیوں کر نفرت کر سکتے ہیں۔ ہندی کی ترقی اُردو کی ترقی ہے۔ اور اُردو کی ترقی عین ہندی کی ترقی ہے۔ اُردو کانفرنس اور ہندی سمیلنوں میں اسی بات پر زیادہ زور دینا چاہئے، اور عوام کو یہ بتانا چاہئے۔ کہ ان دونوں زبانوں میں کسقدر قربت پائی جاتی ہے۔ یہ چیز ہمارے ملک کی ترقی کیلئے مفید ثابت ہوگی۔

غزل

از جناب تسکین عابری

مجھے برباد کرتے آئیے گا
مجھے کبتک یونہی تڑپائیے گا
کبھی بالائے بام آجائیے گا
غضب میں آپکی دزدیدہ نظریں
ہمیشہ جھوٹے وعدے کرتے کرتے
فقط ازردۂ انگور سے یہ
کدورت دل کی ڈھل جاتی ہے اس سے
قسم ہے اس سر سودا زدہ کی

مجھے پامال کرتے جائیے گا
کسی دن تو کرم فرمائیے گا
قیامت پر قیامت ڈھائیے گا
کلیجے کو نہ یوں برمائیے گا
کہیں ایسا نہ ہو آجائیے گا
حضور اک جام تو پی جائیے گا
نہ پی سکیا تو پچھتائیے گا
بس اب تو نوشِ جاں فرمائیے گا

کبھی تسکین کو تسکین دیجئے
کبھی اس پر کرم فرمائیے گا۔

مغل لائن لمیٹڈ
قائم شدہ سنہ ۱۸۷۷ء
سب سے پہلی اور قدیم کمپنی جو ساٹھ سال سے حجاج کی خدمت انجام دے رہی ہے
حجاج کو خوشخبری
حکومت ہند نے چونکہ حاجیوں کو لیجانیکا بندوبست کر دیا ہے فریضہ حج ادا کرنیکے خواہشمند حضرات اپنی آرزو کو پورا کر سکتے ہیں۔
معلوم ہوا ہے کہ امسال حج اکبر ہوگا
مغل لائن نے حاجیوں کی آسائش و آرام کا ہر ممکن انتظام کیا ہے
جہازوں کی روانگی
ایس ایس رضوانی ۲ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کو بمبئی سے اور کراچی سے جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کو روانہ ہوگا
سب تاریخیں تقریباً ہیں اور ان میں بغیر کسی اطلاع کے تبدیلی کیجا سکتی ہے موسم حج کے خاتمہ تک ضرورت کے مطابق وقتاً فوقتاً دوسرے جہازات بھی جاری رہینگے
کرایہ آمد و رفت معہ خوراک جسمیں فیس قرنطینہ اور فیس حفظان صحت بھی شامل ہے
بمبئی سے جدہ تک
درجہ اوّل ۶۲۱ روپیہ
درجہ دوئم ۴۴۶ روپیہ
درجہ تیسرا (ڈیک) ۱۷۴ روپیہ
کراچی سے جدہ تک
۹۷ روپیہ
۲۲ روپیہ
روپیہ
دیگر ضروری معلومات اور تاریخ روانگی جہازات معلومات کرنے کیلئے ذیل کے پتہ پر خط و کتابت کیجئے۔
میسرز ٹرنر موریسن اینڈ کو لمیٹڈ بمبئی
میسرز ٹرنر موریسن اینڈ کو لمیٹڈ کلکتہ
میسرز گراہمس ٹریڈنگ کمپنی (انڈیا) لمیٹڈ کراچی

از حضرت احسان دانش

سال نو آیا عجب انداز دکھلاتا ہوا | پھول برساتا ہوا غنچوں کو چٹکاتا ہوا
ذرہ ذرہ لیکے انگڑائی اڑا سوئے فلک | مہر عالمتاب کے جلووں میں چکراتا ہوا
عشق کی آنکھوں میں بسکر رہ گئی خواب جمیل | حسن جاگا اپنی رعنائی پہ اتراتا ہوا
دلمیں فطرت کی ہے ترتیب گلستاں کا خیال | گلشنوں کی روح ویرانوں میں دوڑاتا ہوا
جھوم کر ساقی اٹھا تقسیم بادہ کیلئے | گنگناتا شیشہ و ساغر کو کھنکاتا ہوا
آرہی ہے فصل گل جلوہ بہ جلوہ ضو بہ ضو | جھونکا جھونکا اڑ رہا ہے زمزمے گاتا ہوا
نبض موسم میں ہے خون صد بہار و صد جمال | پرچم نور و ضیا اٹھا ہے لہراتا ہوا
وقت کی تاریک تر راہوں کے غاروں کی طرف | ذہن انساں پھر رہا ہے شمع دکھلاتا ہوا
ہے کہیں لحظہ بہ لحظہ اہتمام ربط و ضبط | اور کہیں ہر ہر نفس بجلی سی چمکاتا ہوا
کوئی چونکا ماتم عہد جوانی کیلئے | کوئی اٹھا دولت دنیا پہ اتراتا ہوا
ہے کوئی دو دوستوں کی ربط چیں بر جبیں | دل میں اک افسانۂ ماضی کو دہراتا ہوا
ہے کوئی رسم و رہ دنیا سے یوں مصروف غم | زندگی کو زندگی کہتا ہے شرماتا ہوا
ہیں کسی کی آرزوئیں اسقدر حرماں نصیب | لب پہ لفظ آرزو آتا ہے تھراتا ہوا

ہائے اے احسان کوئی زمزموں سی چونک کر
صبحدم اٹھیگا ٹھنڈے اشک برساتا ہوا

¾ (پون) ملاقات

از سحر

تو نہ آتا تری آواز تو آیا کرتی !
گھر بھی قسمت سے ترے گھر کے برابر نہوا !

خوب ! سنئے ریڈیو پر پہلے ہی پہل یہ شعر سنا ریڈیو سے اپنی "خوش ذوقی" کی داد لینا ہے۔ سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ اس زمانہ کا تخیل ہے جب سائنس نے ریڈیو کا انکشاف نہیں کیا تھا۔ اب اس "ایجاد" "نے" آواز آنے کیلئے ہمسایہ ہونے کی قید اڑا دی۔ ہے اب تو کالے کوسوں سے آواز سنائی دیتی ہے۔ "عشق و محبت" بھی ہزاروں میل دور بیٹھے ہوئے ہو جاتے ہیں۔ زمانہ کے ساتھ ساتھ لوگوں کے "ذوق" اور "پسند" نے بھی ترقی کر لی ہے۔ "معیار محبت" بھی بدل چکا۔ اب "حسن صورت" اور "حسرت دید" عشق کا "لازمہ" نہیں ہا نہ اب وہ زمانہ ہے کہ کسی حسین و جمیل پیکر کو دیکھا اور غش کھا کر دھم سے زمین پر آ رہے۔ لخلخہ سنگھایا جانے لگا۔ اور عاشق صاحب ہوش میں آتے ہی "ہائے ہائے" کرنے لگ گئے اور معشوق صاحب یا تو اتنے رحم دل اور مہربان ہوئے کہ بے تکلف عاشق کا سر گھٹنے پر لیکر بیٹھ گئے۔ اور لگے زلف عنبریں سے سنوارنے۔ یا پھر اگر سو ٹھوں آئے معشوق ہوئے تو ظالمانہ ادا بتائی اور تلوار سونت کر "بسمل محبت" کو مقتل کی طرف سر کے بل چلنے کا حکم دیدیا۔

تو سنا عذرا ! یہ "اولڈ ماڈل عشق" آجکل پسند نہیں کیا جاتا۔ اب تو ہر چیز کیلئے نئی وضع، نئے رنگ، نیا لباس چاہیئے۔ "اپ ٹو ڈیٹ عشق" کیلئے نہ دیکھنا ضروری ہے اور نہ ملنا۔ اب تو وہ زمانہ آپہنچا ہے کہ لوگ "حسن صورت" سے ایک حد تک بے نیاز ہو چکے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی "حسرت دید" بھی رخصت ہو چکی۔ اب تو "درد ہجر" کی خیر منائی جاتی ہے۔ اور جدائی میں تڑپتے رہنا ہی حاصل محبت سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جدائی ہی "بقائے محبت" کی ضامن ہے۔ آیئے میں آپ کو ایک کہانی سناؤں۔ سلمیٰ نے کہا۔ عذرا چائے پی رہی تھی۔ اور ریڈیو میں یہ شعر گایا جا رہا ہے

مرا پیغام کہدینا طبیب درد ہجراں سے
سوئے جاناں اگر باد صبا اسدم نکل جائے

چائے کی پیالی رکھتے ہوئے عذرا بولی "باد صبا" کے ذریعے

پیغام تو اس وقت بھی بھیجا جاتا تھا۔ اور شاید دل اس پیغام کے
مفہوم کو قبول بھی کر لیتا تھا مگر کان اس مفہوم کے الفاظ کو اتنا
صاف اور واضح طور پر نہ سُن سکتے تھے جتنا کہ اب ریڈیو کی
مدد سے بی صبا صاحبہ لاسُناتی ہیں۔ اس پر سلمٰی اور عذرا
دونوں ہنسنے لگیں۔

اچھا اب ریڈیو بند کرو اور کہانی سناؤ۔ عذرا نے کہا۔

اب پرسوں ریڈیو پر ہی سُن لینا۔ سلمٰی بولی۔

نہیں ابھی سناؤ۔ عذرا نے بےچینی سے کہا

آچھا" کہکر سلمٰی نے کہانی شروع کر دی۔

چاندنی رات تھی۔ نہر گنگ میں ایک چھوٹی سی خوبصورت
کشتی متوالی آنکھ کی طرح بہکتی اٹھکیلیاں کرتی چلی جا رہی تھی
نسیم اس آنکھ کی پتلی تھی اور سیاہ ساڑھی میں سے اسکا سفید
اور خوبصورت چہرہ تل کی مانند چمک رہا تھا۔ نسیم محکمۂ نہر کے
چیف انجنیر خان بہادر نسیم الدین کی اکلوتی لڑکی تھی۔

نہر کے کنارے کنارے چھوٹے چھوٹے درختوں کی
قطار تھی۔ انکے پیچھے ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری طرف
پکی سڑک تھی۔ جو رُڑکی تک جاتی ہے۔ پھولوں سے لدی
ہوئی ٹہنیاں جھوم رہی تھیں۔ شاخیں پانی میں چاند کے
عکس کو چوم رہی تھیں۔ فضا دلکش اور معطر تھی۔ نسیم نہ جانے
کس خیال میں محو حافظ شیرازی کے اشعار گنگنا رہی تھی ۵

صبا بلطف بگو آں غزالِ رعنا را
کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
صبا از حلال دل تنگ ما چہ شرح دہد
کہ چوں شکنج ورقہائے غنچہ تو بر توست

ایک سُریلی سی [illegible] کی کمی تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ [illegible] آنکھ کھولکر خود اپنے حسن
دلفریب کو دیکھ رہا ہو۔

ہاں تو کاتب [illegible] نے آنکھ کھولی تھی۔ اپنے [illegible] کا جائزہ
لینے کو مگر اسے ایک دلدوز حادثے کا شکار ہونا پڑا۔

وہ دیکھو! اس وقت نہر کے کنارے کون بیٹھا ہے۔
کہتے ہوئے نسیم نے کشتی کا رخ ادھر کر دیا۔ للوا تم جاؤ
دیکھو کون ہے۔

للوا نے کنارے پر جا کر دیکھا ایک دکھیا لڑکی بیٹھی ہے
لڑکی کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں اس سے زیادہ
مغموم اور مصیبت زدہ اور کوئی نہیں۔

بیلو تم [illegible] رہی ہیں" للوا نے کہا۔

مجھے [illegible] اور بلانیوالا کوئی نہیں ہے
دکھیا نے جواب دیا۔

اس اثنا میں نسیم بھی آپہنچی اس نے للوا اور دکھیا لڑکی
کی گفتگو سن لی تھی۔ [illegible] بغیر کچھ کہے سنے اس کا بازو پکڑ کر
اٹھایا اور کشتی [illegible] ہمدردی کے لہجہ میں
حال پوچھنے لگی۔

دکھیا لڑکی ہمدردی اور سہارا پاکر سسک سسک کر
رونے لگی۔ [illegible] نسیم کے خوبصورت ہاتھ کو اپنے کلیجے سے لگا کر
زور سے بھینچ لیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی گرفت ڈھیلی ہونے
لگی۔ نسیم نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور لڑکی نشست پر لڑھک
گئی۔ [illegible] آوازیں دیں مگر وہ تو بیہوش پڑی تھی۔

للوا کی مدد [illegible] نسیم نے [illegible] پر لٹا دیا اسکے منہ پر
پانی کے چھینٹے دیئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سسکیاں لیتی ہوئی
اٹھنے لگی۔ نسیم بہت نرم دل لڑکی تھی۔ [illegible] نے اسے تسلی

سنتے ہوئے اور اس کے ماتھے پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بیٹے رہنے کو کہا۔ اور خود اسے اپنے نازک ہاتھوں سے پنکھا جھلنے لگی۔

نسیم کو آج معلوم ہوا کہ اس سے زیادہ حسین صورت بھی اس دنیا میں پیدا کی گئی ہے۔ وہ اسے اپنے گھر لے آئی نہلایا دھلایا کپڑے بدلوائے اور اپنے کمرے میں سلا دیا۔ صبح اسے معلوم ہوا کہ "ستارہ" سبحان کی نئی شادی شدہ بیوی ہے جو اس کے باپ کے دفتر میں معمولی کلرک ہے۔ نسیم کو اس بات سے بہت رنج پہنچا اور کوفت ہوئی کہ نسیم اور سبحان کا انمیل جوڑا ملا دیا گیا۔

سبحان ستارہ کو واپس لیجانا چاہتا تھا مگر ستارہ واپس جانا نہ چاہتی تھی لیکن نسیم اور اس کے والد کے ڈر اور ملازمت کے خاطر سبحان نرم پڑ گیا۔ اور ستارہ پر ظلم نہ کرنے کا عہد کر لیا۔ اور اس شرط پر کہ کام کاج سے فارغ ہو کر ستارہ روزانہ نسیم کے پاس آیا کرے گی اسے گھر لیگیا۔

نسیم اور ستارہ کی دوستی اور محبت بڑی سرعت سے بڑھ رہی تھی نسیم کو ستارہ بغیر چین نہ آتا اور ستارہ نسیم بغیر تڑپتی تھی۔

ستارہ کا قصہ یہ تھا کہ وہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ ماں باپ نے شروع شروع ہی سے اس خیال سے پڑھایا تھا کہ وہ سسرال جا کر معمولی خط و کتابت کیلئے کسی کی محتاج نہ رہے مگر تھوڑی ہی مدت میں ستارہ کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اسے اردو ادب اور شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ علم کی دلدادہ تھی اس کی طبیعت عادات و اطوار اپنے ماحول سے بالکل مختلف و متضاد تھے۔ اس نے ماں باپ کو ناخوش کر کے بھی اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ وہ محنت مزدوری کرتی اور سلائی کر کے اپنے ذوق علم کو پورا کرتی۔ اس کی چھوٹی سی لائبریری میں عمدہ عمدہ کتابیں موجود تھیں۔ ملک کا کوئی معیاری اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جسے وہ نہ منگواتی ہو۔

اس کے پسندیدہ رسالوں میں "نوید" بھی تھا اور اسکے ایڈیٹر مسٹر فخری نے اپنی اعلیٰ طرز نگارش کی وجہ سے مدت سے ستارہ کے دل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ ستارہ انکی نادیدہ شیدا تھی۔ انکی لکھی ہوئی ایک سطر بھی ایسی نہ تھی جسے ستارہ نے نہ پڑھا ہو خیالات کی دنیا میں اگر وہ کسی کو اپنے سے انتہائی قریب پاتی تھی تو وہ فخری تھا۔ حُسنؔ اس کی ایک سہیلی تھی۔ ایک مقامی روزنامے کے ایڈیٹر کی لڑکی۔ اسے معلوم تھا کہ ستارہ فخری سے محبت کرتی ہے۔ اس نے ایکدن فخری کی بہت سی برائیوں پر ستارہ کی توجہ منعطف کرانا چاہی۔ مگر ستارہ نے جواب دیا کچھ بھی ہو حُسنا۔ اس جیسا کوئی لکھ نہیں سکتا۔ اس کی ایک اس خوبی کے سامنے اگر اس کی تمام خامیوں کو یکجا کر کے بھی دیکھا جائے تو قابل توجہ نہیں ہے۔

تب حُسنا نے فخری کی تصویر ستارہ کو دکھائی۔ ۵۰ کے قریب عمر کھچڑی داڑھی۔ بگڑی مونچھیں۔ ناک نقشہ بے ہنگم چہرہ بھیانک لاغر و نحیف یہ تصویر نہایت کریہ المنظر تھی۔ ستارہ کے دل پر پہلے تو ایک جھٹکا سا لگا تھوڑی دیر کیلئے اسنے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر فوراً ہی اس کی نظروں میں فخری کے اچھوتے خیالات، ندرت بھرے افسانے بلندی فکر سے آراستہ پیراستہ نظمیں پھرنے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور اس تصویر کو سینہ سے لگا لیا وہ سوچنے لگی اسی پیکر انسانی میں ایسی ایسی بلندیاں اور دلکشیاں پوشیدہ ہیں۔

ایسے اعلیٰ خیالات ایسا نادر و کمیاب اسلوب بیان آہ.... فخری یقیناً محبت کے قابل ہے۔ جب وہ حسنا کے یہاں سے واپس گھر آئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی شادی ایک رشتہ دار سے ٹھہرائی گئی ہے۔

ستارہ ۱۹ سال کی ہو چکی تھی۔ مگر چونکہ وہ پڑھنے لکھنے کے شوق کی وجہ سے جاہلوں کو پسند نہ تھی تعلیمیافتہ طبقہ اسے اس لئے نہیں چاہتا تھا چونکہ وہ غریب اور معمولی خاندان کی تھی۔ اس لئے ابتک کسی اچھے گھرانے سے پیغام نہ آیا تھا۔ ماں باپ پریشان تھے کہ لڑکی کی عمر بڑی ہوتی جا رہی تھی اور ابتک نہیں اٹھی۔

اسلئے جب سبحان کا پیغام آیا تو فوراً منظور کر لیا گیا۔ سبحان کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ ایک بیوی مر چکی تھی دو موجود تھیں تیسری کی شادی کو بھی سولہ سال ہو چکے تھے مگر اولاد ابتک نہ ہوئی۔ گھر بے چراغ تھا۔ اور یہ سب اولاد کیلئے دیوانے ہو رہے تھے۔ سبحان کی تیسری بیوی چاہتی تھی کہ کسی بچے کو دے لیا جائے مگر سبحان اس پر مصر تھے کہ کسی کو گود لینے سے بہتر ہے کہ ایکمرتبہ اور نئی شادی کر کے تقدیر آزمائی جائے۔ تھوڑی سی رد و قدح کے بعد سبحان کی بیوی راضی ہو گئی۔ اور ستارہ کیلئے پیغام بھیجدیا گیا۔ ستارہ کے ماں باپ کیلئے تو گویا "سو گھڑے پانی پڑا" انہوں نے فوراً منظور کر لیا۔

ستارہ کو اس خبر نے بہت صدمہ پہنچایا کہ سبحان جیسے جاہل اور بھدّے مرد سے دو دو بیویوں کی موجودگی میں صرف اسلئے بیاہی جا رہی ہے کہ اس سے اولاد پیدا کی جائے اور اس دنیا کی غلاظت اور بھدّے پن کو بڑھانے کیلئے ایک سبحان کی بجائے دو سبحان ہو جائیں۔ وہ سبحان کو ویسے بھی پسند نہ کرتی۔ مگر طرہ یہ کہ اس کا خانہ دل فخری کی محبت سے آباد تھا۔ اب کسی اور کی گنجائش کہاں تھی۔

شادی سے ستارہ کے انکار کو سخت گستاخی۔ بے حیائی اور گناہ سمجھا گیا۔ اور سزا کے طور پر اس کی شادی جلد کر دی گئی۔

سبحان ستارہ کو بیاہ لائے۔ اور اس کے حسن جہانتاب پر ایسے لٹو ہوئے انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا نے ان کیلئے دنیا میں حور بھیج دی۔

لیکن سب کی بہتری نہ تھی [illegible] بجے رات کو انہوں نے ٹھوکریں مار مار کر ستارہ کو [illegible] سے نکال باہر کیا۔ صبح ہونے ہی تار کے ذریعے [illegible] کو بلایا گیا۔ اس روز سبحان کے گھر میں کہرام [illegible] تھا۔ ان باپ کہتے تھے کہ ہم اس کی صورت سے بیزار ہیں۔ [illegible] لئے یہ مر چکی۔ سبحان کہتا تھا کہ [illegible]۔ میں اسے پیار کیا کروں؟

ستارہ کو [illegible] طرف دوڑی۔ مگر اس کی [illegible] نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور [illegible]۔ اس نے سوچا چلو مفت میں خدمت کیلئے ایک [illegible] گھور کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر چونکہ وہ مالدار [illegible] کی تھی اس لئے کچھ کہہ نہ سکا۔

نسیم بڑا درد مند دل رکھتی تھی۔ ستارہ کا حال جوں جوں اس پر ظاہر ہوتا گیا وہ ستارہ پر بہت ترس کھانے لگی۔ وہ ستارہ کی زندگی سدھارنے کیلئے ہمیشہ غور و فکر کرتی رہتی۔

ایکروز ستارہ بہت افسردہ تھی۔ نسیم نے اس سے کہا کہ میں عنقریب تمہاری زندگی کو پلٹنے والی ہوں۔ اپنا بیان نے

میں [illegible] مدد کرنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ [illegible] ٹھنڈی
سانس [illegible] کہا [illegible] میرا نصیب نہیں
[illegible] ایک مرتبہ
بگڑی، تو بس بگڑ [illegible] میں بھی ہنسی
[illegible] محبت کرتی تھی۔ مگر میری شادی
کردی گئی سبحان سے۔ اور محض ایک [illegible] کام کیخاطر
میری تخیلی دنیا کو الٹ پلٹ کردیا گیا۔ [illegible] کی بات ہے کہ
سبحان کے یہاں اولاد ہوئی تو کیا اور نہ ہوئی تو کیا۔ اس
کیلئے میری پاکیزہ زندگی کی قربانی کیا [illegible] تھی۔

لیکن میرے جذبہ محبت [illegible] نے گوارا نہ کیا کہ
سبحان جیسا شخص مجھے تباہ وغارت کرے۔ [illegible] سبحان کی بیوی
بننے کے بعد میں خود اپنے ضمیر کی مجرم [illegible] ناپاک
اور گنہگار ہو جاتی۔ لہذا میں نے اپنی پاکیزگی اور لطافت کو قائم
رکھنے کیلئے خود اپنے آپ پر ایک غلط الزام لگا لیا۔

میں نے پہلی ہی ملاقات میں کہا تم میرے پاس نہ آؤ میں
تمہارے لائق نہیں ہوں، تم [illegible] اپنا فرض
سمجھتی ہوں کہ تم [illegible] گناہ [illegible] بچاؤں۔ تم جانتے ہو
اب تک میری شادی [illegible] ہوئی تھی، [illegible] کہ مجھ سے
ایک غلطی ہوئی۔ میں ... [illegible] ...... [illegible] —
کرتی تھی" یہ میں [illegible] کہنے پائی تھی [illegible] نے غضبناک
ہوکر پوچھا "تب تمنے گناہ [illegible] ہوگا" کیونکہ انکی سمجھ،
خیال اور گناہ آلود روح کی پہنچ یہیں تک تھی۔ [illegible] محبت کا نتیجہ گناہ ہی
ہوسکتا ہے۔ وہ محبت کی پاکیزگی اور لطافت سے کہاں واقف
ہوسکتے ہیں۔

بہرحال میرا کام بن رہا تھا۔ میں نے جواب دیا "ہاں"
نہ صرف [illegible] ہی بلکہ میں اس کی ایک بھیانک بیماری کی بھی حصہ دار
بن چکی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ تم اور تمہاری اولاد بھی میرے
گناہوں کا شکار بنیں۔

میرا تیر ٹھیک نشانہ پر بیٹھا ...... اور وہی مرد جو چند
لمحے قبل میرے قدموں میں سر رکھ رہا تھا اور پروانے کیطرح
میرے اردگرد منڈلا رہا تھا اس نے تیور بدل لئے۔ ہاں!
میں نے یہ صرف اپنے بچاؤ کیلئے کیا۔ کیونکہ ہندوستانی لڑکی
منت و خوشامد کرکے نہیں بچ سکتی۔ اب رہا صداقت اور
طاقت کا سوال تو ہماری معاشرت میں اس کا کوئی امکان
ہی نہیں ہے۔ لڑکی مرد سے ہمیشہ عمر اور طاقت میں کم ہوتی
ہے۔ غرضکہ ہم کمزور و بے بس لڑکیاں اسی صورت میں اپنے
درندہ صفت اور زبردستی سر تھوپے ہوئے شوہروں سے
بچ سکتی ہیں جبکہ انہیں اپنے سے نفرت اور گھن دلانے والی
کوئی موثر بات کہہ دیں۔

چنانچہ سبحان جو خود تین تین عورتوں کے چچوڑے اور
نچوڑے ہوئے جھوٹے اور ناپاک تھے۔ اپنے کو نہ معلوم
کہاں کا عرش کا تارا یا معصوم و پاک فرشتہ سمجھے بیٹھے تھے
کہ انہیں میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ تھا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ میری سچائی اور خیر خواہی کے
بدلے میں مجھ پر اتنی دیا کریں کہ کسی کے سامنے میرا بھید کھولیں
لونڈیوں کی طرح مجھے اپنے گھر پڑا رہنے دیں۔ مگر وہ کہاں
مانتے تھے۔ انہوں نے مجھے نجس سمجھ کر بوٹوں سمیت پیروں
سے ٹھوکریں مارنا شروع کیں اور کمرے سے باہر نکال دیا۔
اور چلانے لگے۔ میں لٹ گیا۔ میرے ساتھ دھوکا کیا گیا۔
میری سوکن سمجھدار تھیں وہ دوڑی آئیں۔ سب حال سنا اور

میاں کو سمجھا بجھا کر چپ کرایا۔

والدین بھی میرے دشمن ہو گئے کہ اول تو میں ایسی بری کیوں بنی اور جو بنی بھی تھی تو اپنا عیب چھپائے کیوں نہ رکھا۔

اب میرے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ تو خود میرے افعال کا نتیجہ ہے یعنی یہ کہ کتوں کی طرح جھوٹا اور بچا کھچا کھانا طعنے تشنے مار پیٹ۔ اوڑھنے بچھانے کو ٹاٹ اور زمین۔ اس لئے مجھے اس کا گلہ نہیں ہے۔ مگر سب سے بڑا دکھ مجھے یہ ہے کہ میں نہ تو قلم ہاتھ میں لے سکتی ہوں نہ کوئی کتاب پڑھ سکتی ہوں۔ ماں باپ کے یہاں مجھے یہ سکھ تھا کہ سلائی یا محنت کر کے اپنا شوق پورا کر لیتی تھی مگر یہاں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا گلا ہر وقت کوئی گھونٹتے ہوئے ہو۔

تم فخری کے پاس کیوں نہیں چلی جاتیں؟ نسیم نے پوچھا۔

ناممکن ہے۔ وہ اتنا بڑا آدمی، میں معمولی لڑکی پھر میری شادی بھی ہو چکی ہے۔ اور اب تو بدنام بھی ہوں اسکے پاس جا کر اسے بھی بدنامی اور مصیبت میں کیوں پھنساؤں اور پھر بہن! جذبۂ محبت کی شدت بھی ہر وقت ایک سی نہیں رہتی۔ ہو سکتا ہے فخری بھی کچھ دنوں بعد مجھے اچھی نظر سے نہ دیکھے۔ کہتے ہوئے ستارہ نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ محبت کیا ہے، خانۂ دل میں ایک مدھم سی لو جل رہی ہے۔۔ اسے اسی طرح دھیمے دھیمے جلنے دینا چاہیئے۔ اسکی حرارت سے زندگی قائم ہے۔ اگر ہمنے اسے تیز کر دیا تو پھر اس کے جلد بجھ جانے کا اندیشہ ہے۔

نسیم ستارہ کی فلسفیانہ گفتگو سن رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ میں بھی فخری سے محبت کرتی ہوں۔ شدید محبت۔ ایکمرتبہ اس سے مل بھی لی۔ ملاقات کی یاد نے اسکے روئیں روئیں میں سنسنی پیدا کر دی۔ مگر میری محبت ستارہ کی محبت کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ میں فخری کی خاطر یہ ایثار نہیں کر سکتی کہ خود بدنامی مول لوں۔

کیوں چپ کیوں ہو گئیں پیاری نسیم ۔۔ تم تو "نوید" کی خاص مضمون نگار اور شاعرہ تھیں، تم تو فخری سے بخوبی واقف ہو گی۔ فخری کا کوئی ذکر ہی کرو ۔۔۔۔۔ پھر وہ خود ہی ذکر حبیب کرنے لگی۔ آہ ۔۔ نوید ۔۔۔۔۔ کا بند ہونا اور میری مصیبتوں کا آغاز ۔۔۔۔۔ میری شادی سے ۲ ماہ قبل "نوید" بند ہو گیا تھا۔ چونکہ غلام ملک کے لوگ اپنی مادری زبان کے قدردان نہیں ہوتے ہیں۔ اور اپنے ہی ملک میں ملکی زبان کی صحافت کی ابتری کا باعث بنی کو ذوقی ہے۔ "نوید" کے بند ہونے کے صدمے سے فخری شدید بیمار ہو گئے تھے۔ میں نے سنا تو تڑپ تڑپ کر رہ گئی۔ جب صبر نہ ہو سکا تو پہلا خط انہیں دنوں میں نے فخری کو لکھا تھا جس میں اپنے دلی اندوہ و قلق کا اظہار کیا تھا۔ فخری نے رسماً شکریہ کا خط لکھا۔ مگر ان دو سطری شکریہ میں بھی فخری کا قلم جولانیاں دکھلائے بغیر نہ رہا۔ میں نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ دو ماہ میں سات آٹھ خطوں کا تبادلہ ہوا تھا کہ شادی ہو گئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

انہوں نے مجھے اپنی تصویر بھی بھیجی تھی۔ قدرت بھی انصاف پسند ہے۔ کسی کو لیاقت دی تو صورت سے محروم رکھا۔ کسی کو دولت دی تو اسے اعلیٰ اخلاق نہ دیا۔ کسی کو اخلاق اور عمدہ طبیعت دی تو راحت سے محروم کر دیا۔ سچ ہے ہر ایک انسان کو خدا نے کچھ نہ کچھ نعمت ضرور دی ہے۔ اسلئے شکایت کا کسی کو موقعہ نہیں۔ نسیم مسکرائی اور کہا کہ خدا نے تمہیں تو ہر طرح کی نعمتیں دی ہیں۔ بس صرف دو

چیزیں راحت اور دولت نہیں دیں۔ فخری کو بھی سب نعمتیں
ملی ہیں۔ لیاقت، صورت، دولت، عزت، شجاعت
اخلاق طبیعت سب کچھ سوائے صرف "راحت" نہ ملی۔ کہتے
ہوئے اس نے کہا آؤ تمہیں فخری کی تازہ ترین تصویر دکھاؤں۔
وہ اسے اپنے اسٹڈی روم میں لے گئی۔ اور فخری کی تصویر کی طرف
اشارہ کر دیا۔ ستارہ حیران رہ گئی۔ فخری بیچارے کو ایسی
حسین وجمیل صورت کہاں ملی۔ اسنے کہا یہ تصویر تو فخری کی
ہرگز نہیں ہے۔ فخری کی تصویر تو یہ رہی۔ کہتے ہوئے اسنے
ایک اور تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

نسیم قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ اور بولی فخری نے تمہیں
بھی بنایا۔ وہ بڑا شوخ طبع ہے۔ [illegible] نے ہزاروں لڑکیوں
کے جوش عشق کو یہی تصویر بھیجکر ٹھنڈا کر دیا ہے۔ حالانکہ اس تصویر کو
اس سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ اصل تصویر فخری کی وہی ہے
جسکے فریم پر گلاب کے پھولوں کا ہار اٹکا ہوا ہے۔

دیکھو یہ کیا ہے ..... کہتے ہوئے نسیم نے ستارہ کو ایک
خط دیدیا۔ یہ فخری کا خط تھا۔ اس میں ستارہ کی تعریف کرتے
ہوئے فخری نے لکھا تھا کہ [illegible] کو میں نے مات دی
ہے۔ مگر اس حریف سخت [illegible] کے سامنے میں ہتھیار
ڈال چکا ہوں"۔

ستارہ خط پڑھ کر گم سم سی ہوگئی۔ نسیم نے اس کے
گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے کہا اور اس لڑکی کو سینے سے لگا کر گرفتار
کر لیا .....

محبت جب مایوسی کی فضا میں پرورش پاتی ہے تو اس کا
دائرہ بہت وسیع ہوجاتا ہے۔ اور محبت کرنیوالا چاہتا ہے کہ
ساری دنیا اس کے محبوب سے محبت کرنے لگے۔ چونکہ اس
طرح وہ اپنی کمی کو یوں پوری ہوتے دیکھتا ہے۔

امارت اور دولت کے لحاظ سے فخری نسیم کے پاسنگ بھی
نہ تھا اسلئے نسیم فخری کو نہ مل سکتی تھی۔ اور ستارہ فخری کے
ہم پلہ نہ تھی۔ اسلئے وہ اسے پانے کا خیال بھی نہ کرسکتی تھی۔
اسلئے ستارہ کی خواہش تھی کہ نسیم بھی فخری کو خوب چاہے۔
اور نسیم ..... ؟ اس کی منگنی ایک ریاست کے ولیعہد سے
ہو چکی تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ اپنے ہونے والے شوہر سے
محبت کرنا سیکھے۔ مگر اس کی محبت کی دھارا فخری کی ہی طرف
بہہ رہی تھی اسلئے وہ چاہتی تھی کہ ستارہ ہی اس کی طرف سے
بھی فخری کو چاہے۔

ستارہ اور فخری کی خط وکتابت ہونے لگی۔ نسیم بھی اس سے
لطف اندوز ہوتی۔

شانتی نسیم کی سہیلی تھی اور اس کے یہاں چند دنوں کیلئے
مہمان آئی ہوئی تھی۔ ایک روز شانتی کے بھائی کا تار آیا کہ
آج رات کو ۸ بجے ریڈیو پر تقریر ہے۔ شانتی خوشی سے
اچھل پڑی۔

شانتی، نسیم اور ستارہ تینوں تقریر سن رہی تھیں اپنی
تقریر میں سدھیر نے بار بار شانتی کا نام لیا۔ ایسا محسوس
ہوتا تھا کہ سدھیر خاص اپنی بہن سے مخاطب اور ہمکلام ہو رہا ہے۔

کچھ دنوں بعد اپنے خط میں فخری نے ستارہ کو یہ مژدہ
سنایا کہ ۲۷ مئی کی شام کو "فارسی شاعری" پر میری تقریر
ہے۔ ستارہ نے خوش ہوکر لکھا کہ یہ میری آپکی "پہلی ملاقات"
ہوجائے گی۔ خط وکتابت سے نصف ملاقات ہوتی ہے

ریڈیو پر چونکہ آپکی آواز بھی سنائی دیگی۔ سامنے ہی آپ کی تصویر لگی ہے۔ اسلئے میں اسکو "یون ملاقات" سمجھتی اور کہتی ہوں فخری کا جواب آیا کہ آپنے "ریڈیو کی تقریر کو یون ملاقات" بالکل درست فرمایا۔ مگر پاؤں کی کسر بھی بڑی کسر ہے۔

ستارہ کا ایک ایک منٹ پہاڑ کی طرح گزرنے لگا۔ بڑی مشکل سے ۲۷ مئی کا دن آپہنچا۔ دن کاٹے نہ کٹتا تھا۔ شام سے پہلے ہی ستارہ نہا دھوکر پھولوں کے گہنے سے سج کر دلہن کی طرح نسیم کے بنگلہ پر پہنچی۔

۱۵ منٹ پہلے ہی اس شہر کا میٹر ملا لیا گیا۔ ستارہ کا دل چاہتا تھا کہ ریڈیو کو اٹھا کر گود میں رکھ لے۔ اسی کی بدولت آج وہ اپنے دیوتا سے "یون ملاقات" کا شرف حاصل کریگی۔

عین وقت پر اناؤنسر نے اعلان کیا کہ "پروفیسر فخری بسبب ناسازیٔ مزاج تشریف نہ لا سکے۔ انکی تقریر آپکو پڑھ کر سنائی جائیگی۔ ستارہ کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا۔ مگر وہ اپنے کو سنبھالے بیٹھی رہی کہ فخری کی آواز نہ سہی اس کا لکھا ہوا مضمون ہی سن لوں۔

مضمون کے آغاز میں وہ یہ شعر سنکر تڑپ اٹھی.....

اے ہدہد صبا بہ سبا می فرستمت!
بنگر کہ از کجا بہ کجا می فرستمت!

تقریر ختم ہوئی تو ستارہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ چپکے سے اٹھی اور اپنے گھر آکر ٹاٹ کی گدڑی میں منہ لپیٹ کر پڑ رہی۔ یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

وہ بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک
اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

اور دیکھنا بھی کہاں۔ صرف سننا..... کالے کوسوں دور سے... مگر اپنی محرومی سے زیادہ اسے فخری کی بیماری سے تشویش تھی۔

تین ماہ بعد ریڈیو پر ایک شاندار مشاعرہ ہوا۔ اس میں فخری بھی اپنی نظم پڑھنے والا تھا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ستارہ بھی مشاعرہ سننے کو آئی۔

مگر بارش کے موسم کیوجہ سے ریڈیو میں ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا سوائے کھڑکھڑ کے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ جب صاف سنائی دیا تو یہ اعلان کہ "علامہ فخری کی نظم آپنے سنی اب پروفیسر یزدانی کا کلام سنیئے"

ستارہ کے دل پر کیا بیتی ..... یہ معلوم نہیں مگر اسکے ہاتھ پاؤں خاص طور پر انگلیوں میں انتہائی کرب و بے چینی کے ساتھ تشنجی علامتیں دکھائی دیں۔

پھر ایکمرتبہ سنا گیا کہ فخری ریڈیو پر حالات حاضرہ پر ایک مقالہ پڑھینگے۔ مگر ستارہ پے در پے مایوسی کیوجہ سے تقریر سننے نہ گئی۔ اتفاقاً سے اس روز تقریر صاف سنائی دی نسیم نے آدمی دوڑایا۔ مگر وہ گھر میں نہ تھی۔

جب ستارہ نے سنا کہ تقریر خوب سنائی دی تو "اُف" کرکے رہ گئی۔

پندرہ دن بعد فخری پھر اپنا ایک افسانہ نشر کرنے تھے لیکن اسمرتبہ چار دن پہلے ہی ستارہ کو بخار نے آدبایا۔ وہ فخری کی پیاری آواز سنے بغیر مرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر جس روز تقریر تھی اس دن ستارہ کو ہوش ہی نہ تھا بچنے کی آس تک ٹوٹ گئی تھی۔ یہاں تک جس وقت فخری اپنا افسانہ نشر کر رہا تھا نسیم ستارہ کے پاس بیٹھی اسکے آخری سانس

گن رہی تھی اور آنسو بہا رہی تھی ۔ دوسرے دن جب ستارہ کو ہوش آیا تو اس نے سر پیٹ لیا ۔

ستارہ مستقلاً بیمار رہنے لگی اسے تپ دق ہوگیا ۔ نسیم نے فخری کو لکھدیا ۔ فخری بیچین ہوگیا ۔ اس نے نسیم سے التجائیں کیں کہ ستارہ کو کسی نہ کسی طرح لیکر دہلی آجائے مگر ستارہ کی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ گھنٹہ بھر بھی سفر کر سکے

آخر وہ مبارک دن بھی آپہنچا جبکہ بدنصیب ستارہ کی پہلی اور آخری خواہش پوری ہوئی ۔ وہ نسیم کے کمرے میں بستر مرگ پر پڑی تھی "ریڈیو" سامنے رکھا ہوا تھا ۔ فخری نے چند خطوط کو ترتیب دیکر ایک افسانہ تیار کیا تھا جو آج ریڈیو پر نشر کیا جانیوالا تھا ۔

ستارہ نے نسیم سے کہا کہ ریڈیو اس کے پلنگ کے قریب کردیا جائے ۔ ستارہ اپنے کمزور اور سفید اور نازک ہاتھ کو ریڈیو پر بڑی محبت اور ملائمت سے پھیر رہی تھی ۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا گویا فخری کو چھو رہی ہے امید اور ناامیدی کے ہجوم سے ایک رنگ اس کے چہرے پر آتا اور ایک جاتا تھا ۔ جب اناؤنسر نے اعلان کیا کہ ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر فخری آپکو اپنا شاہکار افسانہ سنائینگے" تو ستارہ کی سانس زور زور سے چلنے لگی ۔ اس کی پتلیاں پھرنے لگیں ۔ نسیم گھبرائی اس نے اسے پانی پلایا منہ پر پانی کے چھینٹے دئے فخری نے شعر پڑھا ۔

خواہی کہ روشنت شود احوال سرِّ عشق ! !
از شمع پرس قصّہ ز باد صبا مپرس !

یہ فخری ہی کی آواز ہے" نسیم نے خوش ہوکر کہا ۔ ستارہ کا چہرہ گلابی ہوگیا ۔ اور وہ بے تابانہ اٹھنے لگی نسیم نے اسے روکنا چاہا ۔ مگر ستارہ نے کہا ۔ بہن بالآخر میری تمنّا پوری ہوگئی میں نے اپنے فخری سے "پون ملاقات" کرہی لی وہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی اور سرکتی ہوئی آگے بڑھکر ریڈیو کو بے تابی سے کئی بار چوما ..... اور وہیں پلنگ کی پٹی پر گر پڑی نسیم نے اسے اٹھایا اور پلنگ پر سیدھا لٹا دیا ۔ ستارہ کی سانس اکھڑ چکی تھی نبضیں ساقط تھیں نسیم گھبرا کر رونے لگی ۔ اور پکارنے لگی ستارہ ! ستارہ ! فخری کی پوری تقریر تو سن لو ... !

ستارہ نے آنکھیں کھولدیں ۔ نسیم کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا ۔ پھر گردن پھرا کر ریڈیو کی طرف دیکھکر مسکرائی اور کہا فخری بس اور کچھ نہ کہہ سکی ۔ ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی وہ پُرالم زندگی کی قید سے آزاد ہوگئی ۔

کسی کی موت پر ہرگز نہ کیجئے چشم نم صاحب
بہت سارے انہیں جو اس جینے پہ مرتے ہیں

کی

چند قابل قدر خصوصیات

"شاہی" ہر موسم میں استعمال کیجاتی اور ہر مزاج کے موافق ہے۔

"شاہی" انتزاکش خون کے لئے دنیا کی بہترین دوا ہے

"شاہی" اعصاب کی قوت، دل کی فرحت، جگر کی قوت اور دماغ کی تقویت کیلئے اکسیر اعظم ثابت ہو چکی ہے

"شاہی" عورتوں کیلئے پیغام حیات ہے، سیلان الرحم (سفید پانی جانا) درد کمر ایام ماہواری کی بےقاعدگی وغیرہ کے دور کرنے میں بے مثل ہے۔

قیمت فی شیشی دو روپے

مزید معلومات کیلئے فہرست مفت

طیبی دواخانہ یونانی

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی ۳ | چوک بازار اندور
ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳ | تار کا پتہ: "شاہی" اندور

نتیجۂ فکر حضرت فراق گورکھپوری

ہیں سب اچھی صورت والے
جانچے پرکھے دیکھے بھالے

آج ہیں کتنے افسردہ خاطر
کل تھے جو آتش کے پرکالے

رنگ ترا دنیا سے انوکھا
ڈھنگ ترے دنیا سے نرالے

کشتیٔ دل کے، کشتیٔ دل سے
توڑ دے لنگر، ہاتھ اٹھالے

حسن خفا ہے، اک دنیا سے
ہے کوئی جو بات بنالے؟

گہری نیند میں جاگ رہے ہیں
تری آنکھوں کے متوالے

روپ انوپ، چال متوالی
آنکھونکا جادو بھی جگالے

پھر یہ تمنّائیں نہ رہیں گی
اے دل جی بھر کے للچالے

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا
آج منالے، آج منالے

چاند کے ٹکڑے قاتل عالم
کرتے ہیں اندھیر اُجالے

پریم کا ساگر دل کی کشتی
کون ڈبوئے کون اُچھالے

خواب عدم کے ہو رہے دونوں
سونیوالے جاگنے والے

عشق نے مٹ کے بدل دی دنیا
دیکھتے رہ گئے دیکھنے والے

ٹوٹ کے ساون برس رہا ہے
آگ جگر دل کی بھڑکالے

کون یہ وادیٔ عشق سے نکلا
آنسو روکے دلکو سنبھالے

تیرے چھوٹنے سے بھی دکھے جو
کون اُس دل کی پھانس نکالے

آج پیا پردیس سے آئے
آنسو ہنستے ہنستے بہالے

زنداں بھی زنداں نہ رہے گا
اور ابھی کچھ جی گھبرا لے

زیست کا وقفہ موت نہیں ہے!
رونے والے جان گنوا لے

اتنی بھی فرصت پھر نہ ملے گی
ہنس لے ہنسا لے رو لے رُلا لے

کر لے سہاگ چتر البیلی
آتے ہیں ساجن روپ سجا لے

آج تو جیسے وہ بھی یہیں ہے
آج تو دل کا درد بڑھا لے

آج شراب میں جوش بہت ہے
آج چھلک جاتے ہیں پیالے

ہم سے پوچھ! یوں تو وہ بہت ہیں
سیدھے سادے بھولے بھالے

عشق کا حاصل یہ بھی بہت ہے
کچھ شرما لے کچھ پچھتا لے

ہم بھی ہوتے ہیں کچھ غافل
اے دل تو بھی آنکھ لگا لے

رات اندھیری راہ کٹھن ہے
دردِ محبت کو چمکا لے

جانے سکوتِ غم پر دل کے
باتوں باتوں میں بہلا لے

چھائیں گھٹائیں، آئیں ہوائیں
تو بھی من کی پینگ بڑھا لے

کیا ہے سلیقہ عشق کو لیکن
حُسن کو بھی سانچے میں ڈھالے

تنہائی بھی کروٹ لے گی
جاگے ہوؤں کو نیند تو آ لے

بستی بستی منزل منزل
جی اٹکا لے دل بھٹکا لے

غم بھی بقول فراق خوشی ہے
وہ بھی ہیں کیا اُلٹی مت والے

"خاص برائے تنویر"

کلیانی.....

از جناب قادر نیازی اونوی

پیاری کلیانی ....

تمہاری دو تحریریں میرے پاس پہنچیں۔ تم میرے ساتھ کیوں پریشان ہوتی ہو میں نے تو تمہیں اپنے منہ سے کچھ نہ کہا۔ مجھے معلوم ہے رسوم کی قید آہنی دیوار سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ .... مجھے کیوں خواہ مخواہ شرکت کیلئے لکھتی ہو ـــــ کلیانی تمہیں تو آرزو ہے کہ تم مجھے صرف ایکبار ـــــ نہیں شاید اخیر بار .... گھونگٹ کی اوٹ سے دیکھ لو۔ اور اپنی تمام بیقراریوں کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دو۔ اور دل کی خلش کو ہمیشہ کیلئے مٹا ڈالو .... لیکن میرے دل میں اتنی سکت اب باقی نہیں رہی کہ ان آنکھوں سے تمہاری "جدائی" کا منظر دیکھ سکوں۔ ..... میں نہیں دیکھ سکونگا .... میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی ـــ میں دیوانہ ہو جاؤنگا .... مجھے رہنے دو اس دیہات میں جہاں صرف چند جھونپڑے ہیں ..... جہاں سادہ طبیعت کے لوگ آباد ہیں ...... جہاں محبت ہوتی ہے صرف محبت کیلئے ..... ان سادہ دل لوگوں میں دن گذار رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری زندگی تمام ہو جائے ...... صرف تمہارا نام لیتے لیتے ....

تم افسوس نہ کرو ..... اپنی زندگی سُکھ سے گزارو... اپنے پتی کو ہر ممکن طریقہ سے خوش رکھنے کی کوشش کرو .... لیکن کلیانی یہ کبھی ظاہر نہ ہو کہ "اجیت" کی محبت تمہارے دل میں ہے ....

ـــ کلیانی صرف ایک کھیت ہے ..... ایک جھونپڑا .... جھونپڑے میں ایک ٹوٹی کھٹیا .... ایک لوٹا اور .... ایک گھڑا ... اور ایک دل .... بجھا ہوا دل اور اس دل میں تمہاری یاد ... خوش رہو کلیانی۔

تمہارا "اجیت"

(۲)

...... مجھے رہنے دو اس دیہات میں جہاں چند جھونپڑے ہیں ..... جہاں سادہ طبیعت کے لوگ آباد ہیں .... جہاں صرف محبت ہوتی ہے محبت کے لئے ....

ان سادہ دل لوگوں میں دن گزار رہا ہوں ــــ

چاہتا ہوں میری زندگی تمام ہوجائے تمہارا نام لیتے لیتے ..... پتی کو ہر ممکن طریقہ سے خوش رکھنے کی کوشش کرو ..... لیکن کلیانی یہ کبھی ظاہر نہ ہو کہ "اجیت" کی محبت تمہارے دل میں ہے ....

اب اس کی نظریں آنسوؤں سے چھنکر حرفوں پر پڑ رہی تھیں ۔

یہ کبھی ظاہر نہ ہو کہ "اجیت" کی محبت تمہارے دل میں ہے ...... خوش رہو ۔ کلیانی ....

تمہارا ... اجیت

(۳)

تہذیب و تمدن کے وہ گھوارے جہاں عصمت کی قیمت صرف چند سکّے ہوتی ہے .... جہاں کے منصف ان کو عدالتوں میں غریبوں کے فیصلے لکھتے ہیں ..... اور جن کے جنبش قلم سے ہزاروں غریبوں کے جھونپڑے اُجاڑ دئے جاتے ہیں .... راتوں کو چھپ چھپ کر سیاہ کاریاں کرتے ہیں ......

ان ہی سیاہ دل لوگوں کے پاس محبت کرنا جرم ہے ...... ہاں اسی سنگدل جگدیش نے میرے باپ کو ایکہزار روپیہ نقد دیکر اپنے بیٹے "کمار" کے لئے آمادہ کیا ...... اسے کون اپنی لڑکی دے سکتا تھا .... اوباش .... شرابی ..... قمار باز ...... کیا کوئی جان بوجھ کر اپنی لڑکی کو آگ میں ڈھکیل دیگا ......

دو سال کا لگان چڑھ گیا تھا ..... زمیندار سے کہلوا کر میرے باپ پر سختی کی اور روپیہ دیکر آمادہ کیا .... سادہ دل دیہاتی آج بھی قانون کی پیچیدگیوں سے ناواقف ہیں .... یہ ہے مہذب ڈاکہ زنی ......

(۴)

کمار نے غصّہ سے کہا ..... دیکھو رامو .... تم حقیر خدمت گزار ہو ..... قدیم عقیدوں کے پابند ہو .... میں تمہاری خدمات کو کبھی نہ بھولوں گا .... تم میرے ایک وفادار نوکر ہو .... میری حالت پر افسوس کرتے ہو .. تمہیں افسوس کرنے کا حق ہے ضرور .... لیکن میرے اچھے برے فعلوں میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ۔"

—— آخر کما با تو تم فضول دولت برباد کر رہے ہو ۔ یہ تمام دوست جو آج لمحہ بھر کیلئے بھی دور نہیں ہوسکتے ہمیشہ ساتھ نہ رہینگے ۔ اب لے دے کے ایک گاؤں اور دو کھیت باقی رہ گئے ہیں .... ذرا .... تمہارے بیٹے نرمل کمار ...... اور کلیانی "کا تو خیال کرو"

—— بس رامو زبان درازی ہو چکی ۔ مجھے معلوم ہے ... دو کھیت اور صرف ایک گاؤں باقی رہ گیا ہے ..... جاؤ اپنا کام کرو ....

کلیانی آخر تم اپنا دل کیوں کڑھاتی ہو ...... میں نے بہتیرا سمجھایا ...... کمار مجھ پر ناراض ہونے لگے ...... جانے بھی دو ۔ زمانہ خود سمجھالے گا —

دیکھو نا یہ فوارہ ...... بڑے مالک (خدا انہیں اچھی جگہ دے) اسی جگہ گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے ۔ —

چپ رہو رامو ۔ آج بڑے مالک ہی کی وجہ سے کہ میں اتنے صدمے اٹھا رہی ہوں ...... شاید رامو زمانے ہی کا دوسرا نام "مصیبت" ہے ۔

— اگر کلیانی تم افسوس کرتی ہو تو — اور ......
زیادہ افسوس کرو ...... اگر اب نہیں کر سکتی تو پھر
....
...... تم دن رات ..... شراب اور قمار بازی ....
میں ......
...... کلیانی جانتی ہو تمہیں ایسا کہنے کا حق نہیں .....
— کچھ نرمل کمار کا تو خیال کرو —
— اگر تم خیال نہیں رکھ سکتیں تو "نرمل" کو میرے
پاس چھوڑ کر تم کہیں چلی جاؤ —"
— کلیانی نے ایک زور کی چیخ ماری ......
اور کمار کے قدموں پر گر گئی

(۵)

کمار کو بمبئی میں ٹھہرے ہوئے کچھ کم چھ مہینے ہونے
میں۔ یہاں اس نے اپنی رہی سہی جائداد کو کچھ تو بمبئی
کے نگار خانوں میں تباہ کر دیا اور کچھ ریسنگ اور
قمار بازی میں ...... اب صرف اس کے بدن پر
ایک کوٹ تھا — وہ بھی پھٹا ہوا ... ایک
پتلون تھا جس میں کئی بیرنگ پیوند لگے ہوئے تھے
— وہ دو ماہ سے بیمار تھا — بمبئی کے
جارج میموریل ہسپتال میں —
— ہسپتال کے بڑے ہال میں ہلکے زرد قمقمے
روشن تھے۔
کمار کے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا — دنیا
کتنی خوفناک جگہ ہے ....
— سچ ہے دنیا میں وفا نہیں ....

اس کے کان میں ایک بچہ کے چیخنے کی آواز
آئی ....
کمار کی آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو آئے
اسے اپنے بیٹے نرمل کمار کا خیال آنے لگا ..... اور
نرمل کمار کے خیال کے ساتھ ہی اپنی نیک بیوی کلیانی
کی صورت بھی ...... یہی نہیں .... بلکہ اس کے
کانوں میں راموکی آواز گونج رہی تھی۔ بابو تم فضول
دولت برباد کر رہے ہو۔ یہ تمام دوست جو آج
لمحہ بھر کے لئے بھی دور نہیں ہوسکتے۔ ہمیشہ ساتھ
نہ رہینگے ......"
اس نے ہیبتناک چیخ ماری اور بدحواسی سے
پلنگ پر لیٹ گیا —
— ٹھیک اسی وقت ہسپتال کا بوڑھا چپراسی
ہنسا .... ایک فلسفیوں کی سی ہنسی۔ جو ایک
خاص مدت کے تجربے کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔

(۶)

آج کمار کے انتقال کو چار روز کا عرصہ ہوچکا
ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق ہسپتال کے
"غربا رفنڈ" کی جانب سے اس کے بیوی بچوں کو
موت کی اطلاع دیدی گئی ہے۔
رامو اب اپنا اس دیس میں کوئی نہیں —
چلو اجیت کے گاؤں انند پور چلیں —
— بیل گاڑی کوئی چار بجے رات کو انند پور
پہنچی — تمام شد

معاہدہ

از حضرت ساغر نظامی

سرِ شوق پیہم جھکاتا رہونگا
بہ ہر گام کعبہ بناتا رہونگا

میں نغموں کے دریا بہاتا رہونگا
ترنم کے طوفاں اٹھاتا رہونگا

رہا گر ترے نطق کا فیض جاری
تو ملہم کو حیراں بناتا رہونگا

بہت دُور سی یاد آتا رہونگا
میں ساون میں انکو رلاتا رہونگا

محبت کی مایوسیوں کی قسم ہے
ابد تک انہیں آزماتا رہونگا

اجڑتی رہیگی مرے من کی بستی
نئی دل کی بستی بساتا رہونگا

وہ آنچل کو اپنے جھٹکتی رہینگی
جو میں خاک ہوس اڑکی چھاتا رہونگا

ہمیشہ مجھے وہ بھلاتی رہیں گی
سدا انکو میں یاد آتا رہونگا

جنونِ وفا جبتلک ہے سلامت
محبت کو وحشی بناتا رہونگا

بہار محبت کا پالا چمن ہوں
خزاں میں بھی میں لہلہاتا رہونگا

وہ محفل میں میری زباں بند کردیں
تو نظروں سے کہانی سناتا رہونگا

ازل میں محبت سے وعدہ تھا میرا | کہ اپنی جوانی لٹاتا رہونگا

یہ بادِ مخالف سے ہی شرط میری | چراغ اپنے خود ہی بجھاتا رہونگا

ہے برق و شرر سے مرا عہد نامہ | کہ خود اپنے خرمن بتاتا رہونگا

شب تار سے مینے وعدہ کیا ہے | اندھیرے کو مشعل دکھاتا رہونگا

زباں دی ہے سرمست موجوں کو مینے | کہ طوفاں میں بھی مسکراتا رہونگا

گذرتا رہیگا مرے سر سے طوفاں | میں موجوں کا بربط بجاتا رہونگا

کیا ہے تباہی سے یہ عہد مینے | کہ تعمیر ہستی کو ڈھاتا رہونگا

یہ سازِ مشیت سے پیماں ہے میرا | مصیبت میں بھی گنگناتا رہونگا

ہے تقدیر دامن کی صد چاک ہونا | میں دامن کو کبتک بچاتا رہونگا

حقیقت کے رخ سے حقیقت کے رخ پر | حجاب توہم گراتا رہونگا

تغیّر کا جھنڈا نہ لہرائے جبتک | بغاوت کے پرچم اڑاتا رہونگا

ہیں جنبش میں آویزہ تاک جبتک | میں پیتا رہونگا پلاتا رہونگا

زہے فیض ساقی زہے کیف باقی | میں ساغر ہوں پیتا پلاتا رہونگا

مرے دم میں دم ہے تو ساغر ابد تک

پلاتا، لنڈھاتا، بہاتا رہوں گا

"از ٹامس کیمپبل"

مترجم دکھی پرمنگری

نوٹ:۔ سنہ ۱۸۰۰ء کا ذکر ہے جرمنی اور اسٹریا میں جنگ چھڑی ہوئی۔ نپولین کے سپاہی دریائے ڈینوب کے کنارے خیمہ زن تھے۔ دسمبر کے ماہ میں سرد ملک میں ایک دریا کے کنارے خیمہ زن ہونا کتنا لرزہ خیز ہوتا ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل نظم سے لگ سکتا ہے۔ ٹامس کیمپبل کی ہر نظم سے آپکو احساس ہوگا کہ اس نے فطرت انسانی کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ چنانچہ مندرجۂ ذیل نظم میں بھی آپ یہی کچھ پائینگے۔ ٹامس کیمبل کی شاعری کے متعلق تو الگ صفحات کی ضرورت ہوگی فی الحال اسی ایک نظم سے اندازہ لگائیے یہ نظم جرمن اور اسٹرین صلح سے قبل سنہ ۱۸۰۱ء کے آخیر میں لکھی گئی تھی۔ ٹامس نے جرمنی ہی میں اسے مکمل کیا — (دکھی پرمنگری)

(نظم)

پہلے پہل جب آتشیں رخ آفتاب نے اپنا لاہوتی سفر شروع کیا

زمین اور نیلے سمندروں کے اطراف — تو

اسکے بچّے — چاروں موسم دوڑتے ہوئے آئے!

سب سے پہلے — سبز لباس میں — رقصاں!

ملکوتی مسکراہٹ کی حامل — پُرشباب بہار!

اسکے بعد ہی گلابی گرما — آغوش پدری میں تھی۔

سنہری بالوں والے باپ نے اسے اپنی مسکراہٹوں کے قریب ہی رہنے کا حکم دیا!

کہاں —؟ جبرالٹر کی سیاہ وادیوں یا لیمو کے

درختوں — سے [illegible] — جزائر میں!

پھر گدرائے جوبن [illegible] غیب کا جامہ زیب تن کئے

تاج کی رانی نے لجاتے ہوئے باپ کے تخت کو بوسہ دیا۔

— اس کے تاج میں اک سرخ انار تابندہ تھا اور

گیہوں کے سبز پودے اس کی کمر کو حلقہ میں لئے ہوئے تھے!

لیکن —

پرشور جاڑا — وہ بھاگ گیا

دُور — [illegible]!

ان پہاڑوں پر — جنکی انتہائی بلندیاں — جیسے

ستاروں کو تھامے ہوئے ہیں۔ جہاں [illegible] لہروں کی

گاڑیوں پر سوار کا مزہ آتا ہے
نجبرا یا اس کے ساتھ تھی
ان طوفانوں کے کناروں پر ــــ جہاں ــ
پرشور گرداب ـــ دریائی بھیڑوں کو ان کی چیخ و پکار
کے ساتھ گھما گھما کر اڑا لے جاتے ہیں ــ
اس بھوتی گھر میں جہاں ــــ
قہر کا دیوتا ـــ اپنے رزمیہ گیت آندھیوں کے دف پر
گاتا رہتا ہے
سوائے اس وقت کے جب وہ
طوفان کے ہمراہ ـ اڑتی ہوئی آندھیوں پر سفر کرتا ہے
فطرت کے مخملی لباس کا رنگ اڑاتے ہوئے
پامال شدہ پھولوں پر قصیدہ !
پڑھاتا ہے ــ بربادی کا دیوتا
اس ناوک کو بلند کرتا ہے ـــ جو اسے واپس شمال
میں پہنچا رہا ہے
جو اس کے نشیب آسمانوں کو قطع کرتا ہوا برفانی سپر
میں پیوست ہو جاتا ہے !
اے ـ ! طوفانوں کے آقا ــــ جسکے وحشی کان !
جادوگروں کے خوفناک ڈھولوں سے مسرور ہوتے ہیں !
جب بروبحر اپنی خونی آنکھوں سے
تیرے خوفناک وجود کے قصیدے پڑھتی ہے !
اے موت کے فرشتے ـ تباہ کاری کی طاقت !
جو بہت نزدیکی سے آ رہا ہے ! بتا !
کیا انسانی التجائیں و دعائیں ـــ تجھ سے الماس دل پہ
اثر پذیر ہوتی ہیں

اگر ہاں ــــ تو
او وحشی ــــ لا پرواہ
میری التجا سن !
اس تباہ سال پر ذرا نرمی سے حکومت کر
آوارہ گردوں کے نشیمنوں کو یخ بستہ نہ کر
تباہ حالوں کے آنسوؤں کو ان کی آنکھوں ہی میں منجمد نہ کر
اور غریبوں کو انکے گرم کپڑوں سے خالی بستروں میں
تپ لرزہ میں مبتلا نہ کر
ان معصوم یتیموں سے بھی ذرا نرمی سے پیش آ !
جو بالکل بے قصور ہیں !
لیکن خصوصاً ــــ !
ان پر رحم کر او بادلوں کے شہنشاہ !
بادبانوں سے چھپکلی کی طرح چپٹے ہوئے ملاحوں پر
جب جہازوں کے پرنے چٹانوں پر جھک رہے ہوں
اور ان کے مسافر بھوت بنکر
سمندر کی گہرائیاں ناپنے میں مشغول ہوں !
ذرا اپنی برفانی ہواؤں کو آہستہ کر لے !
ان خیموں سے پٹے ہوئے کناروں پر
جہاں گہرا عنابی رنگ والا ـ دریائے ڈینیوب جھنکار رہا ہے !
اے سرد ہواؤ ــــ سن رہی ہو ؟
ہزاروں قریب المرگ انسانوں کی دبی ہوئی آہیں اور نالے !
تم بھی لرز رہے ہو ـ نصف شب کے مردار خوار اژدہو !
زخمیوں کی گوش خراش چیخوں اور تڑپوں کی دہلانیوالی آوازوں سے
جو تمہاری مکروہ بھنبھناہٹ سے کہیں زیادہ درد انگیز و خوفناک ہیں !
افسوس شاید تمہارے (ہمارا طوفان بھوت اڑ رہے) بے رحم سینوں میں بھی
ان پسماندہ و زیر بار ماندہ سپاہیوں کیلئے ہمدردی پیدا ہو جائے مگر ـــ !
انسان ـ آہ انسان ـ موت کو ذرا آرام نہ لینے دیگا !
اُف ـ انسانی کینہ ـــ اور تکالیف کی کوئی انتہا نہیں ! (فقط)

سپریم پکچرز کا لاجواب تاریخی شاہکار
غازی صلاح الدین
ڈائرکٹر:- حافظ جی
مکالمہ:- حکیم احمد شجاع
عیسائیوں اور مسلمانوں کی مذہبی جنگ
اداکار:-
رتن بائی
غلام محمد۔ مظہر خان۔ یعقوب۔ اسحٰق۔ للیتا دیوی۔
۔ ایشور لال۔ ڈبلیو ایم خاں۔ کلیانی۔ مرزا مشرف۔
امپیریل سینما میں

از جناب سلام مچھلی شہری

ننھی کلیاں کھلنے کیلئے اوس کا انتظار کرتی ہیں

چکوئی (CHAKOEE) سورج کی حسین کرنوں میں گیت گا رہی ہے۔

سپاہی آنے والی جنگ کا انتظار کر رہے ہیں اور ایک دوشیزہ (کنواری) بہادر پتی کے خیال میں محو ہے۔

(۲)

جب میرا بیاہ رچایا جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ انکے سہاگ کے بسنتی لباس پر بھی تلواریں چمک رہی ہیں ــــ میں یہ سوچ کر بہت خوش ہوئی کہ وہ موت اور خون سے اپنے جسم کو سجائے رہتے ہیں۔

(۳)

پیارے! تمہارے جتنے دوست ہیں میں جانتی ہوں ــــ ایک بہادر دل۔ ایک تیز تلوار ایک مضبوط مگر خوبصورت ہاتھ!!! اچھا بتاؤ لڑائی میں تم کس سے زیادہ کام لوگے؟

(۴)

ارے تم بہت بھولی ہو ــ آم کی جگہ نیم کے درخت لگا دیئے ہیں۔ نہ یقین ہو تو جاؤ دیکھ لو!

ہاں بہن! میں نے جان بوجھ کر نیم کا درخت اپنے آنگن میں لگایا ہے۔ میں روزانہ بڑے پریم سے پانی دیتی ہوں ــــ میرا شوہر ایک بہادر سپاہی ہے جب لڑائی میں وہ زخمی ہو جائے گا تو میں نیم کی پتیوں سے زخموں کو دھوؤں گی وہ اچھا ہو جائے گا اور پھر وطن پر قربان ہونے کیلئے لڑائی پر جائے گا۔

(۵)

میرے پاؤں میں مہندی نہ لگاؤ تمہیں قسم ہے آج نہ لگاؤ۔ میری پیاری نائن! سنتی ہو کل لڑائی شروع ہوگی۔ اگر میرا بہادر پتی کل لڑتے لڑتے لڑائی میں مر جائے تو [illegible] کہ میرے پاؤں میں بہت گہرے [illegible] ــــ (نوجوان) اٹھکر اپنے پتی [illegible] ہے۔

پیارے! گھوڑا دروازے پر کھڑا ہے

بہادر سپاہی آ گئے ہیں اور تمہیں پکار رہے ہیں...

یہ دیکھو! فوجی لباس۔ پہنو اور جاؤ! لو جنگ کے

باجے بھی بجنے لگے سنو کتنے اچھے گیت ہیں!

(۶)

جلدی پانی دو' انہوں نے کہا لیکن میں پانی جلدی کیسے دے سکتی ہوں۔ پانی میری سانس کے پاس ہے اور وہ اسے تمام زخمیوں میں صرف کر رہی ہوں — تلواروں سے زخمی ہو کر یہاں میرا شوہر سو رہا ہے دیکھو جسم پر بیشمار زخم دکھائی دیتے ہیں۔

رک جا اے مغنیہ! ابھی جنگ کے گیت اس دم تک سنا جبتک کہ میرا شوہر ان تازہ زخموں کے ساتھ میدان میں دوڑتا ہوا نہ جائے۔

(۷)

(بزدل سپاہی [illegible] آ کر اپنی ماں کے پاس آتا ہے)

اے بچے! میں نے مصیبتوں سے اپنی چھاتی کا دودھ پلا کر تجھے پروان چڑھایا۔ میرے دودھ کو شرمندہ کر کے تو میدان سے واپس آ گیا!

(لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا)

اے معصوم! کس خوف سے تو واپس بھاگ آیا۔ کیا لڑائی کا راستہ بھول گئے بتاؤ — تمہاری دلہن تم سے نہ بولے گی اور شرم کی وجہ سے تمہارے سامنے سے منہ پھیر لیگی۔

(فوراً ہی بیوی آ جاتی ہے اور کہتی ہے)

اے پتی یہ کیسے قصہ اچھا ہوا کہ واپس آ گئے اب میدان میں میرے کپڑے پہننے کیلئے تیار ہو جاؤ۔ میری یہ رنگین چوڑیاں تمہاری وجہ سے ٹوٹی پڑی ہیں میں اب تمہارا چہرہ شاید دوسرے جنم میں بھی نہ دیکھوں۔

(بیوی نے پیاسستی کیلئے تیار کر رکھی تھی کیونکہ وہ خوش تھی کہ اس کا پتی لڑائی میں کام آئے گا)

— باجا بجانیوالوں سے کہدو کہ اسے بند کر دیں اور گھر جائیں۔ لکڑیاں جو میرے ستی ہونیکا انتظار کر رہی تھیں کہیں اور رکھدی جائیں۔ میرا بزدل شوہر میدان سے بھاگ آیا ہے — تم سب لوگ اسے ہنستے ہوئے جھک جھک کر سلام کرو۔

(ایک سنارن آتی ہے اور رنجیدہ ہو کر کہتی ہے)

اے ٹھاکر! تمنے اپنے خاندان کی شان گم کر دی۔ اے ٹھاکر! میرے شوہر نے تمہارے لئے جنگی زیور تیار کئے تھے۔ اب وہ بیکار اور خراب ہو گئے — کاش تم مر جاتے اور پیارے وطن کو اپنا چہرہ نہ دکھاتے!

(رنگریز کی بیوی بھی افسردہ ہو کر کہتی ہے)

اے ٹھاکر! تم جھوٹے کیوں ثابت ہوئے۔ مجھے بہت امید تھی کہ میں تمہاری بیوی ستی ہونے کیلئے نئی ساری رنگوں گی — افسوس تم نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

(عطر والی آتی ہے)

ٹھاکر تمنے میری تمام امیدیں توڑ دیں۔ تمہاری بیوی نے ستی کے لباس پر لگانے کیلئے خوشبو منگائی تھی — اب اتنا قیمتی عطر کون لے گا؟!

(۸)

میرا جنگی شوہر ایک معصوم عورت کی تصویر کیطرح ہے (اس تصویر کی طرح جو بہادری سے میدان میں گر پڑتی ہے)

ستی کی لکڑیوں کی طرح وہ بہت خوشی سے لڑائیاں بھی منتخب کرتا ہے —

خالی ہاتھ وہ اپنے دشمن کا مقابلہ کرنے گیا تھا۔ اوہ! اب مجھے اس کی واپسی کی امید نہ کرنی چاہیئے!

(۹)

پیارے! مجھے اکیلا چھوڑ کر تم لڑائی پر چلدئے۔ تم مجھے اس مکان میں دولہن کی طرح لائے تھے۔ اگر تم مجھے اتنا ہی چاہتے ہو جتنا کہ اپنے وطن کو تو مجھے بھی اپنے ساتھ جنگ میں لڑنے دو!۔

(۱۰)

میرا شوہر لڑائی میں اپنی کمان لئے کھڑا رہتا ہے۔ دیکھو دشمن کے سپاہیوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے ایسے خطرے کے وقت وہ بھی کس شان سے مسکرا رہا ہے!

(۱۱)

اے ہتھیار بنانے والے! مہربانی کر کے ایک ہتھیار جو میرے شوہر کے جسم پر کچھ ڈھیلا ہو بنا دے — چُست ہونے کے بجائے اسے ڈھیلا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ انکا جسم پہلے کلی کی طرح رہتا ہے لیکن لڑائی میں پھول بنجاتا ہے؛

(ترجمہ از ماڈرن ریویو)

اور ہی تھا

(۱)
وہ سماں اور ہی تھا رنگِ فضا اور ہی تھا
غنچہ غنچے سے عیاں حسن و ادا اور ہی تھا

(۲)
اب بہاروں کو کوئی کہدے نہ آئیں للہ
وہ امنگیں تھیں انوکھی وہ مزا اور ہی تھا

(۳)
نہ نگاہوں کا تھا دھوکہ نہ جمالِ گلزار
کل شگوفوں میں کوئی جلوہ نما اور ہی تھا

(۴)
اب بہاریں بھی جو آتی ہیں تو سُونی سُونی
پہلے کچھ نوحۂ خزاں میں بھی مزا اور ہی تھا

(۵)
مسکراتی سی بہاریں تھیں انوکھا تھا سماں
رات دن اور ہی تھے طرزِ فضا اور ہی تھا

صفیہ شمیم ملیح آبادی

اٹھارواں شاندار ہفتہ
پربھات فلم کمپنی کا کامیاب فلم!
آدمی
اداکار: شانتا ہبلیکر، شاہو موڈک
چھوٹو۔ بوا صاحب۔ رام مراٹھے۔ گوری بالی سندرابائی
ایک شریف زادے اور ایک رقاصہ کی محبت کی دلگداز کہانی جو روزانہ صدہا شائقینوں کی تفریح کا مرکز بنا ہوا ہے۔ جادو اثر نغمے۔ شستہ مذاق۔ سبق آموز افسانہ
زبردست مکالمے
سنٹرل ٹاکیز
گرگام
ڈائرکٹر: شانتارام
میوزک: کرشنا راؤ
प्रभात चित्र
IT'S PRABHAT

ممباسہ میں خواتینِ ہند کی اصلاحی سرگرمیاں

ہماری معزز بہن مسز فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ جو دو سال قبل ممباسہ (افریقہ) تشریف لے گئی تھیں۔ اب بخیر و عافیت اپنے وطن ہندوستان میں واپس تشریف لے آئی ہیں۔ افریقہ میں آپکی کوششوں سے خواتین ہند میں جو بیداری پیدا ہوئی ہے اس کا اندازہ اس ایک رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے۔

یہ امر ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ عورتوں کو آپس میں ملنے جلنے اور انسانی ترقی اور بہبودی کے راستہ میں نہ تو مذہب رکاوٹ ڈال سکتا ہے اور نہ سیاست۔ وہ اگر چاہیں اور اپنے فرض کا احساس کریں تو دنیا کا کایا پلٹ سکتی ہیں۔ اور دنیا کے انسانوں کی باہمی نفرت اور بیگانگی کو محبت اور انسانی یگانگت میں تبدیل کر سکتی ہیں۔

(ادارہ)

دی انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کی پہلی سالانہ رپورٹ

جناب صدر صاحبہ اور بہنو!

انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کی پہلی سالانہ رپورٹ آپ بہنوں کی خدمت پیش کرنے کا مجھے فخر حاصل ہوتا ہے یہ کارروائی ۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء سے لیکر ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء تک کی ہے۔

ایسٹ افریقہ کی ہندی بستی کی تاریخ میں یہ پہلا ہی موقعہ ہے کہ ہندی قوم کی زندگی کی ضروری حاجتوں کو پورا کرنے کیلئے اس طرح کی ایک انجمن قائم کی گئی ہو۔ مردوں کی جماعتیں تو بہت ہیں۔ لیکن ہماری بہنوں کو آج تک کبھی یہ خیال نہ ہوا۔ کہ اپنی سماجی اور دماغی اور تہذیبی ترقی کی خاطر کوئی انجمن قائم کریں۔ دنیا میں جتنی تحریکیں ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی ایک ہستی یا رہنما کی کوششوں کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔ اسی طرح ہماری انجمن کی بنا بھی ایک نہایت مخلص اور حوصلہ والی ہستی کے ہاتھوں قائم کی گئی۔ میرا اشارہ ایسٹ افریقہ میں انڈین گورنمنٹ کی طرف سے آئے ہوئے ٹریڈ کمشنر صاحبہ کی اہلیہ محترمہ مسز فاطمہ اسمٰعیل کی طرف ہے۔ مدت سے ہم ہندی عورتوں کو ایسی ہی بے دھڑک رہنما کی ضرورت تھی۔ اور وہ ان کے یہاں آنے سے خدا نے پوری کی انکا اس ملک میں آنا ہم ہندیوں کیلئے بے حد زیادہ فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔ یہ انہی کی ہمت اور قومی

خدمت کے ولولے کا طفیل تھا کہ ہندوستان کے ہر طبقے
اور ہر فرقے میں سے مذہب اور ذات پات کی تمیز کے بغیر
بہت بہنیں ان کے جھنڈے تلے آ کھڑی ہوئیں۔ اور ایک
زبردست تحریک کی بنیاد پڑی۔

اس انجمن کا سنگ بنیاد بتاریخ ۱۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۸ء کو
رکھا گیا۔ وہ اس طرح کہ مسز اسمٰعیل نے اپنے مکان پر بہنوں کا
ایک عام جلسہ بلوایا۔ اور ایک انجمن کو قائم کرنیکا خیال ظاہر
کیا۔ ان کی حوصلہ بڑھانے والی تجویز کو سب نے پسند کیا۔ اور
وہیں کے وہیں ساٹھ بہنوں نے ممبری کیلئے نام لکھوائے
اس کے بعد ممبروں کا ایک عام جلسہ بتاریخ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۸ء
کو ہوا۔ جس میں عہدیداروں اور انتظامیہ کمیٹی کے ممبروں کا
چناؤ ہوا۔ اور آگے کے عمل کے قانون بنائے گئے۔

اس انجمن کے اغراض و مقاصد جیسا کہ چھپے ہوئے
قانون میں بتائے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ایسٹ افریقہ میں بسی ہوئی ہندی قوم کی عورتوں کو
ایک دوسرے کی امداد کیلئے اور دوسروں کی خدمت کیلئے
اکٹھا کرنا۔ اور مشرقی افریقہ کی ہندی عورتوں کے فائدے اور
ترقی کی جس طرح ہو سکے کوشش کرنا اور شہریت کی ذمہ داری
کے لئے عورتوں کو سدھانا۔

(۲) ہندی مردوں اور عورتوں کی ہر منزل کی تعلیم کی ترقی
کرنا اور عورتوں اور بچوں کی بہتری کے جو جو ضروری سوالات
ہوں انکو حل کرنا۔

(۳) موجودہ سماجی خرابیوں کو دور کرنا۔ دھرم مذہبوں میں
اتفاق بڑھانا۔

اس ملک میں اور بھی جماعتیں قائم ہوئی ہیں۔ مگر انکی
زندگی چھوٹی رہی۔ کیونکہ یا تو انکا مقصد فقط ملنا جلنا یا
حد سے زیادہ متین یا گمبھیر تھا۔ ہماری انجمن ان سے بالکل
نرالی ہے کیونکہ ہمارے ہاں آپس کا میل جول بھی ہے اور
ساتھ ساتھ سماجی اور تہذیبی درستی کی کوشش بھی ہے۔
یعنی کہ ہمارا مقصد زندگی کے متین اور مذاقی پہلوؤں کو
شیر و شکر کی طرح ملانا ہے۔

ہماری جماعت کی کارروائیوں کے پانچ پہلو ہیں۔

(الف) آپس کا میل جول یا تفریح

(ب) تعلیم

(پ) تہذیب

(ت) سماجی اصلاح

(ٹ) عام لوگوں کی برتری اور بہبودی

ہماری زندگی کے پہلے سال میں ہم اوپر کی تین
شاخوں میں سرگرمی سے کام کر سکی ہیں اور باقی دو شاخوں
میں ابھی ابتدائی کوشش کی گئی ہے۔

تفریح کی بابت میں ہمنے کئی جلسے کئے اپنے قانون کے
مطابق ہمنے سنہ ۱۹۳۹ء مارچ، جون اور ستمبر کے مہینے میں
کل تین "ایٹ ہوم" کے جلسے کئے۔ تیسرے جلسے میں ہمنے
کنیا کے گورنر صاحب کی بیگم صاحبہ لیڈی بروک پوپہم کو
دعوت دی تھی۔ اور انہوں نے نہایت مہربانی سے ہماری
دعوت قبول فرمائی تھی ان کی سہولت کی خاطر جلسہ اوائل اگست کو
رکھا گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے جنگ کے اعلان نے ہماری تجویز کو
بگاڑ دیا۔ اور ایٹ ہوم کو موقوف کرنا پڑا۔ اکتوبر میں ہمنے
لیڈی رام راؤ جو ساؤتھ افریقہ کے ہندی ایجنٹ جنرل کی
پتنی ہیں اور ممباسہ ہوتی ہوئی ہندوستان تشریف لیجا رہی تھیں

ان کی شان میں ایک خاص ایٹ ہوم رچایا۔ ایسٹ افریقہ میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ ہندی عورتوں نے اکٹھی کوشش کر کے اپنی ایک مہمان بہن کا استقبال کیا۔ لیڈی رام راؤ نے ہماری بہنوں کے لئے ایک نہایت ہی دلچسپ اور فائدہ مند تقریر فرمائی۔ جس کا مضمون یہ تھا۔ قومی ترقی کے میدان میں عورتوں کے فرض اور شہری زندگی میں انکا درجہ انہوں نے عورتوں کی سنگٹھن اور نظام پر بہت زور دیا۔ اور یہ بتایا کہ اس سنگٹھن کے ذریعے عورتیں قوم اور ملک کی نئی زندگی میں کیسا کار نمایاں کر سکتی ہیں۔ ہمارے سہ ماہی ایٹ ہوم اپنے گانوں اور گربوں کی وجہ سے نہایت ہی دلکش ثابت ہوئے کیونکہ ان کے ذریعے ہماری بہنوں نے آپس میں ملنے جلنے اور محبت بڑھانے کے علاوہ معصوم تفریح انسانی حیات میں زندہ دلی، ہنسی مذاق، اور نرودش تفریح کتنی ضروری ہے۔ یہ بھی اچھی طرح سیکھ لیا۔ سماجی اور رواجی زنجیروں نے عورتوں کی آزادی میں جو رکاوٹیں پیش کی ہیں ان کی سختی ہمارے جلسوں نے ایک حد تک ہٹا دی ہے۔ جس کسی کا جی چاہے وہ ایک شلنگ دیکر مہمان بھی ساتھ لا سکتی تھیں اس طریقہ سے نہ صرف ہماری آمدنی بڑھی بلکہ ہمکو نئے ممبر بھی حاصل ہوئے۔

تعلیم کے سلسلے میں ہماری کارگذاری تاریخ ۱۲ جون کو گورنمنٹ انڈین گرلز اسکول کے مکان میں ہندی بہنوں میں تعلیم کے چرچے کیخاطر ایک عام مجمع بلوایا گیا۔ جس میں تین سو بہنیں شریک تھیں۔ ممباسہ میں عورتوں کے کسی جلسہ میں اس سے پہلے یہ حاضری کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اس جلسہ میں نو تقریریں ہوئیں۔ سات تو ہمارے ممبروں نے کیں اور دو تحریریں لکھی ہوئی سیٹھ نانجی دادا لیداس اور سیٹھ پریم چند راجپال کی طرف سے آئی تھیں۔ جو جلسے میں پڑھی گئیں۔ بچوں اور جوانوں کی تعلیم کی پرزور تائید کرنے کے سوائے یہ بھی کوشش کی گئی کہ ہماری ادھیڑ عمر کی بہنیں جنکو قسمت اور زمانے نے بچپن میں تعلیم حاصل کرنیکا موقعہ نہیں دیا تھا انہیں سمجھایا جائے کہ وقت گذر نہیں گیا۔ اب بھی موقعہ ہے۔ اور انکو ترغیب دلائی گئی کہ زندگی کی رفتار اور اپنے چھوٹے بچوں کی خاطر وہ ضرور تعلیم حاصل کرنیکی کوشش کریں۔ وہیں اعلان کر دیا گیا کہ گجراتی اور انگریزی دونوں زبانوں میں بڑی بہنوں کو تعلیم دینے کیلئے مکتب کھولے جائینگے۔ القصہ ۳ جولائی ۱۹۳۹ء کے دن سماج بھون کے مکان میں انگریزی اور گجراتی کی جماعتیں کھول دی گئیں۔ جہاں دوپہر کے ساڑھے تین بجے سے لیکر پانچ بجے تک ہفتے میں تین دفعہ سبق پڑھایا جاتا ہے۔ نام کیخاطر ہر ایک سے ایک شلنگ ماہوار فیس لیجاتی ہے۔ شروع کرنیکو ایک ہی ہفتہ ہوا تھا کہ پڑھنے والیوں کی تعداد ۴۹ تک پہنچ گئی۔ اگست کے مہینے میں بڑھ کر ۶۹ ہوئی۔ مگر ستمبر کے مہینے میں لڑائی کے چھڑ جانے سے بہت سی بہنیں یا تو ہندوستان یا ممباسے سے دور چلی گئیں۔ اس وجہ سے تعداد گھٹ گئی اور ۲۹ تک آکر رہ گئی۔ ہمیں بہت لوگوں نے کہا کہ لڑائی کی وجہ سے جماعتوں کو بند کر دیا جائے۔ مگر ہمنے ڈرپوک بننے سے انکار کر دیا۔ اکتوبر میں اگرچہ ہندو اور مسلمان دونوں بہنوں کے رمضان شریف اور تہوار دن ساتھ آگئے پھر بھی ہماری تعداد ۳۱ سے نیچے نہیں گئی۔ اور موجودہ نومبر کے مہینے میں پھر بڑھکر ۴۵ تک پہنچ گئی ہے۔ یہ جماعتیں نہایت ہی کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور ان سے ہماری ہمتیں امید سے

زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ان جماعتوں کا انتظام ایک علیحدہ سب کمیٹی کے سپرد ہے۔ اور وہ انکو نہایت ہی اعلیٰ باقاعدہ اور سنئے طریقہ پر چلاتی ہیں۔ کئی اچھے سے اچھے اسکول کے موافق ہمارے ہاں بھی داخلہ کے فارم اور شاگردوں کے رجسٹر اور رول بُک بھی رکھے جاتے ہیں۔ ہماری استانیاں بغیر تنخواہ کے صرف شرف کی خاطر کام کر رہی ہیں اور قریب قریب سب ہی سند یافتہ اور پختہ کار ہیں۔ ان اعلیٰ کام کرنے والیوں نے جو اس تہا، محنت اور خلوص دل کی خدمت اپنی بہنوں اور قوم کی خاطر کی ہے۔ اس کی جتنی تعریف کیجائے کم ہے۔ دن بھر سخت کام کرنے کے باوجود قوم کیخدمت کی خاطر اپنی فرصت کا پورا پورا وقت صرف کرنا یہ کوئی چھوٹی قربانی نہیں ہے!

ہماری انجمن کا اثر عام پبلک تک پہنچانے کیخاطر اور ہمارے ممبروں میں دماغی بیداری پیدا کرنے کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر اگست کے مہینے سے خاص عورتوں کی دلچسپی کے مضمونوں پر ماہواری تقریروں کا انتظام کیا گیا اس سلسلے میں ابتک تین دفعہ تقریریں ہو چکی ہیں جنہیں ہر موقعہ پر ہمارے دو ممبروں نے تقریریں کیں۔ جن مضامین پر بحث ہوئی ان میں سے چند یہ ہیں:۔

(۱) صفائی

(۲) بچوں کی تربیت

(۳) عورتوں کے فرائض

(۴) قوم میں عورت کا درجہ

(۵) عورتوں کی تعلیم

(۶) سماجی رکاوٹیں

مضمونوں کے بیان سے جو پرچار ہُوا وہ تو ہُوا ہی، ساتھ ساتھ ہماری بہنوں کو عام جلسوں میں بے دھڑک تقریریں کرنے کی عادت ہو گئی۔ جو کوئی چھوٹی بات نہیں

تہذیبی اور دماغی ترقی کیخاطر ایک جماعت بھی مئی کے مہینے میں ایک خاص سب کمیٹی کے ماتحت قائم کی گئی اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ دماغی اور ادبی شوق رکھنے والی ہماری بہنوں کو آپس میں ملایا جائے۔ اور انکو موقع دیا جائے کہ وہ ایک دوسرے کی اصلاح اور ترقی کی موجب بنیں اور انسان اُنکیں میل جول اور محبت بڑھے۔ اس کمیٹی کے جلسے ممبروں کے گھروں میں ہر پندرھویں دن ہوتے رہے۔ اور وہاں جو بحث مباحثے ہوتے رہے اس سے امید ہوتی ہے کہ یہ بہت جلد ترقی کر جائیگی اور ہمارا تجربہ مفید ثابت ہوگا۔

ہماری انجمن کے آرڈر کے مطابق انتظامیہ کمیٹی نے ہندوستان سے آئے ہوئے گجرات کے اندھے کوی ہنسراج کی خاطر ہندی دوہے اور چھند کبت وغیرہ دیہاتی شاعری جو کتابوں میں مشکل سے ملتی ہے انکا ایک باقاعدہ جلسہ قائم کیا۔ خرچ نکالنے کے بعد دو سو شلنگ کی جو رقم بچی وہ ہماری انجمن کی طرف سے کوی جی کو نذر کر دی گئی۔

ستمبر میں جب ممباسہ میں جنگ کی ہلچل مچی ہوئی تھی اور بچاؤ اور امداد کی کوششیں ہر طرف ہو رہی تھیں اس وقت ہماری انجمن بھی پیچھے نہ رہی۔ ایک گشتی چٹھی تمام ممبروں کے نام جاری کی گئی۔ جس میں ضرورت کے وقت انجمن کی طرف سے ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا گیا۔ اس کے سوا انجمن کی طرف سے ایک والنٹیر کور بنانے کا خیال بھی ظاہر

کیا گیا۔ اور اس میں شامل ہونے کی ممبروں کو دعوت دی گئی حیرت کی بات ہے کہ پوری پچاس بہنیں اس خدمت کیلئے تیار ہوگئیں۔ خوش قسمتی سے اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت نہیں آئی۔ لیکن ہماری گشتی چٹھی کا فائدہ یہ ہوا کہ ممبروں کے دلوں میں شہری احساس اور اپنی ذمہ داری کا خیال پیدا ہوگیا۔

دوسری سب کمیٹیاں یعنی اسکول کمیٹی اور صحت کمیٹی بھی قائم کی گئی ہیں۔ جنکا مقصد اسکولوں کی موجودہ حالتوں کو دیکھنا اور شہر کے غریب حصوں میں گھوم کر واقفیت حاصل کرنا ہے۔ تاکہ جہاں ضرورت ہو وہاں درستی کی تجویز پیش کی جاسکے۔ چند اسکولوں کا اور شہر کے مختلف حصوں کا معائنہ کیا گیا۔ اور ممبروں نے اپنی اپنی رائیں۔ پورٹیں قلمبند کردیں۔ یہ یاد رہے کہ کوئی انجمن بھی جبتک حالات سے پوری پوری واقفکار نہ ہوجائے اور اس کے پاس کافی اطلاع اور واقفیت موجود نہ ہو اور پبلک کا اس پر اعتبار نہ ہو تب تک وہ درستی کیلئے قدم اٹھا نہیں سکتی۔

اس بات کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی ہے کہ ہماری تمام سب کمیٹیوں کا انتظام خاص قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ جو قانون ہر ایک کمیٹی نے خود بنا لیا ہے اور اس کے بعد انتظامیہ کمیٹی سے پاس کرا لیا ہے۔ یہ کمیٹیاں اپنا اپنا کام باقاعدہ کرتی ہیں اور ان کی ساری کارروائی قلمبند رہتی ہے۔

اوپر کی کوششوں کے علاوہ انجمن کی عام کارروائی کی خاطر انتظامیہ کمیٹی پندرہ بار مل چکی ہے۔ اور اس رپورٹ کی مدت کے دوران میں ممبروں کی تین جنرل میٹنگیں بھی ہوچکی ہیں۔ ایک تو عہدیداروں اور انتظامیہ کمیٹی کے چناؤ کیلئے دوسری قانون پاس کرنے کیلئے اور تیسری سب کمیٹیاں مقرر کرنے کیلئے جن کی تاریخیں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۸ء یکم جنوری ۱۹۳۹ء اور ۱۷ اپریل ۱۹۳۹ء تھیں۔

ہماری انجمن نے جو ترقی کی ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ آج سے چودہ مہینے پہلے جبکہ یہ انجمن بنی تھی اس وقت صرف ساٹھ ممبر تھے۔ اس دن سے آجتک لگاتار تعداد بڑھتی رہی۔ یہانتک کہ مجھے کہنے کی خوشی ہے کہ وہ ۱۲۵ تک پہنچ گئی۔ لیکن لڑائی کے شروع ہونے سے اور کئی لوگوں کے ملک کو چھوڑ جانے کی وجہ سے ہماری ممبری چار و ناچار کم ہوگئی اور آج ۱۰۵ ہے۔ پھر بھی پورے آثار نظر آرہے ہیں کہ جوں جوں پبلک کو ہماری نیک نیتی اور ہماری انجمن کی فائدہ رسانی کا پتہ لگتا جائیگا توں توں نہ صرف ہماری تعداد میں ترقی ہوگی بلکہ ہماری تحریک ہر طرح مضبوط ہوتی جائے گی۔

ممباسہ کی ہماری کارروائیوں کو بیان کرنے کے بعد اب ایسٹ افریقہ کے اور مقامات میں جو جو کوششیں کی گئی ہیں انکا مفصل حال بیان کیا جاتا ہے۔ ہماری صدر محترمہ مسز اسمٰعیل کی ان تھک کوشش اور ولولہ کی وجہ سے انڈین ویمنز ایسوسی ایشن کا اثر صرف ممباسہ تک محدود نہیں رہا ہے۔ مسز اسمٰعیل نے مشرقی افریقہ کے تمام ممالک میں دورہ کیا۔ اور جتنی بھی ممکن ہوسکیں اتنی انجمنیں قائم کیں۔ انہوں نے کمپالا۔ موانزہ۔ دارالسلام اور زنجبار میں ہندی عورتوں کے نہایت شاندار جلسوں کے سامنے پُرجوش تقریریں کیں۔ ان کی دلی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کمپالا اور زنجبار میں مسز نول ہیرا اور مسز طیب علی کریم جی صاحبہ کی

صدارت کے ماتحت دو نہایت مضبوط اور کامیاب انجمنیں قائم ہوگئیں۔ موانزہ میں بھی ایک مجلس قائم ہوئی۔ مگر چونکہ ان کی طرف سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اسلئے اندیشہ ہے کہ اسنے آجتک جڑ نہیں پکڑی۔ کمپالا اور زنجبار کی سرگرمیوں کی جو رپورٹیں ہمیں مل رہی ہیں۔ وہ نہایت تسلی بخش اور امید دلانے والی ہیں۔ ان انجمنوں کے قائم ہونے سے کمپالا زنجبار اور ممباسہ کی ہندی عورتوں کے درمیان ہمدردی محبت اور دوستی کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک ہی انجمن کے ممبران کی حیثیت سے وہ ایک دوسرے سے اور نزدیک ہوگئی ہیں۔ اب تو یہ رسمی بات ہے کہ کمپالا اور زنجبار کی ممبر جب ممباسہ میں ہوں تو ہماری مہمان یا اعزازی ممبر کے طور پر ہمارے سب کاموں اور جلسوں میں شریک ہوسکتی ہیں۔ ختم کرنے سے پہلے ایک بات باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ ہماری انجمن کی روح رواں یعنی ممتاز صدر محترمہ مسز اسمٰعیل صاحبہ نے جو بیش بہا خدمات کیں ہیں انکے لئے تہ دل سے شکریہ ادا کیا جائے۔ اس کے بعد مجھے اپنی پیشرو مسز نائک صاحبہ کا ذکر خیر کرنا چاہیئے۔ جنہوں نے انجمن کی ابتدا سے لیکر آج سے ایک مہینے پہلے تک آنریری سکرٹری کا کام نہایت خوبی سے انجام دیا۔ وہ نہ صرف تن دہی اور شوق سے کام کرتی رہیں بلکہ اپنی فرصت کا سارا وقت انجمن کی خدمت میں کھپا دیتی تھیں انکا برتاؤ اور مزاج ایسا تھا کہ ہر کوئی انکو چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انہیں ایک قابل کارکن اور ذاتی دوست کے طور پر ہمیشہ یاد کرتی رہیں گی نہ ہماری انجمن کو مختلف ہستیوں اور جماعتوں کی طرف سے وقتاً فوقتاً اخلاقی اور مالی امداد ملتی رہی ہے۔ ان کی مہربانی سلوک اور عنایت کا اگر میں بیان نہ کروں تو میں اپنے فرض میں کوتاہی کرونگی پہلے تو ہمیں جناب کیپٹن وہائٹ صاحب کوسٹ انسپکٹر آف سکولز اور گورنمنٹ انڈین اسکول کی پرنسپل مسز میکے صاحبہ کا شکرگزار ہونا چاہیئے جنہوں نے ہمارے تمام جلسوں اور میٹنگوں کیلئے اسکول کا مکان استعمال کرنیکی اجازت دیدی) انکا سلوک اور ہمدردی ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ثابت ہوا۔ اسی طرح ہم سماج سیوا یعنی سوشل سروس لیگ کی مینجنگ کمیٹی کے بھی مشکور ہیں جنہوں نے خود اپنی طرف سے نہایت مہربانی کے ساتھ استعمال کیلئے اپنا مکان عنایت کیا۔ اگر یہ انکی مہربانی نہ ہوتی تو ہماری تعلیمی جماعتوں کا شروع کرنا بہت مشکل ہوجاتا اور یہی ہماری انجمن کی سب سے زیادہ مفید اور کامیاب شاخ ہے مسٹر قاسم علی پارو نے بھی ہماری پر بڑا ہی احسان کیا ہے انہوں نے ہمارے کاموں کیلئے اپنے دفتر کے کارکن کاغذ قلم اور مشینیں تک وقف کر دیں۔ میسرز جی اے داتو اینڈ کمپنی نے بھی ہم پر بڑی مہربانی کی کہ ہماری تمام ضیافتوں اور پارٹیوں کے لئے بلا کسی اجرت کے تمام فرنیچر اور چینی کا سامان دیتے رہے جسکی وجہ سے ہمکو ہماری تحریک میں بہت تقویت ملی اور ہم ان کی دلی شکریئے کے ساتھ قدر کرتی ہیں۔ اسی قسم کی مہربانی انڈین ایسوسیشن بھی کرتی رہی۔ ہم انکے بھی شکرگزار ہیں۔ میسرز ٹھاکر اینڈ پار لمیٹڈ بھی ہمکو چینی کا اسباب کم کرائے سے عنایت کرتے رہے جسکے لئے شکریہ کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ہم میسرز پانڈیا اینڈ مہر علی کے ازحد مشکور ہیں کہ

انہوں نے اس قدر جلد اور بغیر کسی منافع کے ہماری اس رپورٹ کی چھپائی کا کام اس قدر خوبی سے انجام دیا۔ ہم جناب پی۔ ڈی ماسٹر صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے بغیر کسی اجرت کے ہمارے آمدنی اور خرچ کے حسابات تیار کئے۔ ہمیں مسٹر محمد عمر عباسی صاحب کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ جنہوں نے ہمیشہ بلاپس وپیش اپنا قیمتی وقت صرف کر کے ہماری تمام کارروائیوں کا اور اس رپورٹ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

آخری گو بہت ضروری پریس رہ گیا۔ کنیا ڈیلی میل اور ممباسہ ٹائمز اور ایسٹ افریقہ کے دیگر اخبار ہمارے اشتہارات رپورٹیں اور کارگزاریاں بلاپس وپیش چھاپتے رہے۔ ان کی یہ مہربانی ہمارے لئے نہایت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی۔ مسٹر آر بی پانڈیا صاحب کا تو خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ہماری انجمن کی بہبودی اور ترقی میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتے رہے۔

سکرٹری

مسز شاہ

محترمہ مسز فاطمہ ہاشم اسمٰعیل صاحبہ کی الوداعی تقریر

پیاری ممبرو اور دوستو!

آج کا دن میرے لئے بہت خوشی اور اطمینان کا ہے اور مجھے یقین ہے کہ میری اس خوشی میں ہماری انجمن کی ایک ایک ممبر شریک ہے۔ جب یہ انجمن قائم کی گئی اس وقت اس کی حیات اور ترقی کے بارے میں لوگوں کو بہت ہی شک تھا اور اتنا بھی یقین نہیں آتا تھا کہ یہ انجمن مفید ثابت ہوگی۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ہم نے لوگوں کو دکھا دیا کہ باوجود مشکلوں اور مخالفتوں کے ہمارے سچے دل کی خواہشوں اور لگاتار کوششوں کی وجہ سے ہم پوری طرح سے کامیاب ہو سکے۔

ہماری سالانہ رپورٹ میں جو آپ کو آنریری سکرٹری صاحبہ نے ابھی پڑھ کر سنائی ہے۔ پچھلے ۱۴ مہینوں کی ہماری کارروائی کا ذکر ہے۔ ایسے ۱۴ مہینے جو کامیاب کوششوں اور فتحمند نتیجوں سے پُر ہیں۔ اب جو ہمنے اعتراض کی زبان بند کر دی ہے۔ ہم مستقبل یعنی آنے والے زمانے میں امید اور بھروسہ سے قدم اٹھا سکتے ہیں۔ سالانہ رپورٹ میں ہماری کارگزاریوں کا ذکر ہو چکا ہے۔ ان سے اگر کچھ لوگوں کا جی نہیں بھرا تو انہیں یہ بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہمنے بالکل نئی زمین میں کھیتی شروع کی ہے۔ ہمارے کام کی قیمت کا صحیح اندازہ ظاہرا کارگزاریوں سے نہیں ہو سکتا بلکہ ان کی اندرونی بیداری اور احساس پیدا کرنے کی قوت سے ہو سکتا ہے۔ ہماری ہندی بہنوں کو گہری نیند سے جگانا اور ان کی رسم و رواج کی پرانی بیڑیاں توڑنا کوئی معمولی اور ادنا کام نہیں۔ اس انجمن کا انتہائی مقصد صرف یہی نہیں کہ عورتوں میں اپنی شخصیت کا احساس پیدا کرے اور ہندوستانی عورتوں کو یہ سمجھائے کہ وہ ایک ہی مادر وطن کی بیٹیاں ہیں بلکہ آہستہ آہستہ سماج مذہب اور فرقہ کی حدبندیوں کو توڑ کر اپنی خدمتوں سے قوم میں نئی جان ڈال دینے کا جوش دلایا جائے۔

جب ستمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں ہمنے ممباسہ کی ہندی عورتوں کو

دعوت دی کہ وہ اس انجمن کی بنیاد ڈالکر ایک ایسا باغ لگائیں
جہاں ہندی تہذیب۔ تمدن اور تمناؤں کے پودے
پرورش پاکر سرسبز رہیں تو باوجود اس ونت کی بگڑی
ہوئی فضا کے ہماری بہنوں نے بڑے تپاک سے میرا ساتھ
دیکر یہ ثابت کردیا کہ وہ آپس کی خانہ جنگیوں سے اور مذہب
اور فرقوں کے جھگڑوں سے آزاد ہیں۔ ہماری سکرٹری
صاحبہ نے اپنی سالانہ رپورٹ میں میری کوششوں کی بہت
تعریف کی ہے۔ مگر میری بہنوں سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپکا
شکرگزار ہونا چاہیئے کہ آپ۔ لوگوں نے دل وجان سے میرا
ساتھ دیا۔ اور ہمیشہ میرا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ میں آپکی خاص
شکرگذار ہوں کہ آپنے اس ملک کے مردوں پر یہ ثابت
کردیا کہ ایسٹ افریقہ کی ہندی عورتیں اپنی ہندوستان کی
بہنوں کے قدم بہ قدم چل سکتی ہیں اور بغیر کسی جھگڑے
اور فساد کے آپس میں مل جلکر کام کرسکتی ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ اس انجمن کی مخالفت صرف
مردوں کی طرف سے نہیں ہوئی بلکہ بہت سی ہماری بہنیں
بھی مخالفت میں شامل تھیں وہ پسند نہ کرتی تھیں کہ عورتیں
اپنے گھر کی چار دیواری، کے باہر کسی معاملہ میں دلچسپی لینے
لگیں۔ یہانتک کہ انکو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بڑی تعداد میں
جمع ہوکر چائے پئیں اور آپس میں دو گھڑی مل بیٹھیں۔
لیکن چند ہی مہینوں میں ہمارے "ایٹ ہومز" نے اس
بات کا عملی ثبوت دیدیا کہ اس قسم کے جلسوں سے ہماری
ہندی قوموں میں آپس کی محبت اور اتحاد مضبوط ہوتے
ہیں اور انسانی ہمدردی کے چشمے بہنے لگتے ہیں۔ دوستی کا
دائرہ بڑھتا ہے اور دماغ کھلنے لگتے ہیں وہی "ایٹ ہومز"
جنکی ایک وقت سختی سے مخالفت کیجاتی تھی آج ممبروں کو
حد درجہ دلچسپ اور دلکش معلوم ہوتے ہیں تعلیمی
جماعتوں نے یہ راز کھولدیا کہ رفاہ عام کا جذبہ اور حوصلہ
رکھنے والی عورتیں کی کمی نہیں ہے۔ جو فرہا نیاں کرنے
کیلئے تیار ہیں اور اپنے سے کم خوش نصیب بہنوں اور
قوم کی خدمت میں اپنی طاقت اور فرصت خرچ کرنے
کیلئے کمربستہ ہیں۔ ہماری دوسری سب کمیٹیوں نے جو
کام کیا ہے اس سے ہمارے اور ممبروں کو جنکو ان سے
تعلق رہا آنکھیں کھل گئیں کہ ہمارے غریب بھائی بہن کیسی
دردناک حالت میں رہتے سہتے ہیں اور علاوہ اس کے
وہ بچوں کی تعلیمی ضرورتوں پر بھی سوچ بچار کرنے لگی ہیں
ہماری ادبی کمیٹی اور ماہواری تقریروں نے نئے نئے
موقعے پیدا کرکے دماغی ترقی کو ابھارنے اور عام جلسوں
میں بولنے کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ مینجنگ کمیٹی کا مقصد ہمیشہ
یہی رہا ہے کہ ہماری ممبروں کی خداداد لیکن پوشیدہ قابلیتوں کو
باہر لایا جائے اور انکو ترقی دیجائے۔ آئندہ سال کے لئے
مینجنگ کمیٹی کے زیر نظر بہت ساری تجویزیں ہیں جن میں
فن مادری یعنی بچوں کی پرورش اور تربیت کی بے بی ویک
اور سند یافتہ لوگوں کی زبانی حاملہ اور زچہ عورتوں کی
دیکھ بھال کے متعلق تقریریں کرانا وغیرہ وغیرہ

ایک وقت تھا کہ مجھے یہ اندیشہ رہا کرتا تھا کہ
میرے جانے کے بعد یہ انجمن شاید مرجائیگی۔ لیکن آج
اگرچہ اس کی بنا کو صرف ایک ہی سال گذرا ہے پھر بھی
کافی آثار نظر آتے ہیں کہ یہ پودا مضبوطی کے ساتھ جڑ پکڑ
چکا ہے اور آئندہ زمانے میں میٹھا پھل دینے کی امید

دلاتا ہے۔ اس کامیابی کا سہرا میرے سر باندھا گیا ہے
لیکن یہ نہایت ہی نامناسب اور بے انصافی ہوگی اگر
میں اس بات پر زور نہ دوں کہ مینجنگ کمیٹی اور باقی
کمیٹیوں کے ممبروں کی باوفا اور دلی امداد کے بغیر میں
اکیلی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شروع ہی سے
مجھے قابل اور لائق سکرٹری مل گئیں۔ مسز کروسے کی
میں تہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے قانون بنانے
میں کافی مدد کی۔ آپ ان کی ہوشیاری اور لیاقت سے
اچھی طرح واقف ہیں میں تو اجنبی تھی اور مجھے انکی رہنمائی
کے بغیر اس ملک میں راہ نکالنا دشوار ہوتا۔ مسز نائک کی
طرف سے مایوسی کے وقت میں جو قوی تائید ملی اور جس
لیاقت کے ساتھ انہوں نے آنریری سکرٹری کا کام انجام
دیا۔ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہماری موجودہ
سکرٹری مسز شاہ تو خدا کی دین ہیں۔ کہتے ہیں خدا جس
چیز کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اس کے اسباب بھی پیدا
کر دیتا ہے اسی واسطے اس نے انڈین ویمنز ایسوسی ایشن
کو چلانے کیلئے مسز شاہ کو ہمارے پاس بھیجدیا۔ ہماری
تعلیمی جماعتوں کو چلانے والی استانیوں کا میں ذاتی
طور پر شکریہ ادا کرتی ہوں انہوں نے اس ہمت اور
حوصلہ سے کام کیا ہے کہ صد آفرین! مسز میکے صاحبہ
جنہوں نے ہماری تعلیمی جماعتوں کا معائنہ کرنے کی
تکلیف گوارا کی ہے اور ہماری انجمن کی بہبودی میں
ذاتی طور پر دلچسپی لیتی رہی ہیں۔ انکا شکریہ بھی ادا کرنا
ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے بعد کام کرنیوالوں
کے ساتھ بھی وہی سلوک کرتی رہیں گی جو مجھ سے کرتی
رہی ہیں۔

کمپالا اور زنجبار کی انجمنوں کی بنا اور ترقی سے ہماری
تحریک کو بڑی ہی تقویت ملی۔ میں جانتی ہوں کہ مسز نول ہیرا
اور مسز طیب علی کریم جی کے قابل ہاتھوں میں ترقی کے
زینہ پر چڑھتی رہیں گی۔ مجھے دلی رنج ہے کہ دارالسلام
اور موانزہ کی میری کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں۔ اگر
ممباسہ۔ کمپالا اور زنجبار کی تینوں انجمنیں جس طرح آج
دن تک کام کر رہی ہیں اسی طرح کامیابی کے ساتھ
کام کرتی رہیں گی تو وہ ایسٹ افریقن ویمنز کانفرنس جس کا
نقشہ میرے تصور میں ہے اور جس کا الحاق آل انڈیا ویمنز
کانفرنس سے ہوگا وہ انشاء اللہ پانچ دس سال میں بنکے
رہے گی۔

میرے ہندوستان جانے سے پہلے یہ آخری
موقعہ ہے کہ اس انجمن کی صدارت کی خوشی اور فخر مجھے حاصل
ہے۔ اگرچہ میں اس انجمن کی صدر نہ رہونگی اور اگرچہ
اس ملک سے دور رہوں گی تاہم اس انجمن کی یاد میرے
دل میں ہمیشہ رہیگی اور اس کی بہبودی دعا شب و روز
مانگتی رہونگی۔ بہبودی سے میری مراد مالی ترقی نہیں
ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہ ہوگی کہ اس انجمن کے
پاس کتنا روپیہ یا اس کی ممبری کہاں تک بڑھ گئی۔
لیکن میرے دل میں ہر دم جو خیال ہوگا وہ یہی ہوگا کہ
جن آئیڈیلز یعنی تمنا اور مرادوں سے اس انجمن کی
بنا ڈالی گئی وہ برقرار ہیں یا نہیں۔

میری دوستو اور بہنو! میں آپ سے آخری
استدعا کرتی ہوں۔ ظاہری فائدے کیخاطر اصلی یا باطنی

مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ جو کچھ کام کرنا۔ اچھی طرح سوچ سمجھکر کرنا۔ اپنی تجویزوں اور طرز عمل میں دور اندیشی سے کام لینا۔ بے صبری سے کام نہ لینا۔ جو پودا آہستہ آہستہ بڑھتا ہے۔ اسی کی جڑ مضبوط ہوتی ہے اور دائمی ثابت ہوتا ہے۔ کبھی فوری نتیجہ کی خواہش سے کام نہ کرنا۔ یہ یاد رہے ہمارا مقصد قوم میں نئی روح پھونکنا ہے۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کی خاطر آہستہ آہستہ، سنبھل سنبھل کے لیکن بغیر ڈگمگائے آگے قدم اٹھاتے جانا ؛

(فقط)

حق اللہ اور حق العباد

از جناب ڈاکٹر ادیب عثمانی

ایک مُلّا مجھ سے یوں کہنے لگا — تجھ پہ ہو قہر خدا اے نامراد

فکر دنیا سے تجھے فرصت نہیں — ذکرِ حق سے ہے تجھے شاید عناد

بے سمجھ! کچھ سوچنا بھی چاہیئے — پہلے حق اللہ یا حق العباد

ورنہ پچھتانا پڑیگا روزِ حشر — بے نمازوں کی عقوبت ہے زیاد

مینے یہ سب کچھ سُنا اور پھر کہا — ناصحِ مشفق رفیقِ خوش نہاد

ہے یہ اسکی دین تجھکو ذکر حق — مجھکو فکرِ بندگانِ خاکزاد

عین حق اللہ ورنہ ہے وہی

تو سمجھتا ہے جسے حق العباد

THE NEW THEATRES LIMITED
ہر چیز پر بہار تھی ہر شے پہ حسن تھا
دنیا جوان تھی مرے عہد شباب میں
پُرجوش افسانہ کی مناسبت سے
ممتاز ترین اسٹاروں کی شمولیت نے
اس فلم کو چار چاند لگا دیئے ہیں!
جوانی اور شباب کی لہراتی ہوئی موجیں
مایۂ ناز فلم کمپنی نیو تھیٹرز لمیٹڈ کلکتہ کا معرکۃ آلارا شاہکار
دورِ حاضرہ کا ایک بہترین افسانہ
جوانی کی رُت
ایک قدامت پسند باپ کی تہذیب جدید کے شیدائی بیٹے کیساتھ محبت کے مختلف پہلو
نفسیات کی روشنی میں دکھلائے گئے ہیں اسمیں محبت کے وہ سچے جذبات ہیں
جو انسانی قلب کو بے چین کردینگے
ڈائرکٹر:۔
مسٹر ہیم چندر
موسیقی:۔
رائے چند بورل
اداکاران:۔
کانن دیوی۔ نجم الحسن۔ جگدیش۔ کپور۔ نیمو
اور کلاوتی وغیرہ کی فطری
اداکاریاں آپکو محوِ حیرت
بنادیں گی
کرشنا سینما

تیسرا ہفتہ!
گجراتی زبان میں
انقلاب پیدا کرنیوالا موضوع ہندستان کی قومی تعمیر کیلئے ایک نیا پیغام
ڈائرکٹر:۔ چندولال شاہ
اچھوت
رنجیت فلم کمپنی کا سوشیل انقلابی فلم
اداکار:۔ گوہر۔ موتی لال۔ مظہر خاں۔ وسنتی۔ چارلی وغیرہ
چوپاٹی میں
رائل اوپیرا ہاؤس

فلمی خبریں

رنجیت فلم کمپنی رنجیت فلم کمپنی کے تازہ فلم اچھوت میں جو رائل آپیرا ہاؤس میں پیش کیا گیا ہے مشہور اداکار گوہر نے نہایت شاندار اداکاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس فلم کا افتتاح سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کیا۔ اس فلم کا تعلق اچھوتوں یعنی ہریجنوں سے ہے۔ جن کی بہتری کیلئے آجکل ہندوستان میں بہت کوشش کیجا رہی ہے۔ اس فلم کو سردار چندولال شاہ نے خود ڈائرکٹ کیا ہے اور خود ہی اس کی اسٹوری اور سینریو بھی لکھا ہے اور امید کیجاتی ہے کہ فلم ہر لحاظ سے نہایت کامیاب ثابت ہوگا۔

"جوانی کی ریت" یہ ہندوستان کی مشہور فلم کمپنی نیو تھیٹرس کا وہ مایۂ ناز فلمی شاہکار ہے جس کا شائقین فلم مدت مدید سے انتظار کر رہے ہیں۔ بالآخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں اور کلکتہ فلم ایکسچینج کے کارپردازان نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ۲۶ جنوری سے یہ فلم کرشنا ٹاکیز میں نمائش کیلئے پیش کیا جائیگا۔ اس فلم میں ہندوستان کے متعدد شہرۂ آفاق اداکاران کا نن بالا، نجم الحسن، جگدیش، کپور، نیمو اور کلاوتی وغیرہ نے اپنی فطری اداکاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں۔

"بمبے ٹاکیز کا آزاد" بمبے ٹاکیز کا تازہ فلم جو ان دنوں زیر تکمیل ہے انگریزی میں اس کا ٹائیٹل بنایا جاتا ہے جس کا ترجمہ "باغی" ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ اس نام کا ایک فلم حال ہی میں بنکر تیار ہوگیا ہے اسلئے بمبی ٹاکیز نے اردو میں اس کا نام آزاد تجویز کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ فلم دیہاتی نہیں ہے اسکے کاسٹ میں راج شکل۔ اشوک کمار، ہنسا واڈکر اور لیلا چٹنس کے نام قابل ذکر ہیں مسٹر نذیر بیدی اس میں ایک نمایاں رول ادا کر رہے ہیں۔

غازی صلاح الدین آجکل عوام کی آنکھیں غازی صلاح الدین فلم کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ سپریم پکچرز والے ابھی اس فلم کو بیحد دلچسپ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس فلم کے مکالمے خان بہادر حکیم احمد شجاع کے پرزور قلم کا نتیجہ ہیں۔ جنہوں نے پہلے کاروان حیات کے مکالمے لکھے تھے اور ڈائرکشن کے فرائض خطاجی نے انجام دئے ہیں۔ اداکاران میں رتن بائی، غلام محمد، مظہر خاں، یعقوب، اشوری لال اور مرزا مشرف وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ فلم ۹ جنوری سے امپیریل سینما میں چلے گا۔

نیشنل سٹوڈیوز لمیٹڈ ڈائرکٹر وریندر ڈیسائی نے مس روز کو ہیروئن کے طور پر لیا ہے جو ہندوستانی صنعت فلمسازی میں کافی شہرت کی مالک ہیں اس فلم کی اسٹوری میں مس روز کے علاوہ چھ عورتوں کے کیرکٹر ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا موضوع عورت کی نفسیات سے متعلق ہے فلم کا نام سنسکار رکھا گیا ہے۔

ایک دیہاتی زن و شوہر کے درمیان خوشگوار رشتہ قائم کرنے میں ایک تعلیم یافتہ اور متمدن عورت کس طرح مدد دیتی ہے۔ یہ نیشنل پکچرز کے پہلے فلم کا نفس موضوع ہے۔ سنسکار کے کاسٹ میں ہرش۔ ایڈوانی وجیدن، جیوتی، شالینی اور شنش کا نام قابل ذکر ہے۔

انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ انڈیا آرٹسٹس لمیٹڈ کے پہلے فلم کا نام "بھوانی" ہوگا اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ مسٹر کشور ساہو جو اس کمپنی کے روح رواں ہیں۔ اس فلم میں ہیرو کا پارٹ ادا کرینگے اور ہندوستانی موسیقی کے ماہر مسٹر رفیق غزنوی اس کا میوزک ڈائرکٹ کریں گے۔ اب ہمیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ڈائرکشن کا کام مسٹر مبارک کو دیا گیا ہے۔ مسٹر مبارک آجتک ایک تمثیل نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے رہے ہیں اب پہلی مرتبہ وہ خود کو ڈائرکٹر کی حیثیت سے پیش کرینگے۔ مسٹر مبارک کی اہلیتوں سے وہ لوگ اچھی طرح واقف ہیں جو انکو جانتے ہیں۔ انڈیا آرٹسٹس کا یہ پہلا فلم واڈیا مووی ٹون کے سٹوڈیو میں ۲۰ دسمبر سے شروع ہو جائیگا۔ تمام اداکاروں کا انتخاب عمل میں آچکا ہے۔

"گلیکسو" نام کا تنازعہ

دائمی فرمان نافذ کر دیا گیا

باجلاس آنریبل مسٹر جسٹس سومجی

گلیکسو لیبوریٹریز لمیٹڈ ——— مدعیان

بنام

گلیکسو کیمیکل کمپنی ——— مدعا علیہم

عدالت عالیہ بمبئی میں گرین فورڈ کی گلیکسو لیبوریٹریز لمیٹڈ کیجانب سے جو گلیکسو مصنوعات کے مشہور بنانیوالے ہیں گلیکسو کیمیکل کمپنی واقع سیالکوٹ کے نام دعویٰ دائر کیا گیا تھا جس میں مدعیان نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کئی سال سے ہندوستان میں اپنی ادویہ اور طبی مصنوعات کی درآمد کرتے اور اپنے مال کو ایچ۔ بے فوسٹر اینڈ کمپنی بمبئی کی معرفت فروخت کرتے ہیں اور یہ کہ ہمارے تقریباً سب مال پر "گلیکسو" نام نمایاں طور پر امتیازی شکل میں چھپا رہتا ہے۔ ہماری مصنوعات میں سے ایک اطفال غذا کا نام گلیکسو ہے۔ جس پر گلیکسو کا نام بہت صاف اور امتیازی شکل میں چھپا ہوا ہے۔ یہ غذا ہندوستان بھر میں مشہور و معروف ہے یہ کہ کسی مال پر گلیکسو کا نام دیکھنے سے پبلک یہی سمجھتی ہے کہ وہ مدعیان کا تیار شدہ مال ہے اور کسی کارخانہ کے نام وہ جو "گلیکسو" ہو تو پبلک کو یہی یقین ہوگا کہ اس کارخانہ سے مدعیان سے تعلق ہے۔ مدعیان اس امر کے شاکی ہیں کہ مدعا علیہم کا نام انکے نام سے ایسا مشابہ ہے کہ اس سے دھوکہ دہی کا ارتکاب ہو سکتا ہے اور یہ کہ مدعا علیہم نے اعلانات اور اشتہارات وغیرہ کے ذریعہ اپنی انجکشن کی ادویہ اور آلہ امتحان تنفس فروخت کئے ہیں ان پر وہی گلیکسو کا نام اسی امتیازی شکل میں نمایاں ہے۔ جسطرح کہ مدعیان کی مصنوعات پر چھپا ہوا ہوتا ہے پس اس قسم کی مصنوعات کو ڈاکٹری پیشہ اصحاب اسی خیال سے خرید لیتے ہیں کہ یہ مدعیان ہی کی مصنوعات ہونگی۔ مگر یہ بات نہیں ہے۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو مقدمہ کی سماعت ہوئی جسمیں مدعیان کے ڈگری ہوئی اور مدعا علیہم کو مستقل طور پر حکم دیا گیا ہے کہ وہ کبھی خود یا انکے ملازمین یا ایجنٹ "گلیکسو کیمیکل کمپنی" کے نام یا کسی ایسے نام سے تجارت نہ کریں جسمیں گلیکسو شامل ہو یا کسی ایسے نام سے جس سے پبلک کو دھوکہ ہو سکے کہ اسکا تعلق یا سلسلہ مدعیان کی تجارت سے ہے اور وہ اپنی مصنوعات کو گلیکسو کے نام یا اسکے رنگ کے مشابہت یا اس صورت سے بذریعہ اشتہارات وغیرہ یا بلاواسطہ پبلک میں فروخت نہ کریں جس سے یہ دھوکا پیدا ہو کہ یہ مدعیان کی مصنوعات ہیں۔ عدالت نے مدعا علیہم کے نام یہ حکم بھی نافذ کیا ہے کہ وہ جملہ خطوط کے کاغذ بل اعلانات چھوٹے اشتہارات لکھنے پڑھنے کا سامان اور تمام مال جس پر گلیکسو کیمیکل کمپنی کا نام یا لفظ "گلیکسو" ہو نیست و نابود کرنے کے غرض سے ۱۵ر جنوری سنہ ۱۹۴۰ء سے قبل حوالہ کر دیں۔

KANANBALA

☛ She is coming in New Theater's " Jawani Ki Reet " through Calcutta Film Exchange.

LEELA CHITNIS & SAROJ BORKAR

See them in Bombay Talkie's " Kangan " at Roxy Talkies.

نورجہاں کے زمانے میں

حسن میں اضافہ کرنے والی درسگاہیں نہ ہوتی تھیں

Godrej

لیکن عورت کو باغ عدن کے زمانے سے یہ راز معلوم تھا کہ اعلیٰ درجے کے نباتاتی روغن چہرے کی خوبصورتی کیلئے سونے پر سہاگے کا کام دیتے ہیں اور یہی نورجہاں کے حسن کا راز تھا۔ ہندوستان میں اعلیٰ قسم کے روغنیات و دیگر اجزاء جو جلد کو صاف اور نرم بناتے ہیں گوڈریج صابون میں موجود ہیں

گوڈریج سوپ ۱ و ۲

وہ صابون ہیں جو نہایت نفاست پسند طبیعتوں کو بھی مرغوب ہیں، انکے خوشگوار جھاگ جلد کو نرم اور گلاب کے پھول کی مانند بناتے ہیں اور نازک سے نازک جلد کو بھی نقصان نہیں پہنچاتے ۔

اسے آج ہی اپنے نازک بدن پر غسل کے وقت استعمال کیجئے!

دیگر اقسام:۔ گوڈریج صندل لمڈا (نیم) ٹرکش باتھ شیونگ سٹک

گارنٹی:۔ ان صابونوں کی ساخت میں پاکیزگی کا خیال رکھا گیا ہے۔ اور کسی قسم کی چربی استعمال نہیں کی گئی ہے

گوڈریج ۱ یہ صابون نہایت اہتمام سے تیار کیا گیا ہے حسن اور تندرستی کی ترقی کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے خوشبو نہایت خوشگوار ہے اور قیمت نہایت کم ہے

Godrej ALL SWADESHI PRODUCT

گوڈریج سوپس لمیٹڈ ۔ ڈی لائل روڈ بمبئے
سیلز ڈیپارٹمنٹ

Only Cover Printed at the Lakshm Art Printing Works, Sankli Street Byculla Bombay 8

تنویر
The TANVIR
MONTHLY
BOMBAY, No 8
NOVFMFER
1940.
مدیرہ :-
''سحر''
مقامی
قیمت

QUEEN FARIDA (of Egypt)

Her country is in great danger at present. We pray that God should save this country from European dacoits.

اپنے محبوب بالوں کا حُسن
قائم رکھنے کیلئے
استعمال کیجئے
ٹاٹا کوکونٹ آئیل شیمپو
ٹاٹا کی تیار کی ہوئی بالوں میں لگانے کی
دوسری چیزیں مثلاً خوشبودار کوکونٹ
ہیر آئیل، "ججے" کا مال، لائمس اینڈ
گلیسرین اور ٹاٹا بریلینٹائن تمام اچھے
دوکانداروں سے اور ہمیشہ:۔
ٹامکو سیلس ڈپارٹمنٹ سے مل سکتی ہیں۔
پی، او، بکس ۵۲۸ بمبئے
A TATA PRODUCT

ماہنامہ تنویر بمبئی

TANVIR

مدیرہ سحر

نائب مدیرہ انوری خانم

جلد ۴

شمارہ ۱۱

فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۴۷ء

سحر تاج آفریدی پرنٹر و پبلشر نے اجمل پریس بمبئی ۳ سے چھپوا کر دفتر رسالہ تنویر ... بمبئی ۸ سے شائع کیا

اِس سال **دیوالی** اور **عید** دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ آئی ہیں ؛ ہندوستان کے رہنے والے ہندو مسلمانوں کے لئے پیغام اتحاد ساتھ لائی ہیں جنہوں نے ان کے پیام اتحاد کو سنا اور سمجھا اور عمل پیرا ہونیکا عہد کیا عید اور دیوالی حقیقت میں انہیں کی ہیں ۔ وطن کی نعمتیں اور زندگی کی مسرتیں ان کے ہی لئے ہیں ۔ عید اور دیوالی کی طرف سے سچی عزت اور راحت کے تحفے انہیں کیلئے وقف ہوں گے ۔

تیوہاروں سے ہر قوم میں اک نئی زندگی اور اُپج پیدا ہوتی ہے ۔ ماضی کے کسی اہم واقعہ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور انسانوں میں اس یاد سے وہ عزم و ارادہ جوش و حرکت پیدا ہوتی ہے جو حال کی بدحالی کو آن کی آن میں ملیامیٹ کر ڈالتی ہے ۔ اور انسانوں کے ہاتھ ماضی کی گود میں پہنچکر اپنی شاندار روایتوں کو اٹھالاتے ہیں اور حال کو "خوش حال" اور مستقبل کو خوشگوار بنا دیتے ہیں ۔

دیوالی کا تیوہار ہمیں رام چندر جی کی یاد دلاتا ہے جو حق و صداقت کے لئے راون سے لڑے اور بدی پر نیکی کو فتح دلائی ۔ ۱۴ سال بن باس کاٹنے کے بعد ، راون پر فتح پانے کے بعد اپنی راجدھانی ایودھیا کو واپس پہنچے ، یہ اپنی خوبیوں کی وجہ سے اسقدر ہر دلعزیز تھے کہ ۱۴ سال سے جدائی میں بے چین پرجا کو اسقدر خوشی ہوئی کہ ان کی آمد پر چراغاں کیا گیا اور خوشیاں منائی گئیں ۔ ہندو بھائی ابتک دیوالی میں چراغاں کرکے اس اہم واقعہ کی یاد تازہ کرتے ہیں ۔ اچھا راجہ اپنی پرجا کیلئے باعث رحمت و برکت ہوتا ہے اس لئے اس تیوہار پر لکشمی پوجا بھی کی جاتی ہے ۔

> **عید مشترکی**
>
> یوں تو ابتک بہت منائی عید
> لیکن ایسی کبھی نہ آئی عید
> ہندو مسلم منائیں مل کے خوشی
> کہ دیوالی کو ساتھ لائی عید
>
> (خضر)

ہم تیوہار ضرور مناتے ہیں مگر تیوہار ہم میں وہ روح نہیں پھونکتے جسکی ہمیں اشد ضرورت ہے ۔ صرف دیئے جلا لینے ، آتشبازی چھوڑ لینے ، مٹھائیاں کھالینے یا لکشمی کی کاغذی یا سنہری روپہلی مورتی کے آگے ہاتھ جوڑ لینے سے نہیں دیوالی منائی جاتی ہے ۔ ہمیں چاہیئے کہ رام جیسا کریکٹر اپنے اندر پیدا کریں ۔ جو انسانیت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تھا ۔ جسکی زندگی ، زندگی کے ہر رخ پر روشنی ڈالتی ہے ۔ وہ صرف فرمانبردار بیٹا ، محبت کرنیوالا شوہر ، مخلص بھائی ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک بہترین راجہ تھا جس نے رعایا کی آواز کو جتنی اہمیت دی ہے اتنی اہمیت کوئی نہیں دے سکتا ۔

رہی لکشمی پوجا تو اس ملک کے باشندوں سے لکشمی جی ایسی خفا ہیں کہ جائز ضروریات کیلئے بھی انہیں میسر نہیں ۔ جب ترقی کا زمانہ تھا اسوقت کم از کم ہر انسان کو پیٹ بھر روٹی تو میسر تھی اب تو

بی۔ اے پاس نوجوان بوٹ پالش کرتے ہیں یا تنبولی بنتے ہیں۔
اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہاں تعلیم عام ہو چکی ہے۔ تعلیم کا فقدان
ہونے پر بھی یہاں تعلیم کی قدر نہیں ہے۔ جاہلوں کا تو کہنا ہی کیا وہ تو
مادر وطن کی زمین پر ایک بار بنے ہوئے ہیں۔ غرض یہ کہ ہندوستان
دولت اگلتے ہوئے بھی غریب ہے، ہندوستانی تعلیم پاکر بھی غلام
اور بدحال ہے۔ عوام کے [illegible] صرف ایک سوال ہے کہ
"کس طرح پیٹ بھرا جائے" ان کی زندگی اسی سوال کو حل کرتے
کرتے ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اور کسی شعبے تک ان کی نظر
جا ہی نہیں سکتی، ہر ملک کی بہتری اور بہبودی، عزت اور ترقی کا انحصار
اس ملک کے نوجوانوں پر ہوتا ہے مگر یہاں ایسی حالت ہے کہ بیروزگار
نوجوان مایوس ہو کر ریل کی پٹریوں پر کٹ کٹ کر جان دیدیتے ہیں۔

جن لوگوں کو خدا نے دولت دی ہے، وہ اسے صحیح مصرف میں
نہیں لاتے۔ غرضکہ یہاں کی ہر چیز خواہ علم ہو یا طاقت، دولت ہو
یا مذہب، سمجھ بوجھ ہو یا قوت عمل سب غلط جگہ پر استعمال کیجاتی ہیں اور
یہی وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کے پاس دنیا کی ہر نعمت ہوتے ہوئے
بھی وہ اس ابتر حالت میں ہیں۔ دیوالی کی خوشی ہو یا عید کی ــــ
کیا اکیدن کی ایسی خوشی کو خوشی کہا جا سکتا ہے۔ جو ہزاروں "غم بدوش"
ہو۔ خواص کا ذکر نہیں کیونکہ وہ لینے [illegible] ہیں، عوام کی حالت بالخصوص
مسلمانوں کی اقتصادی حالت اتنی بری ہے کہ بمشکل تمام زندگی بسر
کرتے ہیں۔ ان کا معیار زندگی پہلے ہی سے بہت پست ہے۔ معمولی
غذا اور پھٹے پرانے [illegible] وہ بھی کمی کے ساتھ لباس نہیں ملتا ہے۔
رہنے کو تنگ و تاریک جگہ، [illegible] تفریح کیلئے انہیں کہیں وقت نہیں
ملتا۔ ایسے انسانوں کو فراغت کا ایکدن بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔
غریب بیچارے جب عید کے دن چار پیسے زیادہ خرچ کر لیتے ہیں اور
دل خوش کرتے ہیں تو اس کے بدلے قرضخواہ ان کا خون چوستا رہتا ہے
اور روزمرہ کی زندگی گزارنے کا اطمینان بھی ان سے چھن جاتا ہے،
پس ایسی عید سچے معنوں میں عید کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔

ماہ رمضان ہر سال آکر ہم مسلمانوں کو نفس کشی، ریاضت
اور عبادت کا حکم دیتا ہے، ہم محض رواجاً ختم قرآن کر لیتے ہیں۔ مگر
خدا کا مقصد یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم طوطے کی طرح [illegible] قرآن پڑھ لیں
قرآن مقدس میں اس دنیا میں زندہ رہنے اور باعزت و شوکت زندگی
بسر کرنیکے طریقے بتلائے گئے ہیں، کیا ہم نے انہیں سمجھنے اور ان پر
عمل کرنے کی کوشش کی؟ ــــ اگر ہم اسے سمجھیں۔ اس پر عمل کریں تو
ہماری حالت ایسی بری نہیں ہو سکتی۔ ورنہ یہی مسلمان تھے جن کی
عظمت و شوکت، انصاف و برتری کا سکہ تمام دنیا پر چھایا ہوا تھا
اور اسلام دنیا کے ہر گوشے میں اپنا لیا گیا۔ آج وہی ہم ہیں وہی قرآن
مگر ایک عمل نہ ہونے سے ہماری یہ درگت بن گئی کہ رسوائے عالم ہیں۔
لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں، محض اسلئے کہ ہم خدائی احکامات سے
دور جا پڑے، اور مذہب عبادت اور ریاضت کو اپنی طرح بے معنی
سمجھ لیا اور رسماً انہیں کرتے ہیں۔

ہم ہندوؤں اور مسلمانوں کو غور کرنا چاہئیے اور اپنی حالت
سدھارنے کیلئے اپنے بزرگوں کی عملی زندگی کو رہبری کیلئے اپنے سامنے
رکھنا چاہئیے، پھر یہی ہم ہوں گے اور ہمارا وطن جنت نشان
بن جائے گا۔ اور تمام عالم کی رہنمائی کرے گا۔

عجیب مشورہ

کچھ دن ہوئے ہمارے بمبئی کے "گورے معاصر"
نے بمبئی میں بھک منگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد
اور بمبئی کے حسن کو ان کی وجہ سے ختم ہوتے ہوئے دیکھ کر حکومت
کے سامنے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ان تمام فاقہ کش، غلیظ، بے روزگار
لوگوں کو بمبئی سے باہر نکال دیا جائے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے معزز
ہمعصر نے یہ کوئی اچھا نسخہ تجویز نہیں کیا۔ اس سے تو یہ ادھیڑ بُن کا

سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کیونکہ جن کو یہاں سے نکالا گیا وہ اس بات کی گارنٹی تو کریں گے نہیں کہ وہ یہاں پھر نہ آئیں گے۔ اور پھر کسی نہ کسی شہر کی خوبصورتی اور دلکشی کو یہ طبقہ اپنی بدحالی سے ضرور خراب کرے گا۔ اس لیئے بہتر تو یہ ہے کہ گورنمنٹ بیکس اور بے روزگار ہندوستانیوں کی فاقہ مستی کو دور کرنے کیلیئے کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے یہ مرض بیخ و بنیاد سے اکھڑ جائے۔ ہم اپنے "گورے معاصر" کو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ بھیک مانگنے اور جھڑکیاں کھانے میں کسی کو مزہ نہیں آتا انسان جب پیٹ کی آگ کسی اور جائز طریقے سے نہیں بجھا سکتا تو وہ بھیک مانگنا شروع کر دیتا ہے۔ اس لیئے ہم ان مظلوموں کو صاف بری کرتے ہیں۔ اور پیٹ کی آگ یعنی بھوک لگنے کی ذمہ داری خدا پر اور بے روزگاری کی تمام ذمہ داری حکومت پر ڈالتے ہیں۔

جنگ ہندوستان کے دروازے پر

حال ہی میں ایکدن یہ خبریں آئیں کہ اطالویوں نے بحرین پر ہوائی حملہ کر کے وہاں کے تیل کے ذخیروں کو آگ لگانا چاہی یہ جگہ کراچی سے صرف ڈھائی تین سو میل ہے، جبدن سے یہ جنگ جاری ہوئی ہے ہم متواتر یہ بات نوٹ کرتے آئے ہیں کہ ہوائی حملوں میں فوجی مقامات کے علاوہ بمباری غریب شہریوں کا بہت نقصان کر رہی ہے، یورپ کی حکومتوں نے شہری آبادی کو بچانے کا کافی انتظام کیا ہے جسوقت بمبار ہوائی جہاز آتے ہیں ایک الارم ہوتا ہے جسے سنکر تمام شہری تہہ خانوں میں چھپ کر اپنی جانیں بچاتے ہیں، اس کے برعکس ہمارے ملک میں کسی شہر میں بھی ہوائی حملے سے بچنے کیلیئے حکومت کی طرف سے تہہ خانہ طیار نہیں کیا گیا۔ حکومت نے شہری آبادی کو بربادی سے بچانے کیلیئے صرف ایک الارم کا ہی بندوبست کیا ہے۔ کیا الارم سننے کے بعد گھروں کی معمولی چھتوں کے نیچے چھپ جانے سے ہم لوگ اپنی جانیں بچا سکتے ہیں؟ کیا اطالوی اور جرمن بمبار یہ سمجھکر کہ مکانوں کی چھتیں کمزور ہیں ہلکے قسم کے بم برسائیں گے؟ حکومت دن رات جو ٹیکس پبلک سے متواتر لیتی چلی آ رہی ہے، وہ کسوقت اور کس بات پر خرچ کرنا چاہتی ہے؟ ہم حکومت کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ یہ وقت رعایا کے اوپر کچھ خرچ کرنے کا بہترین وقت ہے، ہمیں امید ہے کہ حکام ہر شہر میں پبلک کو ہوائی حملوں سے بچانے کا کچھ نہ کچھ انتظام ضرور کریں گے اور اس بات کا ثبوت دینگے کہ انہیں شہریوں کی جانوں کی حفاظت کی فکر ہے اور وہ صحیح معنوں میں انڈیا کے ڈیفنس پر عمل کر رہے ہیں۔

عجیب بات

جواہر لال نہرو ہندوستان کی بڑی سی بڑی ڈیموکریٹک سیاسی جماعت کے کئی بار صدر رہ چکے ہیں اور ہندوستان کے ہر دلعزیز لیڈر ہیں۔ ہندوستان کی ڈیموکریٹک گورنمنٹ نے جو کہ ڈیموکریسی کی اس دنیا میں سب سے زیادہ علمبردار ہے آپکو گرفتار کر کے سب کو حیرت میں ڈالدیا ہے کیونکہ یہ عجیب بات ہے کہ جمہوریت پسند گورنمنٹ خود جمہوریت

[illegible]

عید ملنے والے

از شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کہوں کیا دل پہ کیا کیا ہولناک آلام سہتا ہوں
نہ پوچھ اے ہمنشیں! کیوں عید کے دن سست رہتا ہوں

وہ صدمے، جو لگے رہتے ہیں آسائش کی گھاتوں میں
وہ دنیا، سسکیاں بھرتی ہے جو تاریک راتوں میں

وہ چشمہ غم کا سینے سے زمیں کے جو اُبلتا ہے
وہ غمگیں کروٹیں، جو آسماں شب بھر بدلتا ہے

وہ جھوٹی راحتیں جن سے تپاں ہیں درد کے پہلو
وہ پھیکے قہقہے گرتے ہیں جن سے خون کے آنسو

وہ کوندے غم کے، روحوں کے افق پر جو لپکتے ہیں
وہ دل، جو سینۂ ذرات میں پیہم دھڑکتے ہیں

وہ جھونکے بزم جن میں رات بھر دم ہی نہیں لیتی
غریب انسانیت کی سست و غمناک موسیقی

وہ دل مشغول ہیں جو زندگی کے دردِ پیہم میں
وہ آنسو، جو ہیں غلطاں دیدۂ اشیائے عالم میں

صباحِ عید کے جس وقت جلوے مسکراتے ہیں
یہ سب روتے ہوئے مجھ سے گلے ملنے کو آتے ہیں

پیوست ہے جو دل میں وہ تیر کھینچتا ہوں!

از جناب خلیق تلہری

معلوم نہیں، وہ کہاں سے آئی تھی؟

جس وارڈ میں، میں مریض تھا اسکے سامنے ایک پیپل کا درخت تھا۔ ہسپتال آنے والے یکے، ٹانگے اسی درخت کے نیچے کھڑے ہوکر اپنی سواریوں کا انتظار کرتے تھے ــــ یہ بھی نہیں معلوم وہ کب آئی ــــ؟ اور کون اُسے یہاں چھوڑ گیا تھا ــــ؟... صبح کو میری آنکھ کھلی تو میں نے اسے پیپل کے درخت کے نیچے دیکھا۔ خاک دھول میں اٹی ہوئی اور بستر خاک پر لوٹتی ہوئی ایک حسین صورت ــــ اور جوان عورت، ــــ میں اسکو حسین اور جوان جو کہتا ہوں تو اسکی موجودہ حالت کو دیکھ کر نہیں کہتا، حُسن اور جوانی تو صحت اور اور تندرستی کا نام ہے اور وہ تھی بیمار ــــ دائم المریض ــــ اب تو وہ اپنے پچھلے حسن و شباب کا سایہ تھی۔ بڑی بڑی پرنم آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی جن کے اردگرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے ــــ سوکھے زرد زرد رخسار، خشک خشک ہونٹ جن پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں ــــ چوڑی پیشانی، کنپٹیوں پر بے ترتیب سیاہ میلے بالوں کے گچھے پڑے ہوئے تھے، ایک میلی سی نہایت کثیف ساڑی وہ پہنے ہوئے تھی۔

وہ نہایت کرب انگیز حالت میں تھی، مگر زبان سے آہ و کراہ کا ایک لفظ بھی نہ نکالتی، نہ وہ کسی سے مدد یا ہمدردی چاہتی اور نہ کسی کو پکارتی تھی، ــــ معلوم ہوتا تھا کہ اسکی تکالیف اس منزل پہنچ چکی ہیں جہاں سے راحت کا درجہ شروع ہوتا ہے ــــ مگر یہ تو شاعرانہ بات ہے ــــ اسکو تکلیف ضرور تھی، ایک ناقابل بیان اذیت ــــ اُس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کا اظہار ہوتا تھا، وہ لیٹے لیٹے بول و براز کرتی اور اسپر ہزارہا مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

یکے ٹانگوں پر سے بیسیوں اسکی ہمجنس زرق برق ساریاں پہنے اترتیں، اسپر نفرت و اکراہ سے ایک نظر ڈالتیں اور ناک پر رومال رکھ کر گزر جاتیں۔ بعض وقت بچے اپنے کھیل کود میں اسکا ہاتھ پاؤں کچل جاتے مگر وہ کوئی احتجاج نہ کرتی۔ کبھی یہ ہوتا کہ کوئی یکہ، ٹانگہ بالکل اسکے قریب آکر کھڑا ہو جاتا اور گھوڑا پیشاب کرتا تو وہ اسکی چھینٹوں سے تربتر ہو جاتی۔ مجھے اسپر بڑا ترس آتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔

میرے دل میں اسکی ہمدردی کے لئے ایک تڑپ تھی مگر میں خود بھی بے بس تھا، ایک مجبور مریض، تاہم اپنے

وارڈ سرونٹ کے ہاتھ کچھ پانی اور بچا کھچا کھانا بھجوا دیتا جس کو وہ بغیر کسی تشکر یہ کے کھا لیتی ۔

ایک دن میری طبیعت نسبتاً ذرا خراب تھی ، اپنی تکلیف میں کچھ ایسا کھو گیا کہ چند گھنٹوں تک اسکی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا - اچانک میری نظر پڑی تو دیکھا کہ وہ پیاس کی شدت سے بیتاب ہو کر لڑھکتی ہوئی نالی کے پاس آئی اور اس کے گندے اور متعفن پانی میں منھ لگا کر اپنی پیاس بجھالی ، اسوقت میرا دل ٹکڑے ہوجانا چاہتا تھا ، اور میں اس خود غرض دنیا پر ہزاروں لعنتیں بھیج رہا تھا - اسوقت مجھے گوتم بدھ کا یہ قول یاد آیا :-

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ برہما ایک دنیا پیدا کرے اور اسکو دکھوں اور مصیبتوں کی جگہ بنا کر چھوڑ دے ،
اگر وہ قادر مطلق ہے اور اسکو یونہی دکھی رکھتا ہے تو وہ اچھا نہیں ہے اور اگر وہ قادر مطلق
نہیں ہے تو وہ خدا نہیں ہے ۔" [لہ]

تین شبانہ روز وہ اسی حالت میں پڑی رہی - ہزاروں آدمی اسکو دیکھ کر گذر گئے ، کسی کو اسپر ذرہ برابر رحم نہ آیا اور نہ شفاخانہ کے ڈاکٹروں ہی نے اسکو جگہ دی - چوتھے روز کوئی دن کے نو بجے ہوں گے ، میں نے دیکھا کہ اسمیں کچھ حرکت نہیں ہے - میں نے وارڈ سرونٹ کو دیکھنے کیلئے بھیجا ، وہ مر چکی تھی ——— اور ہمیشہ کے لیئے ایک میٹھی نیند سو گئی ——— !

مُردہ ڈھونے والی گاڑی اسے اٹھا کر لیگئی اور اُسے دریا میں بہادیا گیا - جسوقت گاڑی میں لے جا رہے تھے ، ایک بے فکر یکّہ والا گا رہا تھا :—

دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے ورنہ کہیں تقدیر تماشا نہ بنا دے
اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو تم کو بھی محبت کہیں مجھ سا نہ بنا دے

مجھے اس عورت کی حالت پر دکھ بھی ہوا اور رشک بھی ، دکھ اسکی تکلیف پر اور رشک اس کے خوددارانہ مرگ بے ہنگام پر — غالب کو تو اسکی تمنا ہی رہی کہ ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہمزباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

یہاں تو وہ ایسی جگہ تھی جہاں سب کوئی تھے ، مگر نہ کوئی ہم سخن نہ ہمزباں ، نہ تیماردار نہ نوحہ خوان ❖

[لہ] How can it be that Brama would make a world & keep it misreable ; Since if all powerful, He leaves it so, he is not good + if not powerful He is not God.

رام

از حضرت ساغر نظامی

[**دیوالی** کا شبھ تیوہار ہمیں **رام** کی یاد دلاتا ہے۔ جس نے حق و صداقت کیلئے راون سے جنگ کی اور فتح پائی۔ ہندوستان میں رام کے عقیدتمندوں کی کمی نہیں، مگر کبھی انہوں نے یہ بھی سوچا ہے کہ رام جیسی عظیم الشان ہستی کے اوصاف کا کچھ حصہ اپنے اندر پیدا کریں۔ رام کی زندگی سے ہمیں اس بات کا سبق ملتا ہے کہ انسان اپنے فرائض کی ادائیگی میں کڑی سے کڑی مصیبت ہنس کھیل کر جھیل جاے۔ رام شجاعت اور انصاف محبت اور انسانیت کا ایک نمونہ تھے، کاش ان جیسے انسان ہندوستان میں پیدا ہونے لگیں تو ہندوستان سچے معنوں میں دیوالی منائے (مدیرہ)]

بھارت پیارا راج دلارا — کوشلیا کی آنکھ کا تارا
لمبی باہیں رنگ سلونا — مطلق کندن خالص سونا
آنکھیں تازہ پھول کنول کے — کومل کومل ہلکے ہلکے
ابرو دو شکتی کی کمانیں — کھنچ کھنچ جائیں چڑھ چڑھ جائیں
سندر سندر موہنی صورت — سرتاپا اک حسن کی مورت
سرجو جس کا گہوارہ تھی — گنگا آنکھوں کا تارا تھی

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھوں کا تارا

دھیان کی گنگا اس سے پھوٹی — گیان کی جمنا اس سے پھوٹی
سچائی کا پرچم تھا وہ — پریم کا بانکا بالم تھا وہ
روپ میں اس کے کون آیا تھا — کہہ دوں گا تو جھگڑا ہوگا

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھ کا تارا

روح شجاعت جان شباعت — آن شجاعت، شان شجاعت
سب کے دکھ پر رونے والا — دکھیوں سے خوش ہونے والا
شیو کے بان کو جیتا جس نے — جیتی سندر سیتا جس نے
وہ سیتا جو نور تھی مطلق — نور تھی مطلق حور تھی مطلق
عدل کا پیکر رحم کی دنیا — شکتی اور بھگتی کی دنیا
دوش پر اک انوار کی چادر — گھونگریالے بال مکٹ پر

دل کا تیاگی روح کا رسیا — خود راجہ اور خود ہی پرجا
سب سے الفت کرنے والا — قول کا سچا بات کا پکا
ایک امر پیغام محبت — سرتاپا الہام محبت

بھارت پیارا راج دلارا
کوشلیا کی آنکھ کا تارا

(از جناب عابد گلریز صاحب)

بلیک آوٹ کی سیاہ راتوں میں جب اپالو کا کنارہ کسی ویران قبرستان کی طرح سنسان سمندر کی پرشور موجوں کے آغوش میں چپ سادھے پڑا رہتا ہے میں ایک سکون سا محسوس کرتا ہوں۔ سکون تنہائی........ جس میں مخل ہونیوالے ساحل کے وہ چوکیدار جو پولیس کی نیلی وردی میں سائے کی طرح لرزتے پھرتے ہیں جنہیں شاید اگلے وقتوں کے لوگ اس حالت میں دیکھ لیتے تو بھوت پریت نہ جانے کیا کیا سمجھنے لگتے۔

میں بائیکلہ برج سے رات کے دس بجے ٹرام میں سوار ہوا کہ اپالو کی خاموش فضاؤں سے لطف اندوز ہو سکوں۔ ٹرام میں بہت کم لوگ موجود تھے اور ٹکٹ فروش گا رہا تھا........ اس کے پاؤں تال دے رہے تھے........ وہ گا رہا تھا:۔

بیا بن ناہیں آوت چین........

اس کی آواز میں سوز تھا۔ درد تھا............ اور موسیقی کی دلفریبی........ اس کی لَے پختہ تھی، کسی پختہ کار موسیقار کی طرح وہ اپنے مرکز سے نہ ہٹتا تھا۔ لَے اور سُر معلوم ہوتا تھا اسکے روئیں روئیں میں موجود ہیں........

میں مسرور تھا کہ آخر بھری بمبئی میں ایک ایسا شخص تو نظر آیا جو مسرور ہے۔ ٹرام کی جنبش........ گھڑگھڑاہٹ کوئی چیز بھی اسکی موسیقی میں حارج نہ تھی، وہ تھُمری پر تان اڑا رہا تھا........

وہ گاتا ہوا پوری دیوانگی سے گاتا ہوا میری طرف بڑھا.....

—— "پیا بن ناہیں آوت چین۔ ..کہاں جائیگا.....

پیا بن........ ایک آنہ۔ ..... سردی ہو رہی ہے....

ہے نا........"

میں نے اسکی مسرت پر حسد کرتے ہوئے کہا...... تم بہت مسرور معلوم ہوتے ہو........ مسرور......؟ .....

ایک عجیب انداز میں وہ بولا:— "مسرور. ....." مگر اسکے سوا کچھ ہونے سے کوئی فائدہ بھی تو نہیں۔ زندگی کا کیا بھروسہ.... دم آئے نہ آئے...... میرے مسرور ہونے کی کوئی وجہ نہیں مگر نہ جانے میں اس سے باز کیوں نہیں رہ سکتا، میں مسرور ہونے کیلئے مجبور ہوں۔

میں نے کہا:— خوب تو تم پریشانیوں کے باوجود مسرور ہو پھر تو واقعی قابل داد ہو...... تمہاری عالی ہمتی قابل تعریف ہے....

اس زبردستی کی مسرت کا آج ہی انعام بھی ملا ہے، پھر بھی میں باز نہیں رہ سکتا، آپ نہیں جانتے کہ عوام ہمارے ساتھ کس قدر سخت برتاؤ کرتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے زرخرید غلام ہیں۔ ان کے حضور ہماری لب کشائی ان کی توہین ہے۔ کل ہی دفتر نے مجھے بری طرح ڈانٹا...... ہوا یہ کہ دو تین دن گذرے ایک بزرگوار سفید ریش ٹرام میں سوار ہوئے میں حسب عادت گا رہا تھا،

میرا گانا شاید ان کے اخبار کے مطالعہ میں حارج ہوا۔ اگر وہ مجھے کہہ دیتے تو میں چپ ہو جاتا۔ مگر حضرت نے مجھے تو کچھ نہ کہا بلکہ فقر کو میرا نمبر ٹرام کا نمبر کا حوالہ دیکر ایک خط لکھ دیا جس میں لکھا تھا کہ میں نے شور بے ہنگام سے پوری ٹرام کو پریشان کر رکھا تھا حالانکہ یہ قطعی غلط ہے۔ اسوقت میں گا رہا تھا "پکار" والا گانا۔

زندگی کا ساز بھی کیا ساز ہے

بج رہا ہے اور بے آواز ہے

اور یقین جانئے کہ ٹرام کے بہت لوگ میرے ہمنوا تھے کچھ مدہم سروں میں گا رہے تھے کچھ سیٹی سے سر ملا رہے تھے اور کچھ داد و تحسین نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ تمام ٹرام پر سوائے بڑے میاں کے جن کی غلہ سی نکلی ہوئی آنکھیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں سب ہی خوش تھے اور بات تو یہ ہے کہ پہیوں کی گڑگڑاہٹ ایک تال ہے مکمل، اسپر گانا کچھ بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

اب میں نے غور سے اس شخص کی طرف دیکھا چہرہ مہرہ اچھا تھا جسم سڈول وہ کوٹ جو اس کے ناپ سے بہت بڑا تھا اسکے سڈول جسم کو چھپانے میں کامیاب نہ ہوسکا...... وہ ہمارے فلمی اداکاروں میں کئی سے ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسے کسی فلم میں موقع دیا جائے تو وہ ہمارے کئی نامی اداکاروں سے زیادہ نام پیدا کرے......

وہ بولا:۔ "بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں اکھڑ ہوں میری زبان میں شیرینی نہیں، اور خاص کر عمر رسیدہ عورتیں تو اسکی بہت شاکی ہیں مگر میں عادت سے مجبور ہوں، ارادتاً کسی سے سخت کلامی نہیں کرتا مگر لہجے کی کرختگی نہیں جاتی...... میرا لوگوں سے ٹکٹ مانگنا بھی بعض لوگوں کو بہت کھلتا ہے مگر کیا کروں یہی میرا فرض ہے....

اتنے میں ایک نوجوان لڑکی ٹرام میں آبیٹھی، پتلی، دبلی، نازک اندام کچھ بوکھلائی ہوئی.... ٹکٹ فروش اسکے پاس جا پہنچا......

کہاں جاؤ گی......؟ وہ بولی:۔ بائیکلہ برج......... وہ مسکرا دیا اور بولا بالکل غلط ٹرام پکڑی ہے آپ نے...... اس کی آواز میں ملاطفت تھی مگر کرختگی آمیز...... لڑکی گھبرا کر جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تحکمانہ آواز میں بولا:۔ "ٹھہرو، مجھے ٹرام کھڑی کرنے دو، وہ اس سے پہلے اترنے کی کوشش موت کو آواز دینا ہے۔ ٹکٹ فروش کا صحیح مشورہ لڑکی کو مشکور نہ کرسکا بلکہ اسکی جبین بھیں پر برہمی کے نشان بالکل واضح تھے ——

مجھے خیال گذرا کہ ایک لمحہ پہلے وہ کچھ کہہ رہا تھا بالکل سچ تھا۔ بدنصیب غریب صرف اسی لئے پیدا ہوا تھا کہ لوگ اس کے مخلص مشوروں کو بھی غلط سمجھیں۔ وہ پیدا ہی اس لئے ہوا تھا کہ اسکے متعلق ہر ہر گام پر غلط فہمیاں لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی رہیں۔ اسکی زندگی میں کتنی تلخیاں تھیں۔ اس کے پیشے کی وجہ سے لوگ اسکے مشوروں سے بھی برہم ہو جاتے تھے۔ توبہ —— طبع انسانی کی پستی کی انتہا۔ لڑکی اتر گئی اور وہ میری طرف پلٹا۔

—— "میں چاہتا ہوں لوگوں سے گفتگو کروں مگر کوئی مجھ پر توجہ نہیں دیتا۔ دیکھ لیا آپ نے ان بیگم کو کس طرح ناک بھوں چڑھا رہی تھیں۔ یہ ہے میری حالت اسپر بھی میں خوش ہوں یا خوش رہنے کی جد و جہد کر رہا ہوں —— پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا:۔ —— کیا آپ فلم کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ میں نے کہا "ہاں" وہ بولا۔ آپ ایکٹر ہیں۔ میں نے کہا "نہیں" وہ بولا "پھر" میں نے کہا۔ "لکھتا ہوں" وہ بولا۔ اوہ! میرا خیال تھا کہ لکھنے والے کچھ اور آدمیوں کی طرح نہیں ہوتے —— مگر خیر...................... میں سوچ رہا ہوں کہ میں اگر کسی دوسری جگہ ملازم ہوتا تو شاید اس سے بہتر حالت ہوتی —— چلتی ہوئی ٹرام میں چند قدموں میں محدود چل پھر کر زندگی بسر کر دینا کچھ اچھا مشغلہ نہیں مگر میں نے

مگر — تم یہ کہنا پھر کوئی اور کام تلاش کیوں نہیں کرتے — میں نہیں جانتا تھا کہ میرا یہ سوال بے محل ہے مگر پھر بھی میں پوچھ رہا تھا:—

معصوم بولا:" میرے نو بچے ہیں — آپ نہیں جانتے دنیا میں لاکھوں انسان غلط کام کر رہے ہیں، صرف اسلئے کہ انہیں بال بچوں کا پیٹ پالنا ہے اور پھر اپنی حالت پر خوش ہونے کیلئے مجبور — میرے بچے میری طرح ہنس مکھ ہیں۔ دن بھر بھاگتے پھرتے ہیں۔ گاتے رہتے ہیں — میری بیوی اکثر کہا کرتی ہے کہ تم چار دن مگر مجھے پاگل کر دوگے۔ مگر یہ تو اس کا انداز گفتگو ہے۔

میں اس جوان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ جسکی فنی قابلیت خوبصورت چہرہ اور سڈول جسم ٹکٹ فروشی کی نذر ہو رہا تھا... ہیوزیم آگیا اور میں ٹرام سے اتر پڑا۔ سامنے ٹرام جنکشن پر بہت سے لوگ اسی ٹرام کے انتظار میں کھڑے تھے...... میں نے اترتے ہوئے کہا:— خدا حافظ، خوش رہو!"...... مسکراتے رہو یہی زندگی ہے۔ وہ بولا:— "اسکے سوا ممکن بھی کیا ہے اور پھر وہی......

ہیا من ناہیں آدت چین

یکلخت اس کا گانا رک گیا، میں نے دیکھا کہ ایک انسپکٹر ٹرام کی طرف آ رہا تھا اور اب ٹکٹ فروش چلا رہا تھا... محمد علی روڈ محمد علی روڈ ...... میں نہ جانے کیوں مسکراتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

پروفیسر صاحب نے کہا کہ تم شوقیہ چشمہ لگاتی ہو اور تمہاری طرح ہندوستان کے اکثر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں شوقیہ چشمہ لگاکر اپنی آنکھوں کو غارت کر لیتے ہیں۔ ویسے تو تم لوگ مغرب کی اندھا دھند تقلید کرتے ہو مگر تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ولایت کے لوگ بے ضرورت کبھی چشمہ نہیں لگاتے بلکہ وہاں کے بچے تو چشمہ والے لوگوں سے ڈرتے ہیں۔ خاص طور پر چشمہ والی بوڑھی عورت سے بچے دُور دُور بھاگتے ہیں۔ چشمہ لگانے والے کے متعلق ہر آدمی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ "اسکی بینائی اچھی نہیں" اور جس کی بینائی درست نہ ہو گویا اس کے جسم میں کچھ خامی پیدا ہو گئی ہے۔ پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ چشمہ کو شوقیہ استعمال کرنا کہاں تک درست ہے۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ دیکھا دیکھی فیشن کے خیال سے انسان اپنی ایک ٹانگ توڑ ڈالے اور بیساکھی استعمال کرنا شروع کردے۔

پھر پروفیسر صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم ورزش کس قسم کی کرتی ہو، میں نے جواب دیا (Skipping) رسی کودنا۔ ڈمبلز اور چیسٹ ایکسپینڈر بھی استعمال کرتی ہوں، اسپر پروفیسر صاحب نے کہا تم چکی کیوں نہیں پیستیں۔ ولایتی ڈھنگ کی ورزشیں تمام جسم کیلئے اتنی مکمل نہیں ہوتیں۔ جتنی کہ چکی پیسنا۔ پانی بھرنا۔ گائے بھینس دُھنا گھر کا کام کاج کرنا اور یہی وجہ ہے کہ شہر کی فیشن ایبل عورتوں کی نسبت دیہاتی عورتوں کے جسم خوبصورت اور موزوں ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی چمک، چہرے کی قدرتی دمک، ان کے سرخی غازے پر بھاری ہوتی ہے۔ پروفیسر صاحب کی نصیحتیں واقعی ہیروں میں تولنے کے قابل ہوتی تھیں، شروع شروع میں تو مجھے یہ کچھ عجیب سی معلوم ہوتی تھیں مگر غور کرنے پر میں ان کی دل سے موئید بنجاتی تھی۔ پروفیسر کا حکم تھا کہ طالب علم کو نہایت سادہ زندگی بسر کرنا چاہئے۔ طالب علم کو اپنے حواس خمسہ پر پورا قابو رکھنا چاہئے۔ جسمانی ریاضت کو وہ طالب علم کیلئے ایک ضروری چیز سمجھتے تھے، ہر مہینہ ایک روزہ رکھنا، اور روزمرہ سادہ بے نمک مرچ کا کھانا کھانا۔ صفائی کے لئے بیسن مٹی یا کھلی سے نہالینا۔ اور سر میں بالوں کی صفائی کے لئے کنگھی کرکے باندھ لینا، اسی پر میں بھی عامل تھی۔ سینٹ لگانا، صابون سے نہانا، بال سنوارنا سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر چونکہ بالوں کو ہمیشہ سے پیچ وخم کی عادت تھی اس لئے پروفیسر صاحب یہی سمجھتے تھے کہ ابتک یہ بال سنوارتی ہے۔ ایک روز انہوں نے اپنی بیوی سے کہا کہ انکی کنگھی کردو۔ تاکہ آئندہ سے یہ ویسی ہی کنگھی کیا کریں۔ چونکہ زلفوں پر میرے بال کٹے ہوئے تھے وہ بکھر جاتے تھے، انکی بیوی نے کانوں کے پاس سے دو موٹی موٹی چٹیا بناکر خوب کس کر چوٹی ڈالدی۔

جب میں پڑھکر واپس گھر آئی تو اسی وقت چند لڑکیاں اور چند لڑکے اور کچھ بڑی عمر کے لوگ مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے ، ان کے ساتھ کالج کے پرنسپل ، گورنر اور میرے پڑوسی ڈاکٹر صاحب اور انکے بھانجے بھی آئے ہوئے تھے وہ میرے بیٹے کو دیکھ کر دنگ رہ گئے ۔ چونکہ یہ لوگ پہلے بھی مجھے دیکھ چکے تھے ۔ مجھے نہ معلوم کیوں اُس دن بہت شرم آئی ۔ حالانکہ شرم کی بات نہ تھی وہی میں تھی وہی میرا دماغ — پروفیسر صاحب نے مجھے اچھی اچھی نصیحتوں سے نوازا — میں ان کے اصولوں کی دل سے قائل تھی ۔ اور واقعی انسان کے اچھے اوصاف ہی اسکی خوبصورتی ہیں ۔

انہیں دنوں میں نے سنا کہ بچوں کو چھیننے کے لئے میرے خلاف دیوانی میں مقدمہ دائر کر دیا گیا ہے ۔ اب میرے لئے کڑی آزمایش کا وقت آگیا تھا ۔ مجھے اپنی بہن کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھورے کہتا ہے کہ بچے چھین کر انہیں اپنے سے بھی بدتر بناؤں گا یہی میری زندگی کا مقصد ہے ۔ مجھے تو چھوڑ گئی ہے مگر دیکھوں گا کہ اپنے پیٹ سے نکلے ہوئے " بھوروں " کو کیسے چھوڑے گی ۔ یہ خبر سنتے ہی دنیا میری نظروں میں سیاہ ہوگئی ۔ مقدمے کی پہلی پیشی پر مجھے عدالت میں حاضر ہونا پڑا — پھر وکیل ہی مقدمہ لڑتا رہا میں اسی جگہ واپس چلی آئی ۔ ان دنوں مجھ پہ ایک نزاعی کیفیت سی طاری رہی ۔ بچوں کی ماںتا — انکی جدائی کا تصور پھر ان کے بگڑنے کا خیال گورنمنٹ اور اس کے اندھے قانون کی بے رحمی ۔ اپنی بے بسی غرضکہ عجیب حالت تھی ۔ اب تو پریزیڈنٹ صاحب بھی زندہ نہ تھے جو ہر طرح سے میری مدد کرتے اور بچوں کو نہ دینے دیتے ۔ ایکدن میں اسی فکر میں مبتلا بیٹھی تھی کہ ماہ کو گود میں لئیے ہوئے ایک خوبصورت نوجوان میرے یہاں آیا میں نے اسے پہچان لیا یہ ڈاکٹر صاحب کا بھانجہ تھا — ماہ کہنے لگا " ممی ، دیکھو یہ ہمارے بھائی اور دوست ہیں ۔ ہم انہیں کیساتھ کھانا کھاتے ہیں ۔ ان کے ساتھ ہی گنگا میں تیرتے ہیں ۔ یہ بڑے اچھے ہیں انہیں اپنے گھر میں ہی رکھ لو " ۔ اِسپر میں اور وہ نوجوان ہنس پڑے ماہ کو گود سے اتار کر مسٹر سریندر واپس چلے گئے ۔ اس کے بعد دو تین مرتبہ مسٹر سریندر ماہ کے ہمراہ میرے یہاں پھر آئے ۔ بات چیت سے مجھے انکی اعلیٰ قابلیت اور روشن خیالی کا اندازہ ہوا ، وہ بھی میری طرح انسانیت کے حامیوں میں سے تھے انہیں ہر ایسی چیز سے نفرت تھی جو انسانوں کے درمیان دشمنی اور منافرت کے جذبات پیدا کرے ۔ وہ عورتوں کے حقوق کے زبردست حامی تھے جب انہوں نے میرا حال سنا تو وہ سچے دل سے میرے ہمدرد بنگئے + (باقی آئندہ)

خاص برائے تنویر

رازِ حیات

(از جناب ادیب مالیگانوی)

ہوئے ہیں صرف بہت آنکھ ہائے عنابی
مذاق ہی! اچمن آرزو کی شادابی

حقیقتاً ہے وہی ساحلِ آشنائے حیات
مثالِ موج میسر ہے جس کو بیتابی

زمیں پہ آج ہے محتاجِ نور وہ انجم
کبھی تھی جس کی ضیا باعثِ فلک تابی

سفینہ پار ہو کیا قلزمِ تمنا سے
اگر ہے اہلِ سفینہ کو خوفِ غرقابی

حدیثِ سوز ہوں، افسانۂ تپش ہوں میں
ازل کے روز سے فطرت ہے میری سیمابی

فضا میں نور مری آہ کے شرر سے ہے
وہ جانتے ہیں کہیں چھٹ رہی ہے مہتابی

جو زندگی کو جہاں میں عزیز رکھتے ہیں
حرام ان کیلئے، لذتِ گراں خوابی

ضمیرِ بحر ہو جب تک نہ منتہائے تلاش
کنارِ آب تو ممکن نہیں ۔ گہر یابی

بنایا جس نے سرشتِ بلال کو روشن
وہ چیز کیا ہے تری زلف کی سیہ تابی

خدا نے بخشدیا، حشر میں یہ کہہ کے ادیب
پسند آگئی ہم کو تری خوش آدابی

عراقی سٹیٹ ریلوے

عراقی سٹیٹ ریلوے نجف اشرف کربلائے معلےٰ ۔ کاظمین اور بصرہ کے مقامات مقدسہ کے زائرین کیلئے تیز ترین آرام دہ ارزاں ترین ذریعۂ سفر ہے ۔ مشہد مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے یا واپسی پر عراق کے مقامات مقدسہ کی زیارت کیجئے ۔ اس طرح آپکو دو مختلف زیارتوں کے اخراجات میں کفایت ہو جائے گی۔

خاص آسانیاں اور تخفیف شدہ کرائے

حجاج کو ۱۵۰ ایام کیلئے خاص کوپن ٹکٹ مل سکتے ہیں جنکی رو سے ۵۰ کلو سامان مفت لیجایا جاسکتا ہے ۔ تفصیل یہ ہے :-

دوسرا درجہ تیسرا درجہ بک "A" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلیٰ اور پھر بغداد کاظمین (الجوادین اسٹیشن) تک اور
۴۲ روپے ۱۴ روپے کاظمین سے سامرہ اور واپس براہ کاظمین ماقل (بصرہ) تک سفر ہو سکتا ہے۔
۴۰ روپے ۱۲ روپے آٹھ آنے بک "B" سے ماقل (بصرہ) سے کربلائے معلیٰ اور پھر بغداد یا کاظمین (الجوادین سٹیشن) اور واپس ماقل تک سفر ہو سکتا ہے

تین برس سے کم عمر کے بچے مفت اور بارہ برس سے کم آدھے ٹکٹ پر

ماقل (بصرہ) پر ہمارا حج ایجنٹ حجاج کو ملتا ہے

تمام اہم مقامات مقدسہ کے درمیان روزانہ ٹرینیں نجف اشرف سے براہِ راست مدینہ منورہ کو (ایک نیا خشکی کا راستہ جو صحرا میں سے ہو کر گزرتا ہے کھولا گیا ہے) جاتی ہیں ۔ یہ عراق گورنمنٹ کے زیر انتظام ہے ۔ راستہ نجف اشرف سے براہ جمیمہ اور حنیل کے کرائے یہ ہیں :-

دوسرا درجہ	تیسرا درجہ
۲۰۰ روپے	۱۳۴ روپے

مفصل معلومات ۔ ٹکٹ ۔ حج ۔ کوپن ۔ ٹیکس وغیرہ مختلف سب ایجنٹوں سے بمبئی اور کراچی میں مل سکتے ہیں ۔ جنکے پتے یہ ہیں :-

۱ ـ مولوی محمد باقر حاجی ویرجی جمال کا مسافرخانہ ۔ جیل روڈ عمر کھاڑی بمبئی
۲ ـ دی آنریری جائنٹ سکریٹری ۔ فیض پنجتنی بالا گلی بمبئی
۳ ـ مسٹر ای ۔ ای ۔ لوٹیا ماڈی کولیواڑہ بمبئی ۳
۴ ـ حبیب جی رحمت کھاردار کراچی
۵ ـ مسٹر عبدالعلی شیخ عیسیٰ جی معرفت میسرز یوسف علی علی بھائی کریم جی اینڈ کو نیپیر روڈ کراچی
۶ ـ دی آنریری سیکریٹری فیض پنجتنی معرفت حاجی جیٹھا بھائی گوکل گودی گارڈن کراچی

اسوقت سویرا تھا جب وہ بیفلو سا جنکشن سے اسٹیشن پر آئی جہاں وہ گاڑیاں جو لسبن سے بیرا کے صوبے کو جاتی ہیں، ٹھہرتی ہیں۔ وہ ایک پستہ قد عورت تھی جو عمر کی وجہ سے نہیں بلکہ زیادہ محنت کے کام کرنے اور تنگی و محتاجی کی وجہ سے بڈھی معلوم ہوتی تھی۔ وہ زرد رو، پستہ قد اور نقل و حرکت میں چھوٹے بھورے چوہے کی مانند پھرتیلی تھی۔ وہ سستے مگر معقول کپڑوں میں ملبوس تھی اور بیرا کی عورتوں کے قاعدے کے مطابق اس کے پیر اور بھوری ٹانگیں ننگی تھیں۔ کسی نے اسپر زیادہ غور نہیں کیا اور اس نے بھی اسٹیشن پر کسی آدمی پر بالکل بھی دھیان نہ دیا۔

وہ ایک ڈھکی ہوئی ڈلیا لئے ہوئے تھی اور دیہات سے جو اسٹیشن سے تقریباً پانچ میل تھا تمام راستہ جنگلوں اور کھیتوں میں ہوکر پیدل آئی تھی، جہاں خاردار جھاڑیوں اور بیری نے جس نے اپنے پیروں کی وجہ سے نیچے کے جھاڑ جھنکار کو جھکا رکھا تھا، اس کے پیروں کو اپنے تیز کانٹوں سے زخمی اور خون آلود کر دیا تھا۔ جیسے ہی وہ اسٹیشن کے نزدیک آئی ایک قلی نے اس سے ریلوے لائن سے دور ہی رہنے کو کہا کیونکہ ایسا کرنا خطرناک تھا اور گاڑی کسی وقت بھی آ سکتی تھی۔ اس چھوٹی عورت نے ڈرتے ہوئے اسکو بتایا کہ میں گاؤں سے آئی ہوں، میرا مطلب پٹری کے قریب چلنے سے کسی نقصان کا نہیں ہے بلکہ میں تو اسٹیشن پر آنا چاہتی ہوں کیونکہ میرا بیٹا، میرا اکلوتا بیٹا لسبن سے آنیوالی گاڑی سے آ رہا ہے۔ میرے خاوند کو مرے ہوئے تیس سال ہوگئے ہیں اور اسوقت میرا بیٹا صرف تین سال کا تھا۔ میرے پاس دنیا میں جو کچھ ہے صرف وہ ہے، اور وہ برازیل میں دس سال رہا ہے۔ اب وہ میرے پاس لسبن سے آنے والی گاڑی سے واپس آ رہا ہے۔

اس نے جو کچھ کہا اس پر قلی کچھ متوجہ نہ ہوا۔ اس نے اسٹیشن کا دروازہ بتلا دیا اور اپنے کام پر چلا گیا۔

اسٹیشن پر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف ویٹنگ روم ریفریشمنٹ روم اور دفتروں وغیرہ میں ہر جگہ یہ پوچھا کہ آیا کسی نے ایک لمبا نوجوان جو کچھ کالا ہے، جس کے سیدھے گال پر ایک کھرونچ کا نشان ہے اور جس کے چھوٹے گھونگریالے بال ہیں دیکھا ہے کیونکہ اگر ایسا ہے تو وہ اس کا بیٹا تھا جو کسی وقت بھی لسبن سے آنیوالی گاڑی سے آنیوالا تھا۔

کچھ آدمیوں نے اسکو جواب نہ دیا کچھ اس غریب کسان عورت کی طرف مشفقانہ انداز سے مسکرا دیئے اور کہا کہ لسبن سے آنیوالی گاڑی ابھی تک نہیں آئی ہے۔ جو اس سے سب سے زیادہ خوش اخلاقی سے پیش آیا وہ ایک فوجی سپاہی تھا جو لوزو میں اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کو جا رہا تھا۔ اور جنکشن پر

کو آمبرا سے آنیوالی گاڑی سے آیا تھا۔ اسکی گاڑی رات تک
آنیوالی نہ تھی اور اسکو پورا دن اسٹیشن پر گذارنا تھا۔ اسکو
وہ اس چھوٹی عورت کو بنچ پر اپنے پاس جگہ دینے اور اپنا بیکار
اور تھکا دینے والا وقت گذارنے کیلئے اسکی بک بک سننے
کیلئے خوش تھا۔

لسٹن سے آنیوالی گاڑی گھڑگھڑاتی ہوئی آئی اور
چھوٹی عورت جسکی مشتاق نگاہیں گاڑی سے اترنے والے مسافروں
پر جمی ہوئی تھیں کافی دیر تک کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لوگ بہت نہیں تھے
اور ان میں سے ایک بھی برازیل سے آنیوالے مسافر سے مشابہ نہ تھا۔

—— "اماں۔ فکر مت کرو" سپاہی نے شفقت سے کہا۔
"بہتر ہوگا کہ گھر چلی جاؤ اور اسوقت پھر آؤ جب لسٹن سے آنیوالی
اگلی گاڑی آنیوالی ہو"

—— "اور وہ کس وقت آئے گی؟"

—— "سہ پہر کو ساڑھے پانچ بجے"

—— "اوہ، میں گھر نہیں جا سکتی۔ میں انتظار کروں گی۔
فرض کرو کہ گاڑی میرے آنے سے پہلے آجائے اور میں اسے
نہ ڈھونڈھ سکوں تو وہ کتنا مایوس ہوگا۔ کیونکہ تم نہیں جانتے
کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور برازیل میں دس سال رہا ہے"

پس وہ دوبارہ بیٹھ گئی اور سپاہی نے اس کے
تمام حقیر حالات زندگی سنے کہ کسطرح اس کا خاوند اسکو یہ لڑکا چھوڑ
مرا تھا۔ جسکو اس نے بڑی حفاظت سے پرورش کیا۔ کسطرح
وہ بھی ایک سپاہی تھا اور کس طرح وہ اپنے گذارہ کے لئے،
اور جب وہ وہاں ملک کی خدمت کر رہا تھا اسے تھوڑی سی
رقم بھیجنے کیلئے محنت کرتی تھی۔ کسطرح ان دونوں نے بعد میں
کام کیا، لیکن گاؤں کتنا ادنی تھا اور کچھ رقم پیدا کرنا کتنا مشکل تھا۔
کس طرح تیئیس[22] سال کی عمر میں وہ ترک وطن کر کے برازیل چلا گیا
تھا لیکن اسکی وہاں پر بھی اچھی قسمت نہ تھی۔ وہ طاقتور نہ تھا اور
اس نے تمام کاموں میں بغیر کسی کامیابی کے قسمت آزمائی کی۔
آخر کار اس کے خطوط آئے جو اپنے گاؤں میں آکر اپنی ماں کیلئے
کام کرنیکی آرزو سے پر تھے۔ وہ خطرناک بخار میں مبتلا تھا۔
اور اس نے کفایت کر کے گھر کی واپسی کے سفر کیلئے اور اپنی ماں
کے گذارہ کیلئے جبتک کہ اسے آرام ہو کافی روپیہ جمع کر لیا ہے۔
اوہ! لیکن وہ جلد ہی اچھا ہو جائیگا میں اسکی بڑی اچھی طرح
تیمارداری کروں گی اور اس خراب آب و ہوا کے بعد جس میں وہ
بیمار پڑ گیا تھا اسکے اصلی گاؤں کی آب و ہوا اسے اچھا کر دیگی۔

سپاہی نے اسے اپنے جھولے میں سے کچھ کھانا نکال کر
پیش کیا لیکن چھوٹی عورت نے شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا

—— "میں بھوکی نہیں ہوں، میں تھوڑا سا کھانا کھانیکی عادی
ہوں اور میری ڈلیا میں کافی مقدار میں کھانا ہے —— ایک چوزہ
کچھ پنیر، ایک روٹی، اور شراب کا ایک چھوٹا سا مشکیزہ ——
یہ میرے بیٹے کے لئے ہے اور جب وہ آئے تو اگر سپاہی مناسب
سمجھے تو ہم سب ساتھ کھائیں گے۔ یہ ہم سب کیلئے بہت ہی خوش آئند
ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ تم میرے بیٹے کو پسند کروگے جو ایک
سپاہی رہ چکا ہے۔ لیکن کیا تم خیال کرتے ہو کہ میرا بیٹا سہ پہر والی
گاڑی سے آئیگا؟"

سپاہی نے اسے اطمینان دلانا چاہا کہ وہ بلاشبہ آئیگا اور پھر
اپنی بانہہ کا سہارا دیکر پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے۔ کچھ مسافر ویٹنگ
روم میں بنچوں پر سو رہے تھے، اور کچھ وقت گزاری کے لئے
غپ شپ کر رہے تھے، کیونکہ سب کسی نہ کسی گاڑی کا انتظار
کر رہے تھے۔ بچے خوشی میں سب چیزوں یعنی گھنٹوں، جھنڈیوں

تار دینے کے آلے، اول درجہ کے ریفرشمنٹ روم جو موسم سرما کے پھولوں سے سجے ہوئے تھے اور ریلوے ملازمین کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت باغوں والے کوارٹروں وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چند نوجوان لڑکیاں ان کے سادہ اور شیریں گانوں میں آواز سے آواز ملا رہی تھیں جن سے دل پر اثر کرنے والا رنج ظاہر ہوتا تھا۔ اور جو ابھی تک اس ہیرا کی پاک زمین پر موجود ہے۔ جو پرتگال قوم کی طاقت کا اور ابھی تک ان تمام چیزوں کا مرکز ہے جو روزانہ کی زندگی میں دنیا میں سب سے زیادہ پاک ہو۔

دو تین چھوٹی چھوٹی گاڑیاں آئیں۔ ہر ایک جب سیٹی بجاتی تھی تو چھوٹی عورت خوفزدہ ہو جاتی اور کپکپانے لگتی تھی۔ جب ان میں آخری گذر گئی تو اس نے اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچنے کی جرات کی۔

—— "جناب، کیا آپ مجھے معاف کریں گے۔ لیکن وہ کب آئے گا؟"

—— "کون کب آئے گا؟"

—— "میرا بیٹا۔ لیکن آپ نہیں جانتے۔"

—— "نہیں۔ فی الحقیقت میں نہیں جانتا۔ وہ کہاں سے آ رہا ہے؟"

—— "برازیل سے جناب"

—— "لسبن سے آنیوالی گاڑی، اس سہ پہر کو ساڑھے پانچ بجے"

—— "اور ...... اگر وہ آج نہیں آیا تو کل کب آئیگا؟"

—— "لیکن پیاری خاتون، لسبن سے آنے والی گاڑیاں کل بھی وہی ہوں گی جو آج ہیں۔" اسٹیشن ماسٹر مسکرایا۔

—— جناب مجھے معاف فرمائیے، میں گاؤں سے آتی ہوں اور اپنے بیٹے کی منتظر ہوں۔ ایک لمبا نوجوان۔ کچھ کالا جس کے سیدھے گال پر ایک نشان ہے۔"

اسٹیشن ماسٹر ایک دوسری لوکل ٹرین کا ورود دیکھنے کے لئے تیزی سے چلا گیا۔ چھوٹی عورت اور بھی چھوٹی ہوتی ہوئی معلوم دی کیونکہ وہ بنچ پر بیٹھ گئی اور ڈلیا کو پلیٹ فارم پر رکھدیا۔ سپاہی ایک دوست کے ساتھ جو کچھ دور گھوم رہا تھا باتیں کر رہا تھا۔

دسمبر کا دن گذر گیا، بھورا اور کہر آلود، ان دونوں میں سے ایک جب آسمان اور زمین کے درمیان سب کا سب ایک لمبا راستہ معلوم ہوتا ہے۔ جس کے درمیان میں بغیر رنگ کی یکسانیت کو توڑنے کیلئے کوئی افق نہیں ہوتی۔ چڑیاں بھی خاموش اور چپ چاپ تھیں اور اسٹیشن کی چھت پر پاس بیٹھی ہوئی کانپ رہی تھیں۔ بادل خاموش ہوا میں لٹکے ہوئے تھے۔

ایک نیچے سپاہی نے اپنا تھیلا خوشی میں پکارتے ہوئے کھولا ——

—— "ناشتہ کا وقت ہے سب صاحبان آئیے!"

ناشتہ کے لفظ پر سب کے سب کھڑے ہو گئے۔ امیر مسافر ریفرشمنٹ روم میں چلے گئے۔ غریبوں نے مختلف سائز اور شکل کے پلندے نکالے۔ عورتوں میں سے کچھ تھوڑے فاصلہ پر لکڑیاں چننے اور آگ جلانے کیلئے چلی گئیں تاکہ اپنے قہوہ اور یخنی کے ڈبے گرم کرسکیں اور عام طور سے لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

—— "مائی۔ آؤ" سپاہی نے کہا۔ — میرے پاس دو کے واسطے کافی ہے۔"

لیکن چھوٹی عورت نے انکار کر دیا۔ "جب میرا بیٹا آئے گا تب میں کھانے کے قابل ہوں گی، ہم سب ساتھ کھائیں گے۔

اسوقت میں بھوکی نہیں ہوں۔ لیکن میرے پاس ایک چوزہ پنیر روٹی اور شراب ہے۔ ہم سب کی ضیافت ایک ساتھ ہوگی۔ میرے گھر ایک ساسو ہے لیکن میں اسے اسوقت تک مارنا نہیں چاہتی جبتک کہ میرا لڑکا نہ آجائے۔ وہ سور کی خشک نمکدار ران سے لطف اٹھائے گا۔ اور میرے پاس چونے اور لطیفیں بھی ہیں جو سب اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ مجھے اپنے واسطے کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ ایک بوڑھی عورت ایک جوان آدمی کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اور وہ بیمار بھی ہے۔ اسکی تندرستی کے لیئے اس کے واسطے بہتر کھانا ہونا چاہیئے۔ نہیں میں نہیں کھا سکتی۔ اسوقت تک نہیں جبتک کہ میں اسے دیکھ نہ لوں۔ میرا بیٹا، میرا اکلوتا بیٹا، جسے میں نے دس سال سے نہیں دیکھا ہے"

سپاہی نے اپنا ناشتہ بڑی رغبت سے کھایا۔ اسکے پاس جو کی روٹی۔ بکری کے دودھ کا پنیر اور سوکھی ہوئی چھوٹی سمندری مچھلیاں جو ٹماٹروں کے ساتھ پکائی گئی تھیں، سرکہ اور ایک مٹی کے مرتبان میں لہسن کا مربہ تھا۔ جب وہ کھا چکا تو اس نے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ریزہ کانپتی ہوئی چڑیوں کی طرف پھینک دیئے اور ریفرشمنٹ روم کی طرف چلا گیا۔

چھوٹی عورت بادامی دھندلے آسمان پر اپنی نظریں جمائے انتظار میں بڑے صبر سے بیٹھی رہی۔

—— "مائی۔ ادھر دیکھو!" سپاہی نے کہا "تھوڑی سی شراب، تم اسے ضرور پیو، اپنے بیٹے کی صحت کیلیئے"

وہ خاکساری سے مسکرائی، جھینپی اور پھر بڑی سلیم الطبعی سے اسے منظور کر لیا۔

—— "میرے بیٹے کی صحت۔ سپاہی، اور تمہاری بھی"

—— دس سال کا عرصہ بہت زیادہ ہے، مائی، تمہارا بیٹا بہت کافی بدل گیا ہوگا"

اس نے بھونچکی ہوکر اوپر کو دیکھا۔

—— بدل گیا ہوگا، میرا بیٹا بدل چکا ہوگا، میں نے ایسی بات کا خیال بھی نہیں کیا تھا۔ میرے خیالات میں، میری دعاؤں میں میرے لئے وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ ایک تیئیس ۲۳ سال کا نوجوان کالے چہرہ کا لیکن نیلی آنکھوں والا، کبھی مضبوط نہ ہونے والا اسکے مضبوط ہونے کیلیئے اسکے بچپن میں بھی کھانے کو بہت کم تھا۔ لیکن میرا پیارا بیٹا۔ میرا صرف وہی —— وہ کسطرح بدل سکتا ہے"

وہ سپاہی کو اسکی برازیل کی زندگی کے متعلق جو کچھ اسے معلوم تھا بتلانے لگی۔ کسطرح جب وہ پہلی دفعہ گیا۔ وہ خوش قسمت تھا۔ اسکو چمڑا رنگنے کے فرم میں جگہ ملگئی۔ تب اور زیادہ روپیہ کمانے کی امیدیں وہ ملک کے اندرونی حصہ میں چلا گیا۔ اس کے خطوط کم ہونے لگے۔ شاید سال بھر میں دو یا تین، اس کے بہت سے اسباب تھے —— فاصلہ اتنا زیادہ تھا، اسکو اتنے تھوڑے سے معاوضہ میں اتنی دیر تک کام کرنا پڑتا تھا، آب وہوا خراب تھی اور وہ اکثر بیمار رہتا تھا۔ کبھی اطمینان دلانے والے خطوط نہ آئے۔ صرف حالات کے بہتر ہوجانے کی امیدیں اور جو کبھی پوری نہ ہوئیں۔ اس نے اپنی ماں سے دعا کیلیئے استدعا کی تاکہ وہ اسے دوبارہ دیکھنے کیلیئے زندہ رہ سکے۔ کہ اسے اس سے بہتر کام مل جائے کہ وہ مضبوط ہو جائے اور اس کے لیئے کافی دولت واپس لائے تاکہ اسکے آخری دن میں مفلسی سے محفوظ رکھ سکے۔

—— "ایک نوالہ تو لو مائی، یہ ٹماٹروں کے ساتھ مچھلیاں بہت اچھی ہیں۔"

اس نے اپنا سر ہلایا اور باتیں کرنے لگی جیسے کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔ "ایک اچھا نوجوان۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسے اچھی طرح پرورش نہیں کیا۔ لیکن ہم بہت غریب تھے اور وہ کبھی مضبوط نہ ہوا۔ شاید اسکے وطن کی ہوا اسکو راس آ رہی ہو۔"

—" اور بلا شبہ وہ تمہارے لئے چند ڈالر لائے گا "

—" جو کچھ بھی وہ لائے میرے لئے وہ دولت ہی ہوگی۔ جس کے پاس سوائے اس مبارک دن اور رات کے جو ہمیں خدا دیتا ہے اور کوئی نہیں ہے اسکا کچھ بھی نہیں ہو۔ اسکو صرف خود ہی آنے دو وہ ہی کافی ہوگا کیونکہ تمہیں معلوم ہے کہ وہ میرا اکلوتا بیٹا ہے اور میں نے اسکے باپ کو اسوقت کھو دیا تھا جبکہ وہ صرف سال کا تھا"۔ بجلی کی گھنٹی بجی اور وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ — "کیا یہ اسٹیشن سے آنیوالی گاڑی ہے؟"

تمام بچے ہنس پڑے اور سپاہی بھی مسکرا دیا

"جی تو صرف نو ہی بجی ہیں مائی، گاڑی ساڑھے پانچ بجے آتی ہے"

. . . ت دوپہر گذر گئی اور ستمبر میں سویرے سے چھپ جانے والا اندھیرا چھا گیا۔ سپاہی کی سگریٹ ختم ہوگئی اور وہ بنچ پر سو گیا۔ ابتک چھوٹی عورت بڑھتی ہوئی رات کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تشا تا ہوا دیکھتی رہی۔ وہ سورج نکلنے کے وقت سے جاگ رہی تھی۔

اسٹیشن کے لیمپ جلا دیئے گئے اور شام کی گاڑیاں جنکشن پر آنے لگیں اور ہر ایک کے آنے سے پہلے پٹڑیاں گڑگڑانے لگتیں تھیں اور آنے والے انجن کی تیز آواز سنائی دی۔

پہلے ایک مقامی گاڑی وال ڈوارو کے صنوبر کے جنگلوں میں سے گھسٹتی ہوئی آئی۔ اس کے بعد فلو یرا سے آنیوالی گاڑی نے اندھیرے میں دور سے سیٹی دی۔ اور اگلی آنیوالی گاڑی اپبوڈو ایکسپریس تھی جو سفید اور ارغوانی چمکتی ہوئی آنکھوں والی تھی جیسے ہی کہ وہ آئی۔

دس منٹ کیلئے پانی اور کوئلہ لینے کیلئے گاڑی کھڑی ہوئی۔ بھوکے مسافر ریفریشمنٹ روم کی طرف دوڑے، اور قلی سوالات کے جواب دینے میں مشغول تھے جو گٹھڑیاں لیجا رہے تھے اور کواڑوں کو کھول اور بند کر رہے تھے۔

چھوٹی عورت نے ڈرتے ہوئے ان میں سے ایک کو ٹھہرایا۔

— . . . "دور اسٹیشن سے آنیوالی گاڑی جناب؟"

—" ساڑھے پانچ بجے، اگلی آنیوالی گاڑی۔ مہربانی کرکے پیچھے کھڑی ہو۔"

لمبا اپبوڈو ایکسپریس گھڑگھڑاتا ہوا چلا گیا اور چھوٹی عورت نے برافروختگی کی حالت میں کچھ سسکتے ہوئے اسٹیشن کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا۔ گاڑی آ رہی تھی —

سپاہی نے چند خوش کن الفاظ کہے لیکن اس نے اسکی بات نہیں سنی۔ اسکی تمام ذہنی قوت آنے والے بیٹے کے انتظار پر مرکوز ہوگئی تھی، اسکے ہاتھ بغیر ارادہ کئے ہوئے کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ آخر کار صنوبر کے جنگلوں میں سے سیٹی سنائی دی شروع میں دھیمی، صاف اور اونچی ہوتی ہوئی۔

گاڑی پلیٹ فارم کے پاس گھڑگھڑائی۔ شور بیان سے باہر تھا۔ قلی چیخ رہے تھے۔ مسافر باتیں کر رہے تھے۔ آدمی، پانی، روٹیاں۔ اخبار، ناول اور نارنگیاں بیچ رہے تھے۔ چھوٹی عورت تیسرے درجے کے مسافروں کے چہرے جائزہ لیتی ہوئی جبکہ وہ اتر رہے تھے۔ ان میں وہ گھس گئی الگ ہٹائے جاتے ہوئے اور دھکے کھاتے ہوئے ہر ایک بات سے بے خبر سوائے اسکے کہ یہاں اس گاڑی میں اسکا بیٹا ہے، اس کا اکلوتا بیٹا جسے اس نے دس سال سے نہیں دیکھا ہے۔ وہ ضرور ٹھہر رہا ہوگا شاید بھوکا۔ اسے اسکو ضرور تلاش کرنا چاہئے اور فوراً گھر کو لیجانا چاہئے، یہ لمبا سفر ہوگا، لیکن کم از کم

وہ دونوں ساتھ ہوں گے اور جب وہ گھر پہنچینگے تو وہ آگ جلائے گی جسے وہ تیار چھوڑ آئی تھی۔ قہوہ کو گرم کریگی اور وہ شام کے کھانے میں کتنے خوش ہوں گے۔

جونہی کہ وہ دوڑی ایک ادھیڑ جسم آدمی چھوٹی عورت پر تقریباً گر پڑا اور اسکو روکنے کے لیئے اس نے تعجب سے چلاتے ہوئے اسکی بانہہ پکڑی، معذرت چاہتے ہوئے یکایک وہ چلایا۔

—— "کیوں روزا! یہ ویکاریکا کی روزا ہے؟"

بغیر کچھ سمجھے ہوئے اس نے اوپر کو دیکھا۔

—— کیا تم مجھے نہیں پہچانتیں، روزا! ——
کلی مینٹے، تمہارا قدیم پڑوسی۔ میں ابھی برازیل سے اپنا پرانا گھر دیکھنے کیلیئے آیا ہوں۔ اے عورت، کاش تجھے معلوم ہوتا کہ میں اپنی پرانی جگہ دیکھ کر کتنا خوش ہوں!"

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:—

"یہاں مجھ سے ملنے کیلیئے کوئی نہیں ہے کیونکہ میں نے کسی کو نہیں بتایا ہے کہ میں آرہا ہوں۔ میں ہر ایک کو متعجب کرنا چاہتا تھا۔ وہ سب کتنے خوش ہوں گے کیونکہ میں نے وہاں بہت کمایا ہے۔"

—— "لیکن میرا لڑکا؟ وہ ابھی تک گاڑی میں ہے؟ تم دونوں کو ساتھ آنا چاہیئے تھا؟"

کلی مینٹے نے رکتے ہوئے متعجبانہ لہجہ میں کہا:—

"آؤ اور میرے ساتھ کچھ کھالے کے۔ سنو لو!"

—— "شکریہ، میں ہوں گی۔ لیکن مجھے اپنے بیٹے کا انتظار کرنا چاہیئے۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟ شاید وہ یہ خیال نہیں کرتا ہے کہ میں اب یہاں ملنے کیلیئے آئی ہوں۔ کلی مینٹے جاؤ اور اس سے کہو! میں یہاں انتظار کرونگی اور پھر ہم سب ناشتہ کریں گے۔ میں ناشتہ اپنے ساتھ لائی ہوں۔ کلی مینٹے براے مہربانی جلدی کرو۔ اس سے کہو کہ تیری ماں ماں یہاں انتظار کر رہی ہے"

کلی مینٹے ہچکچایا اور اپنے چہرے کی پژمردگی چھپانے کیلیئے آنکھوں پر اپنا ہیٹ رکھ لیا۔ اور جونہی کہ چھوٹی عورت نے دوبارہ اپنی آنکھیں اوپر کو اٹھائیں، اس نے اپنی بانہیں اسکے دبلے کندھوں پر رکھ دیں اور اس کے متردد چہرہ کو دیکھنے کے لیئے جھکا۔

—— "روزا، میری پیاری خاتون، بوڑھی پڑوسن، میں بھول گیا کہ تم نہیں جان سکتیں، میرا دل تمہیں بتاتے ہوئے ٹوٹتا ہے۔ لیکن تمہیں کسی نہ کسی طرح ضرور جاننا چاہیئے، کہ تمہارا بیٹا.......... تمہارے بیٹے کا تو بحری سفر میں انتقال ہو گیا—"

اس کے منہ سے نہ تو کوئی سسکی اور نہ کوئی چیخ نکلی۔

اس نے اپنا باریک کالا شال کندھوں پر اور قریب کو کھینچا اور اپنی ٹوکری کو جو کہ ابتک ہاتھ میں تھی اور سر نیچا کئے ہوئے جلدی سے اسٹیشن کے باہر چلی گئی۔

کلی مینٹے اس کے پیچھے جانے ہی والا تھا لیکن کچھ پس و پیش کیا۔ وہ اپنا سامان دیکھے گا۔ ایک گھوڑا گاڑی لے گا اور تب گھر جائیگا۔ اسکو اسے سڑک پر پکڑ لینے کا یقین تھا۔

بغیر کچھ دیکھے بغیر کچھ سنے چھوٹی عورت بڑھتی چلی

چلی گئی۔ جونہی کہ وہ جلدی سے آئی اسٹیشن کا شور اور روشنی پیچھے رہ گئی، اسکے ننگے پیر کہر آلود سڑک پر آواز پیدا نہیں کر رہے تھے۔ وہ چرپال سے گذر گئی جہاں اس کے ٹخنوں میں کنٹیلا چبھ گئی لیکن اسے کچھ محسوس نہ ہوا۔ وہ اسکا خیال کئے بغیر چلے ہی گئی کہ وہ کہاں جارہی ہے۔

لسبن سے آنیوالی گاڑی سیٹی دیتی ہوئی اسٹیشن سے چل دی اور اب بڑی تیز رفتار سے صنوبر کے جنگلوں کے سہارے سہارے آرہی تھی، گاڑی کی بڑی بڑی آنکھیں رات میں سرخ سرخ چمک رہی تھیں اور دھوئیں کی لائن اسکی لمبائی کے اوپر پیچھے کو مڑتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ جسطرح کوئی عظیم الجثہ شیطانی گھوڑا دنیا پر تباہی و بربادی لانے کے لئے کھول دیا گیا ہو۔ جنگل میں پٹڑیوں کا موڑ آیا اور اسکی سرخ آنکھیں بوڑھی عورت پر اپنی طرف بلانے کے لئے جادو سا کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اس نے کسی چیز کا خیال نہیں کیا، وہ بڑھے چلی گئی۔ وہاں جہاں وہ آنکھیں اسکو بلاتی تھیں۔

جب صبح کی روشنی پھیلی تو لوگوں نے صرف وہی دیکھا جو اس چھوٹی عورت میں سے باقی رہ گیا تھا۔ اسکی ڈلیا پٹڑیوں سے کچھ فاصلہ پر پڑی ہوئی تھی جو وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے کیلئے لائی تھی اور جو ابھی تک ناشتہ سے بھری ہوئی تھی +

زاہد اور شاعر

از محترمہ زیب عثمانیہ لودیانوی

کہا زاہد نے شاعر سے ز راہِ انتقاد اک دن ! — زمانے کی روش سے شاعری ہے تیری عیاری ؟

سکوں لیکن نہیں تو دیکھ سکتا بزمِ ہستی میں — اسی اک بات پر ہے عابدوں کو تجھ سے بیزاری

مرا مسلک کہ ہے خالق ہمارا آسمانوں پر — ترا دعوےٰ کہ وہ ہر چیز میں ہے جاری و ساری !

عبادت کیلئے خلوت گزینی لازمی شئے ہے ! — ترے نزدیک لیکن ہے یہ عیاری و مکاری

نجات ہمیں نہیں ! تو جسکو خودداری بتاتا ہے ؟ — زمانے میں ہمیشہ کام آتی ہے نگوں ساری !!

سوال ایسا ہی تھا، شاعر بہت برہم ہوا سنکر ! — کلیجے میں کسی نے جسطرح برچھی ہو دے ماری !!

کہا پھر اسنے جو کچھ ہے تجزیہ ہے اسکا لا حاصل ! — زمانے پر ہے روشن اہل دل کی گرم گفتاری

"عہد حاضر کا سب سے زیادہ ترقی پسند شاعر"

(از جناب قدسی اجمیری)

گذشتہ سے پیوستہ

اس ضلالت و پستی سے جب نجات مل سکتی ہے کہ عشق کے پرستار ہوجائیں اور خرد کی فسوں کاری میں نہ آئیں بلکہ خرد کو تابع عشق کریں۔

چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیش او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم

اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

جہاں عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

عشق روح روان زندگی ہے جس سے حیات میں درد و سوز اور زیر و بم پیدا ہوتا رہتا ہے ؎

عشق سے پیدا نوائے زندگی میں زیر و بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمبدم

دل دعشق کے نزدیک قصہ دار و رسن بازیچۂ طفلاں ہے اس سے زیادہ اس بازی کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ عشق میں کیسی رنگینی و انجذاب اور درد و سوز ہے کہ مزرع ہستی کی آبپاشی اور نشو و نما برق و صاعقۂ عشق کی خرمن سوزی سے ہوتی ہے۔ ابر کرم کی گوہر باری سے نہالان چمن در دو سان بہاری سرسبز و شاداب ہوتے ہیں لیکن گلستان حیات پر جب عشق کی بجلی گرتی ہے تو پھولتا پھلتا ہے۔

قصۂ دار و رسن بازیٔ طفلانۂ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانۂ دل

یارب اس ساغر لبریز کی مے کیا ہوگی
جادۂ ملک بقا ہے خط پیمانۂ دل

ابر رحمت تھا کہ تھی عشق کی بجلی یارب
جل گئی مزرعۂ ہستی تو اُگا دانۂ دل

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

حوادث زمانہ اور سیلاب دوراں کسی کو نہیں چھوڑتے ہیں جہانتک ان کا بس اور مقدور ہوتا ہے سب کو فنا و زیر و زبر کر دیتے ہیں۔ لیکن عشق کے ہاتھوں وہ بھی مجبور و عاجز ہو جاتے ہیں۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام

مرد با عشق کی موت شرف و عزت کی موت ہوتی ہے۔

کھول کے کیا بیاں کروں سر مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگ باشرف مرگ حیات بے شرف

فرنگی تمدن و معاشرت سے احتراز و تنفر

وہ فرنگی تمدن و معاشرت کے نہایت مخالف اور تصورحیات میکانی و فرنگی مادیت سے متنفر و بیزار تھے۔ فرنگی فریب خوردگیوں سے واقف و آشنا تھے اور دیکھ رہے تھے کہ ان کی قوم فرنگ کی کورانہ تقلید میں مصروف و مشغول ہے چونکہ اس تقلید کے بڑھتے ہوئے رجحانات و اثرات کا

انجام ان کے سامنے تھا اور اس عمارت کی اساس میں ضعف و سقم پیدا ہونے لگے تھے، بھلا وہ کیسے گوارا کرسکتے تھے اور خاموش بیٹھے رہتے کہ قوم جو اپنے کلچر کو فنا کرچکی ہے اب مغرب کی ان فریب خوردگیوں کے نذر ہوجائے۔ لہٰذا ایک عرصہ سے فرنگیت و مغربیت کی اس تباہ کن اور خطرناک فسوں و طلسم کو توڑنے کی مساعی و اجتہاد میں مصروف تھے۔ مختلف حیثیت و پہلوؤں سے اسکی تخریب و تنقیص کی وضاحت کرکے قوم کو سمجھایا۔ اور اس سراب و فریب خوردگی سے آگاہ کیا۔

ذکر فرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے
کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
گرچہ ہے دلکشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بال دانہ و دام سے گزر

فرنگی حکومت کا کیسا عمدہ اور حقیقی خاکہ کھینچا ہے ؎

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
یہ علم یہ حکمت یہ تدبیر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

یہ پیام اور تعلیم اپنے تجربات و مشاہدات کی بناء پر ہمکو دے رہے ہیں، کیونکہ وہ اس آتش نمرود افرنگ میں ڈالے جاچکے ہیں اور خود افرنگ کی حالت اور حقیقت سے خوب واقف ہیں ؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

میخانۂ افرنگ و مغرب کی حقیقت ملاحظہ ہو ؎

یاد ایامے کہ بودم در خمستان فرنگ
جام او روشن تر از آئینۂ اسکندر است
جلوۂ او بے کلیمؑ و شعلۂ او بے خلیلؑ
عقل ناپروا متاع عشق را غارت گر است
در ہوایش گرمئ یک آہ بے تابانہ نیست
رند ایں میخانہ را یک لغزش مستانہ نیست

سوشلزم

سوشلزم کا مقصد و مفہوم یہ ہے کہ عوام و جمہور کی وساطت و امداد سے افراد و اقوام کی حالت سنواری و سدھاری جائے۔

جب کبھی ارباب ثروت و حکومت نے غریبوں اور مظلوموں اور کاشتکاروں و مزدوروں پر ظلم و استبداد اور اُن کے حقوق کی پامالی و بربادی کی اسوقت دنیا میں سوشلسٹ خیالات و جذبات ابھرنے، رونما ہونے اور تخلیق پانے لگے۔ چونکہ عصر حاضر دور سرمایہ داری اور امپیریلزم ہے۔ اصحاب دولت اور موجودہ نظام نظم و نسق، امن و انصاف، انسانیت و تہذیب اور مراعات کے نام پر غریبوں کو لوٹتے، کاشتکاروں اور مزدوروں کا خون چوستے، مظلوموں اور بیکسوں کے امن و چین کو برباد کرتے ہیں اور آئے دن انکو تختۂ مشق ستم و ہدف مصائب و آلام بنائے رہتے ہیں۔

اس دور جدید اور نظام حکومت میں غریبوں، مزدوروں اور مظلوموں کی زندگی نہایت ناگفتہ بہ ہے۔ ظالم و خونخوار سرمایہ دار اپنی حیلہ سازی سے ان کا خون چوس رہے ہیں اور حقوق غصب کر رہے ہیں۔ مزدوروں کو اپنی سخت محنت و جانفشانی کی حقیقی اور مکمل اجرت اور پیدا شدہ دولت کا اتنا حصہ بھی نہیں دیتے کہ وہ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پال سکیں۔ ان نصیبے ماروں کو وقت پر پیٹ بھر کے کھانا اور تن ڈھانپنے کو کپڑا تک میسر نہیں ہوتا۔

اور ضروریات کی تکمیل نہیں کر سکتے ۔ لیکن فرعون عصر سرمایہ دار ان تقدیر کے ہیٹوں کے خون اور گاڑھے پسینے کی کمائی اور پیدا کی ہوئی دولت کو اپنی ہر جائز ناجائز ضروریات و خواہشات اور [illegible] پوری کرنے میں بیدریغ صرف کرتے ہیں ۔ ان حالات و ماحول کے اثرات و نتائج نے اقبال میں جذبہ سوشلزم پیدا کیا اور وہ اس نظام کی دھجیاں اڑانے لگے سرمایہ دار کی عصبیت کی تصویر اسطرح کھینچی ہے ۔

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات

وہ ایزد بار ی کی حضور دبارگاہ میں بزبان لینن خطاب کرتے ہیں ؎

رعنائی تعمیر میں ، رونق میں ، صفائی میں
گرجوں سے کہیں بڑھکے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

وہ مہاجن و ساہوکار جو اپنی ناجائز ترکیبوں اور حیلہ دستیوں کے ذریعے غریبوں اور بھولے کاشتکاروں کی سادہ لوحی اور جہل سے لاتعینی نفرت انگیز فائدہ اٹھاتے اور انکی آمدنی کا بڑا حصہ سود کی صورت میں وصول کرتے ہیں ۔ ظالم زمینداروں کو جو غریب و بے بس اور بھولے کسانوں کی کڑی محنت اور پسینہ بہا کر کمائے و پیدا کئے ہوئے آدھے سے زیادہ اناج بغیر کسی محنت و مشقت کے چھین اور لوٹ لیتے ہیں ۔ بدکار سلطنت و حکومت کو جو حیلہ سازی سے غریبوں اور مظلوموں کے سکون اور اطمینان پر ڈاکہ ڈالتی ہے ۔

اور ان کی دادرسی نہیں کرتی ، ایک ہی قماش اور تھیلی کے چٹے بٹے متصور کرتے ہیں ؎

چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں
ساہوکاری ، بسوہ داری ، سلطنت

وہ اس سرمایہ داری و آمریت کی اساس کو متزلزل اور تباہ کرنے ، کاشتکاروں ، غریبوں اور مزدوروں کو ان کے جائز حقوق دلانے کیلئے نہایت مضطرب ہیں اور زبان رب اکبر سے فرشتوں کے نام فرمان جاری کرتے اور ان سے خطاب کرتے ہیں ۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

وہ غلامی کو بنی نوع انساں کیلئے سب سے بڑی لعنت و حقارت ، اور غارتگری سمجھتے ہیں ۔

نوع انساں کیلئے سب سے بڑی لعنت ہے یہ
شاہ راہ فطرت اللہ میں غارت گری

لوگوں اور جمہور کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں ، اور فطرت آزاد کو غلامی سے دور رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ اپنی فطرت کو غلامی سے کثیف و ملوث نہ کرو ۔

از غلامی فطرت آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

غلام انسانوں اور قوموں کی کچھ حقیقت نہیں ۔ ان کو کتے سے بھی بدتر حقیر خیال کرتے اور نیز اسکو ترجیح دیتے ہیں ، کیونکہ کتا اپنے کسی ہمجنس کے سامنے سر خم نہیں کرتا ۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی زسگاں خوار تراست
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

انقلاب

ان حالات و واقعات کا فطرت و سرشت پر فوری اثر و نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعتوں میں جذبات و تمنائے انقلاب ابھرنے اور پیدا ہونے لگتی ہے اور جمہور ایسے نظام و دستور کو یکلخت بدل دینے اور اسمیں ضعف پیدا کر دینے کے لئے مجبور و آرزومند ہو جاتے ہیں ، بدینوجہ اقبال کیسے خاموش بیٹھے رہتے ، ان کے سینہ میں بھی آتش انقلاب کا جذبہ بھڑک اٹھا اور تخلیق ہونے لگا ۔ عوام میں بھی جذبۂ انقلاب کی روح پھونکنا شروع کر دیا ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روح امم کی حیات کشمکش انقلاب

اسی وجہ سے وہ ایک نئے جہان کے آرزومند ہیں ۔

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھکو کہ ہو ابھی نوخیز

جب وہ سرمایہ داروں اور زمینداروں کو غریب مزدوروں و کاشتکاروں کا خون چوستے اور لوٹ و غارتگری کرتے دیکھتے ہیں تو بیچین ہوکر انقلاب ! انقلاب ! پکار اٹھتے ہیں ؎

خواجہ از خون رگ مزدور سازد لعل ناب   از جفائے دہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن   اہرمن اندر جہاں ارزاں و یزداں دیریاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

من درون شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام   آں چناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

مناظر نگاری

اقبال ایک بہترین حسن کار اور مصور ہے جو مناظر قدرت کا نقشہ نہایت خوبی کے ساتھ ارتسام کرکے نیچر کی حقیقی جاذب و رنگین تصویر و نقش کھینچ دیتے ہیں ۔ مصور رنگ و موقلم سے اپنے (Canvas) پر رنگ کاری و رنگ آفرینی کرکے ایک حسین و دلکش مرقع و تصویر تیار کرتا ہے ۔ لیکن شاعر لفظوں کے استعمال سے تخیل و دل کے canvas پر کیف خیز موسم و روح پرور کیفیت ۔ مست کن و بہجت آفرین مناظر وجدان خیز و محویت انشاب وغیرہم کی اپنی حسن آفرینی و سحر خیزی سے حسین و جاذب ارتسامات پیدا کر دیتا ہے ان نقوش و ارتسامات میں موسیقی و شباب کی روح پھونک کر اصل سے زیادہ رنگینی و انجذاب اور خوبی و زیبائش تخلیق و نمو کر دیتا ہے اور مصور سے کہیں بڑھ جاتا ہے اسی لئے شاعر کو حسن کار اور مصور فطرت کہا جاتا ہے اور مصور پر فوقیت حاصل ہے ۔ ملاحظہ ہو انہوں نے کس حسن آفرینی سے موسم بہار کی تصویر ارتسام کی ہے اور انجذاب و حسن اور رنگینی پیدا کی ہے

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھکو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

مست ترنم ہزار طوطی و دراج و سار
ہر طرف جوئبار کشت گل لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

(۲)

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

باد بہاراں وزید مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید حسن گل تازہ چید

عشق غم نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

ایک جگہ ندی کی روانی کا منظر کھینچا ہے ؎

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

ماہ نو کا کیسے جاذب ولطف آفریں تخیل سے منظر و نقش مرتسم کیا ہے

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل
ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب
نشتر قدرت نے کیا کھولی ہے فصد آفتاب

چرخ نے بالی چرا لی ہے عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

"کنار راوی" والی نظم میں شفق کا کیا حسین و رنگین منظر پیش کیا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ دلکش تشبیہوں اور استعاروں چار چاند لگا دیئے اور ایک جان پیدا کر دی ہے ؎

شراب سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامن شام
لیئے ہے پیر فلک دست رعشہ دار میں جام
عدم کو قافلہ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا

ایک جگہ اور شام و شفق کا حسین و شباب خیز نظارہ پیش کیا ہے ؎

وادیٔ کہسار میں غرق شفق ہے سحاب
لعل بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

حکیم اعظم کا کلام حسن و زور بیان، جدت آفرینی، دلکش و حسین تشبیہوں اور ترکیبوں کا نادر و بیش بہا نمونہ اور مجموعہ، ان کی فکر لطیف و تخئیل کے ماہ پارے جو رنگینی و ترنم، جذبات و حسن آفرینی اور وجدان و کیف میں اپنی تمثیل آپ ہیں۔

ہر شعر عرفان و فلسفہ، اسرار و حقائق زندگی و عمل، تہذیب و تمدن، کشاکش پیہم اور فطرت کی ہم آہنگی و حقیقت سے مملو ہے۔ ان کے پیام اور تعلیم کے سب سے اہم و لازم پہلو پیام عمل و اولوالعزمی اور فلسفۂ حیات ہیں۔ کیا اب ہیں کوئی ایسے ترنم آفریں و من بھاتے نغمے سنائیگا؟ اور اسرار و رموز حیات و فلسفۂ اور عمل و جہد پیہم اجاگر و انکشاف کرے گا؟ شاید غیر ممکن ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
عمرہا در کعبۂ و بت خانہ مے نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اسی حقیقت سے واقف ہونے کیلئے کہ کوئی دوسرا حکیم اور دانائے راز حقائق و معارف حیات و فلسفہ کے موتی رولے گا یا نہیں؟ آخری ایام میں یہ قطعہ ان کے ورد زباں تھا ؎

سرود رفتہ باز آید کہ ناید۔ نسیمے از حجاز آید کہ ناید۔ سر آمد روزگار این فقیرے۔ دگر دانائے راز آید کہ ناید

دعائے مغفرت و آمرزش

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اقبال

اسٹیج یا فلم

اسٹیج یا فلم دونوں میں کسے بہتر درجہ دیا جا سکتا ہے ایک طرف اسٹیج کے شیدائی اور دوسری طرف فلم کے فدائی اسٹیج کے شیدائیوں کا کہنا ہے کہ جیتے جاگتے انسان جنکی ہر ادا کو پوری طرح محسوس کیا جاتا تھا ڈرامے کی جان تھے وہ کہتے تھے کچھ ایسے انداز میں کہ ان کا ہر لفظ آپ بیتی معلوم ہوتا تھا۔ انکی اداکاری میں زندگی تھی اور پھر موسیقی تو صرف اسی وقت زندہ تھی جبتک اسٹیج زندہ رہا۔ پکے راگ ہندوستان کے فنکاروں کی سریلی آوازوں کے ساتھ سننے میں آتے تھے اور بعض اوقات تو موسیقار سامعین کو ایسی دنیا میں لیجاتا تھا۔ جہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ جہاں کیف نغمات سے انسان سرور ہی سرور حاصل کرتا ہے۔ فلم میں موسیقی بے جان ہے اور المیت پر عکاسی نے اپنا پردہ ڈال رکھا ہے۔

فلم کے فدائی کہتے ہیں کہ اسٹیج میں سب سے بڑی یہ خامی کہ بہت سا وقت ضائع ہوتا تھا گھنٹوں مسلسل بیٹھا رہنا پڑتا تھا پھر ایسے مناظر جو اسٹیج پر پیش نہیں کئے جا سکتے اگر پیش کئے جاتے تو بیجان ہوتے تھے اور اگر نظر انداز کردیئے جاتے تو کہانی کے تسلسل پر نظر انداز ہوتے تھے، مگر ایک بات پر دونوں فریق متفق ہیں کہ تھیٹر یا اسٹیج ہندوستان میں اسوقت آیا جب اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کیلئے کسی رہبر کی ضرورت تھی، ابتدا میں اگرچہ ایسے ڈرامے کھیلے گئے جن میں اصلاح کا پہلو نہ تھا بلکہ آہستہ آہستہ ڈرامہ اسطرف مائل ہوتا گیا اور آغا محمد شاہ حشر کاشمیری مرحوم کے زمانہ میں اسٹیج نے سماج کے سدھارنے میں بڑے بڑے سوشل ریفارمروں کا ہاتھ بٹایا ہے۔ فلم جو اسٹیج ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس نے اس فن کو اور بھی جلا دی اور ہر وہ بات جو انسانیت کے دائرہ کی تھی عوام سامنے پیش کیجانے لگی۔ برائیاں اس انداز میں پیش کی گئیں کہ ان سے نفرت ہونے لگی۔ اسٹیج کے شیدائیوں اور فلم کے فدائیوں کی یہ لفظی جنگ کبھی ختم نہ ہوگی جن کو اسٹیج مرغوب ہے وہ اسے اور جنہیں فلم عزیز ہے اسے بہتر کہتے رہیں گے۔ مگر ہندوستان کے ایک بہت بڑے اور بالغ نظر پروڈیوسر کا خیال ہے کہ اسٹیج اور فلم دونوں کے ملاپ سے ایک نئے فن کی پیدائش ہو رہی ہے۔

اسٹیج فلم کمپنی نے جو اس سے پہلے "خون کا خون" نامی فلم پیش کر کے عوام سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہے اب آغا حشر مرحوم کا غیر فانی اسٹیج ڈرامہ **پاکدامن عرف شہید ناز** تیار کیا گیا ہے جو منروا سینما میں دکھایا جا رہا ہے۔ اس فلم میں ہندوستان کے بہترین اداکار **غلام محمد۔ مینکا** (حیدرآبادی) **محمد اسحٰق فیروز دستور۔ میرا۔ لیلا** (حیدرآبادی) کام کرتے ہیں +

اے ہلال عید اے فانوس بزم کائنات
جلوہ افروزی سے تیری نور کا پیکر ہے رات
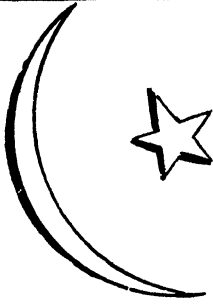
سچ بتا لایا ہے کیا گردوں نشینوں کا پیام
کر رہا ہے اہل عالم کو جو جھک جھک کر سلام

آہ کچھ ان تیرہ بختوں کی بھی ہے تجھ کو خبر
جن کی آہیں چرخ سے لوٹیں ہیں محروم اثر

جن کی فریاد اہل زر کو موجب آلام ہے
ہر نفس جن کیلئے اک موت کا پیغام ہے

سرزمین ہند بھی ہے جائے عبرت اے ہلال
دہر میں ملتی نہیں کچھ اس کی پستی کی مثال

جنبش ابرو سے روتوں کو ہنسا دیتا ہے تو
اور اپنی دید کا شیدا بنا دیتا ہے تو

منتظر تیری بشاشت ہی کا ہندوستان ہے
تیری پستی میں بھی مضمر اوج کا سامان ہے

اپنی فطرت سے ہمیں بھی آشنا کردے "ہلال"
کہہ سکیں دنیا میں ہم بھی "ہر زوالے را کمال"

برادران وطن کی خدمت میں — اسٹیج فلم کمپنی کی طرف سے

عید مبارک

عید کی مسرتوں کے آغوش میں پردۂ سیمیں کا حسین ترین شاہکار

پاکدامن عرف شہید ناز

"خون کا خون" (ہملٹ) پیش کرنیوالی اسٹیج فلم کمپنی کی دوسری ہنگامہ خیز پیشکش، یورپ کے بہترین ڈرامہ نویس ولیم شیکسپیر کا شاہکار "میژر فار میژر"

جسے

ہندوستان کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار آغا حشر کاشمیری مرحوم نے اردو کا جامہ پہنایا

خالص ہندوستانی موسیقی کا دلنواز مرقع

بہترین مناظر — پرزور مکالمے — نظر فریب رقص

منروا ٹاکیز (لیمنگٹن روڈ)

خاص اداکار:-
غلام محمد - ملیکا (حیدرآبادی) محمد اسحٰق میرا -
فیروز دستور -
لیلا (حیدرآبادی) وغیرہ

اوقات

روزانہ:— تین کھیل ۴ ۱/۲ - ۷ - اور ۱۰ بجے شب
سنیچر اتوار اور تعطیل کے دن ایک ایڈیشنل کھیل ۱ ۱/۲ بجے دن سے

ڈائرکٹر — رستم مودی

SADHONA BOSE in Wadia Movietone's RAJ NARTAKI coming shortly

A Scene from Ranjit's DIVALI running at Royal Opera House.

رنجیت موویٹون کا بہترین فلم
ڈائرکٹر :-
جینت ڈیسائی
دیوالی
اپنی پہلی فرصت میں
ملاحظہ فرمائیے
آپ کے دل میں روشنی پیدا ہو جائے گی!
اداکاران خصوصی
مدھوری
واسنتی
موتی لال
ایشور لال
دانتے
انڈو بالا
سیرش
اور دیگر اداکار
رائل اپیرا ہاؤس چوپاٹی
اوقات روزانہ :- ۳ ½ - ۶ ½ - ۹ ½ بجے شب کو
سنیچر - اتوار - تہوار کو ۱۲ ½ بجے دن میں زائد

عہدِ وفا

رشحاتِ فکر جناب امین حزیں

"تو میرے عشق سے مایوس نہ ہو"
بیوفائی میری فطرت میں نہیں
تو نے دیکھا ہے کبھی ؟
ایک ویرانہ میں تنہا کسی دیوانے کو
جب کہ موہوم تخیل اُسے گرماتا ہو
بھاگ کر خوف کے پردے میں چھپا جاتا ہو
اور بیہوش سا ہو رزم گہ منزل سے

یا کسی حُسن کی شرمیلی نگاہوں میں کہیں
زندگی لرزہ بر اندام ہو ہر حرکت میں
سامنے آئے اگر کوئی جواں
خوف میں شوخیٔ اظہار چھپی جاتی ہو

میں بھی ہوں لرزہ بر اندام
نہیں منزل کا نشاں
تن تنہا ہوں کسی دشت میں آوارہ ہوں
مگر یہ ہے یقیں
بے وفائی میری فطرت میں نہیں
تو میرے عشق سے مایوس نہ ہو

دیکھ اس ہلکے سے پروانے کو دیکھ !
رقص کرتا ہے کبھی جان بچاتا ہے کبھی
آہ! اگر رقص کی سرمستی میں
موت کی گود میں آرام سے سو جاتا

میں بھی اک ہلکا سا پروانہ ہوں
جاں بچاتا ہوں مگر رقص کی مستی کے لئے
مجھ کو معلوم ہے اس رقص میں ہی موت مری
ہاں ! مگر تجھ کو بھلاؤں گا نہیں !
بے وفائی مری فطرت میں نہیں
تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو

لوگ کہتے ہیں "میں دیوانہ ہوں"
کہ ہوں مائل بہ سراب
میرے خوابوں کی تمناؤں کی تعبیر نہیں !
آہ ! ....

دیکھ اس ساحل دریا پہ ! وہاں !!
مچھلیاں کوئی پکڑنے کیلئے آیا ہے
جال ڈالے ہوئے امید میں مست
جستجو ، شوق ، توقع کا کھلونا بن کر
قعر دریا میں نظر ڈالتا ہے ،

تب ساحل پہ ہوں میں شوق کی سرمستی میں
آرزوؤں کا پلندہ ہوں میں دیوانہ نہیں
آہ ! کسی دل کو جو ٹھکرائے وہ فرزانہ نہیں .

بے وفائی مری فطرت میں نہیں
تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو

تم مجھے ، آہ ! یوں بےخوف چلا جانے دو ! !
آخر آئے گا کبھی میرا مقام !
میں جہاں تھک کے ٹھہر جاؤں گا
کسی ویرانے میں آبادی میں
آ ملے گی مری منزل مجھ کو

اور اگر
راہ چلتے ہوئے تاریکی میں
میں گرا برف کے تودوں پہ کہیں

کیا ہوا ؟
جستجو ہے مری ہستی کا مزاج
راہ ملجائے یا منزل کا نشاں
ایک موہوم تصور ہی رہے
واپسی ، رکنا ، ٹھہرنا مری منزل ہی نہیں
بے وفائی مری فطرت میں نہیں
تو مرے عشق سے مایوس نہ ہو !

از حساس ادیب، جناب دکھی پریمنگری

دُور آسماں پر ہلال عید ضوفشاں تھا! ـــ جیل کی آہنی سلاخوں کے تاریک سایہ کی متوازی لکیریں اس چہرے پر پڑ رہی تھیں جو ایک بیخودی کے عالم میں اسے سلاخوں کے درمیان سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دو سلاخیں تھام رکھی تھیں اور اسکی پیشانی ایک سلاخ پر ٹکی ہوئی تھی ـــ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہا تھا:ـ

"کل عید ہے اس کا کیا حال ہوگا ـــ؟"

کل جب تمام لوگ ایکدوسرے سے مل رہے ہونگے میں موت سے ہم آغوش ہوں گا! آج میری زندگی کی آخری رات ہے کل سورج طلوع ہوتے ہی مجھے پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا۔ مگر لوگوں کو کیا معلوم کہ مجھے کیوں پھانسی دی جا رہی ہے، کیوں میری نوجوان بیوی کو بیوہ بنانے کی کوشش کی گئی! شاید نہیں! اے خوبصورت "ہلال عید" مژدہ لطیف کیا تو لوگوں سے اتنا کہہ سکتا ہے، میرا پیام پہنچا سکتا ہے ـــ اگر ہاں تو سُن ـــ دنیا والوں سے کہدینا کہ انہوں نے مجھے اسی لئے تو پھانسی دی ہے کہ میں نے ان کو ایک بڑے فتنہ سے بچا لیا۔

ایک ایسے پنجہ کو انکی گردن سے علحدہ کر دیا جو ان کو بغض و تعصب کے دہکتے ہوئے شعلوں کی جانب کھینچے لے جا رہا تھا۔ ہاں میں نے ایک ریاکار قومی لیڈر کو قتل کر کے آپ پر احسان کیا ہے۔ جاہل اسے رہبر قوم ہمدرد وطن اور نجانے کیا کیا مانتے ہیں لیکن میں نے اسے خوب اچھی طرح سمجھ لیا تھا، پہچان لیا تھا، اس کا کام یہی تھا کہ جاہلوں کو مذہب کا نام لے لے کر آپس میں لڑائے اور اسطرح اپنی لیڈری قائم رکھتے ہوئے وطن کی غلامی کی زنجیروں کو اور مضبوط بنایا جائے۔ وہ تمہارا اور قوم کا ہمدرد نہیں غدار تھا اور اسکی یہی سزا ہونا چاہئے تھی، مگر مجھے میری اس خدمت کا کیا صلہ ملا، پھانسی کا تختہ ـــ آپ لوگوں کی طرف سے ایک فدائے وطن و آزادی کیلئے عید کا مبارک تحفہ ـــ شکریہ ـــ محبان وطن صد شکریہ!

آپ کا قصور نہیں یہ تو دنیا والوں کا دستور ہے۔ سقراط کو بھی ایسے جرم میں زہر پینا پڑا تھا اس نے بھی اپنے بھائیوں کو نیک راہ بتلانا چاہی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ ایک وقت ایسا بھی آئیگا جب آپ ہی کے بچے آپ کا نام لیتے ہوئے شرمائینگے، دوسرے انہیں طعنہ دیں گے کہ ان کے آبا و اجداد ایسے ظالم اور جاہل تھے جنہوں نے وطن کے ایک سچے پرستار کو دار پر لٹکا دیا۔

مجھے دفتر میں ساٹھ روپیہ تنخواہ ملتی تھی، گھر میں صرف دو ہی آدمی تھے، میں اور میری بیوی — آرام سے گذارہ ہوتا تھا، کسی بات کی فکر نہ تھی۔ لیکن میں نے اس تمام راحت و آرام کو چھوڑ کر، خیرباد کہکر جو جان کی بازی لگا دی تو آخر کیوں، اپنی حسین بیوی کی پاک محبت کو علیحدہ کر دیا۔ وہ مجھے روکتی رہی لیکن میں نہ مانا اور حب وطن کے جوش میں اس ننگ قوم لیڈر کو قتل کر دیا تاکہ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ایک ہی دیس کے باشندوں کے ہر دوں میں کھوٹ، بغض عناد اور دشمنی کے بیج نہ بو سکے۔ اور ہم سب ہندو مسلم سکھ عیسائی آپس میں گھل مل کر رہیں، آپس میں کتوں کی طرح ایکدوسرے کو بھنبوڑ کھانے کو نہ دوڑیں —!

کل میری بیوی آئی تھی مجھ سے آخری مرتبہ ملاقات کرنے —! میری التجا کے مطابق وہ سیاہ جدول کی بنگالی ساڑھی پہنکر کانوں میں ہلالی آویزے ڈالے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے مگر سوگوار آنکھوں سے غم کے آنسو ٹپک ہی رہے تھے، اف مجھ سے کتنی محبت ہے۔ میرا دوست جس کے ساتھ وہ آئی تھی، کہہ رہا تھا کہ اس نے جب سے پھانسی کا سنا ہے اپنے ہوش کھو دیئے ہیں اور ایک سکتہ کے عالم میں ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس پتھر پر بٹھا لیا۔ اسکے آنچل سے اسکے آنسو پونچھے اور کہا "تم روتی ہو" آخر کیوں؟ تمہارا مرد پھانسی پر چڑھ رہا ہے اس لئے؟ مگر ذرا یہ تو سوچو کہ اسے کیوں پھانسی دی جا رہی ہے۔

پھانسی اور خاص عید کے دن! ہونہہ!

مجھ میں اور عام قاتلوں میں بہت فرق ہے نہیں تو مجھ پر ناز کرنا چاہئے کہ تم اسکی بیوی رہ چکی ہو جس نے وطن کو ایک نفس پرست غدار اور ریاکار و تفرقہ پرداز لیڈر سے نجات دلائی اور اسکے صلہ میں اپنے ہم وطنوں کی دی ہوئی بخشش "پھانسی" کو عید کا تحفہ سمجھا اور ہنسی خوشی دار پر لٹک گیا۔

نہ رو پیاری — میرے استقلال کو متزلزل نہ کرو — میرے سامنے جبتک رہو مسکراتی رہو۔ تمہاری ان ہی فردوسی مسکراہٹوں سے تو میں موت کا مقابلہ کروں گا۔ پر ایک بات بتاؤ، کیا تم بھی مجھ سے قاتل سمجھ کر دنیا والوں کی طرح نفرت کرتی ہو؟"

اس نے میری گود میں سر رکھ دیا اور روتے ہوئے کہا نہیں!

"تو پھر اٹھو خوشیاں مناؤ" میں نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اپنے دوست سے کہا۔ "دوست تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور میں تمہیں۔ آج تم ہی جو اپنی بھابی کو بیوہ بننے سے بچا سکتے ہو۔ میں اسے طلاق دیئے دیتا ہوں تم شادی کر لو — اسکا سہاگ تمہارے ہاتھ میں ہے — مگر دیکھو انہیں کوئی تکلیف نہو۔ صبح ذرا دیر سے اٹھتی ہیں اسپر خفا نہ ہونا۔ اور جب یہ بہت غصہ میں ہوں تو انہیں بہت سے پھول لا دیا کرنا، پھولوں کو دیکھ کر ان کا سارا غصہ اتر جاتا ہے۔ اچھا اب تم جاؤ خوشیاں مناؤ — دیکھو بیگم عید کے روز وہی شادی والا جوڑا پہننا — میں تم دونوں کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ یاد رکھو میری روح کو نہایت کوفت ہوگی —! میں نے اپنے دوست کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیا — وہ بیہوش ہوگئی میرا دوست اسے لے گیا۔ اب میں انہیں کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔"

چاند ڈوب گیا — عید کا مژدہ سنا کر —

قیدی سلاخوں کے پاس سے ہٹ آیا — کمرہ کی تتی دھیمی ہو چلی تھی اسنے بڑھائی مگر تیل نہ تھا۔ وہ بجھ ہی گئی اور آخر ایک ہچکی

یکر خاموش ہوگئی - چہار طرف تاریکی ہی تاریکی ـــــ قیدی بیٹھا رہا ـــــ تمام رات ـــــ نجانے کیا سوچتا رہا ؟

آخر جیل کا گھنٹہ چار دفعہ ٹھکرا کر خاموش ہو گیا ـــــ پو پھٹ چکی تھی ـــــ قیدی اٹھا اور پھر سلاخوں سے آ لگا - دل میں کہنے لگا " آج عید ہے ، اب صرف آدھ گھنٹہ اور بچا ہے اسکے بعد سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سب کھیل ختم ـــــ تھوڑی دیر میں دروازہ کھلیگا ، جیلر کہیگا " چلیئے ـــــ پھانسی کا پھندا صبح کی ہلکی ہلکی نسیم میں جھول رہا ہوگا - آس پاس بڑے بڑے آفیسر کھڑے ہونگے ، مجھ سے پوچھیں گے آخری خواہش ـــــ میں کہوں گا ایک ایسے ہی لیڈر کو ختم کرنا چاہتا ہوں ، کیونکہ آپ لوگوں کے قانون میں ایک اور دو خون کی سزا ایک ہی ہے - چین بھیں ہوکر وہ مجھے پھندا پہننے کو کہے گا ، میں پہن لوں گا ، پھر منھ پر ٹوپ .... بس ختم -

لو وہ جیلر آگیا ، میری کوٹھڑی کا دروازہ کھولا جا رہا ہے - وقت آگیا ، میں تیار ہوں ـــــ اچھا خصت دنیا والو ایک بنو ـــــ نیک بنو ـــــ غدار لیڈروں کی باتوں میں نہ آؤ ـــــ اچھا تم زندہ رہو ـــــ خوش رہو ـــــ میں مرتا ہوں اور زندگی اچھی ہے یا موت ؟ ـــــ کون جانے ـــــ !

اچھا عید مبارک دنیا والو ! "

غزل

(از محترمہ مضطر رضویہ صاحبہ)

جو صرف ماتم دل گیسوئے جانانہ ہو جائے
تو ہستی عشق کی الجھا ہوا افسانہ ہو جائے !

سمجھ جائے اگر انسان خود رعنائی دل کو
نگاہوں میں جہاں رنگ و بو افسانہ ہو جائے !

ارے ظالم ! نہ تیری پردہ داری میں اگر چاہوں
تو ہر نقد کتاب دل کا اک افسانہ ہو جائے !

دفور غم سے قوت ضبط کی اب سلب ہوتی ہے
مجھے ڈر ہے کہ ان کا راز اب افسانہ ہو جائے !

گداز درد میں ڈوبے سے کچھ قطرے ہیں مژگاں پر
اگر تم دیکھ لو بہتا ہوا افسانہ ہو جائے !

محبت راز رہتی ہے رہے جب تک نگاہوں میں
اسی کو بیخودی کہدے تو اک افسانہ ہو جائے !

آج بھی!

از جناب شاد اختر (علیگ)

سینہ میں میرے دیکھ وہی دل ہے آج بھی
روشن اسی چراغ سے محفل ہے آج بھی

اب بھی ہے کہکشاں ترے پرتو سے راہ شوق
پرنور شمع جادۂ منزل ہے آج بھی

اب بھی حیات شوق کی کشتی ہے تیز رو
ہر موج ایک امید کا ساحل ہے آج بھی

اب بھی ہے ایک کیف امید کرم کے ساتھ
اک لطف انتظار میں شامل ہے آج بھی

اب بھی ہے مجھکو عشق کی حکمت پہ اعتماد
دل کو امید حل مسائل ہے آج بھی

اب بھی ہے دل یہ آتش نظارگی کا، لو
شعلہ سا ایک زینت محفل ہے آج بھی

اب بھی ہے ہر نگاہ تری، روح آرزو
تو جان شوق بن کے مقابل ہے آج بھی

اب بھی ہے گل پہ جلوۂ شبنم سحر طراز
شبنم میں پرتو مہ کامل ہے آج بھی

وہ دل کہ مجھکو ناز ہے جس پہ مدتوں
اے دوست تیری ناز کے قابل ہے آج بھی

تاثرات

از خالہ زاد صاحب حکیم محمود علیخاں اکبر الہ آبادی

غم اس یقین کے ساتھ مجھے خوشگوار تھا
اس نے دیا تھا غم جو مرا غمگسار تھا

جب شام غم تصور گیسوئے یار تھا
دل کا دھواں بھی سایۂ ابر بہار تھا

محفل میں آشکار ترا راز ہو گیا
لیکن خطا معاف، کہ دل بیقرار تھا

وعدے کا بھولنا تو نئی تھی نہ کوئی بات
تکلیف یوں ہوئی، کہ ترا اعتبار تھا

طاری تھیں ذرے ذرے پہ میری اداسیاں
میں سوگوار تھا تو جہاں سوگوار تھا

امید وہ بھی کیا ہے جو محدود وقت ہے
مجھ کو تو صبح غم بھی ترا انتظار تھا

کیوں میرے دل کو حسن کے قابو میں دے دیا
یارب ہوا سپہ صرف ترا اختیار تھا

میرا سکون ہو کہ ترا وعدۂ وفا
سب کچھ تھا اس جہاں میں، ناپائیدار تھا

دامن تمہارا حشر میں ہم کیوں نہ تھامتے
بے اختیاریوں پہ کسے اختیار تھا

کچھ روز ہم جہاں میں رہے، کچھ رہا مزار
کچھ روز میں نہ ہم نہ ہمارا مزار تھا

درماں تھا اس کا کوئی، نہ اس کا کوئی علاج
عالم عجیب چیز غم ہجر یار تھا

پیر نرم دل

یہ مانا، اتقا میں ایک بھی ثانی نہیں اس کا
مگر، خاطی جوانوں پر کبھی سختی نہیں کرتا
ابھی تک حافظے میں اسکے اتنا نقش باقی ہے
کہ میں بھی اک زمانے میں، گنہکار جوانی تھا!

(جوش)

دوست

کہتے ہیں کہ دنیا میں دوست صادق کا ملنا دشوار ہے — دوست آجکل کبریت احمر ہے — منقا ہے — وغیرہ وغیرہ — لیکن اے دوست اگر تو سچے اور مخلص دوست کی تلاش میں سرگرداں ہے اور تجھے ایسا کوئی نظر نہیں آتا تو سن! — تو بھی کسی کا مخلص دوست بن جا، پھر دیکھ کہ ضرور تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگا — جب تو خود کسی کا مخلص نہیں بن سکتا تو پھر یہ کیسے امید رکھتا ہے کہ تجھے کوئی مخلص دوست ملجائے — ؟

نیکی

کسی نے پوچھا حقیقی نیکی کیا ہے؟

مدرسہ نے کہا علم — علم

مذہب نے کہا — عبادت و تقویٰ

حکومت نے کہا — قانون و سیاست

خدا پرست نے کہا — سچائی اور حق پرستی

دولتمند نے کہا — روپیہ

بیوقوف نے کہا — عیش و عشرت

(ریاض جنیدی)

از جناب تمنائی

چین کا نام سنتے ہی ہمارے دماغ میں کچھ عجیب وغریب خیالات آجاتے ہیں، افیون، چپٹی ناک، چھوٹے پاؤں اور ایسے ہی بے شمار پراسرار باتیں ــــ لیکن موجودہ چین بالکل بدل چکا ہے! وہاں کے غریبوں اور مظلوموں کی بیداری کمیونسٹ پارٹی کا قیام ۱۹۲۷ء کا انقلاب، طلبار اور مصنفوں کا انقلاب، سرمایہ دار قوم پرستوں کا اقتدار، طلبار، ادیبوں، کمیونسٹوں، مزدوروں اور کسانوں پر وحشیانہ ظلم، کمیونسٹوں کی زبردست تنظیم اور آخر کار خون سرد کر دینے والی مصیبتوں کا سامنا کر کے چینیوں نے اپنی چھوٹی سی سوئیٹ حکومت قائم کرلی ــــ چیانگ کائی شک کی سرکردگی میں سرمایہ دار قومی حکومت (کومنٹنگ) کا اس کو کچل دینے کی کوشش، جاپان کا حملہ، جاپان کیخلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کیلئے کمیونسٹوں کی کوشش اور ان کی کامیابی، یہ سب باتیں ہمارے سامنے آچکی ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم چین کے "تخلیقی دماغ" کے بارے میں کچھ معلوم کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کیا سوچ رہے ہیں؟ وہ اپنے بارے میں اپنی زبان میں اپنے ہموطنوں کے لئے کیا لکھ رہے ہیں؟ چین میں (اس نئے چین میں جس پر ابتک پردہ پڑا تھا) زندگی کا دھارا کسطرح بہہ رہا ہے؟ وہاں کے دکھیارے غریب کیسے رہتے ہیں؟ کیسے کام کرتے ہیں؟ وہاں کے امیر کسطرح عیش کرتے ہیں؟ ادیبوں، مصنفوں، شاعروں، مصوروں کے جذبات کو کیا کیا چیزیں اکساتی ہیں، اور کیوں اور کیسے؟ اور پھر ان جذبات کا وہ کیسے اظہار کرتے ہیں؟ ان کی زندگی کا کیا مقصد ہے؟ کیا وہ ہم ہندوستانی ادیبوں کی طرح ابتک دنیا کے جھگڑوں سے الگ تھلگ، زندگی کی سختیوں اور مشکلوں سے منھ پھیرے اپنے اپنے چاروں طرف سے دکھ اور درد پر آنکھ بند کئے، چھوٹی خیالی رنگین، رومانی دنیا میں پڑے رہنا ہی اپنا کام سمجھتے ہیں یا سماج کے گندے گھاؤ میں نشتر چبھونے، زندگی کو بہتر طریقے سے بسر کرنے، دنیا کے دکھ درد، ظلم اور خودغرضی کو مٹانے کیلئے معمولی انسان کی طرح کوشش کر رہے ہیں؟ جاپان کی زبردست ٹکر اور مغربی خیالات کی رَو نے وہاں کے دماغوں پر کیا اثر ڈالا؟ اور وہاں کے فنکار اسے کیسے ظاہر کرتے ہیں؟ وہ اپنے ادب میں جو وہ اپنے ہی جیسوں کیلئے پیدا کرتے ہیں (باہر کے پڑھنے والوں کو خوش کرنے کیلئے نہیں) کسطرح اپنے جذبات، اپنے تخیلات، اور اپنے محسوسات کو پیش کرتے ہیں،،

انگلستان کے ایک روزانہ اخبار "ڈیلی ہیرلڈ" کے نامہ نگار اڈگر اسنو نے جو پیکنگ میں کئی سال سے رہتے ہیں، ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی اور بڑی محنت سے ایک کتاب مرتب کی جسمیں آجکل کی چینی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں چین کو

صحیح طور سے سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہیں۔ ان میں غیر معمولی چابکدستی
سے جدید چین کے ہر پہلو کی نہایت سچی اور جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔
اس کتاب کو بجا طور پر " زندہ چین " کہا جا سکتا ہے۔ اس میں
ہم سچی چینی زندگی کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں !!۔

ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لکھنے والوں نے سچ مچ زندگی
کی دھارا کے بہاؤ کو بدلنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے لاکھوں
کروڑوں بھائیوں کے دکھ درد اور مصیبت کو محسوس کیا اور ظلم کے خلاف
بغاوت کی آگ بھڑکانے اور زبردستوں کو مٹانے کی کوشش کی۔
ان کے لئے آرٹ اور ادب صرف دماغی عیاشی، بیکاری کا مشغلہ یا
تفریح نہ تھا " ادب ادب کیلئے " کے غلط اور دھوکا دینے والے
اصول کے ماتحت خیالی دنیا میں نہ بستے تھے۔ ادب کے اونچے برج میں
بیٹھ کر زندگی کا مشاہدہ کرتا رہنا ان کے نزدیک انتہائی بزدلی تھی۔ زندگی
کے ہنگامہ میں وہ کود پڑے۔ وہ بزدلوں کی طرح بیٹھے اس خود فریبی
میں مبتلا نہ رہے کہ صرف خدا ہی انسانیت کو اس کے خود ساختہ
دکھوں سے نجات دلا سکتا ہے .... وہ گردش ایام کا
رخ پھیرنے کو آگے بڑھے، اپنی جانیں جوکھوں میں ڈالیں، قید کی
صعوبتیں سہیں، گردنیں کٹوائیں، زندہ دفن ہوئے جلاوطن ہوئے
لیکن حق کا اعلان کرنے میں ان کی آواز اور تیز اور تیز ہوتی گئی !!

ہمارے لئے انکی تصنیفوں میں اور خود ان کی زندگیوں
میں بڑا سبق ہے۔ آج کی صحبت میں ہم ان میں سے چند ایک کے
حالات جاننے کی کوشش کرتے ہیں:—

جیو شہہ
۱۹۰۰ — ۱۹۳۱

جیو شہہ صوبہ چیکیانگ کے ایک گاؤں میں
پیدا ہوا اور صوبائی اسکول میں تعلیم پائی۔
ٹریننگ کالج سے سند لیکر ——— میں پڑھانا شروع کیا۔ کچھ
عرصہ وہ چیکیانگ میں ضلع سنگھائی کا کمشنر تعلیمات رہا۔ اسے لکھنے سے
دلچسپی ہو گئی۔ انتہا پسندانہ خیالات کا کافی اثر ہوا اور اپنی اکثر
تصنیفوں میں اسنے انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔

جیو شہہ بائیں مصنفوں کی لیگ کا (جو ۱۹۲۷ء کے انقلاب
کی ناکامی کے بعد شنگھائی میں قائم کی گئی تھی) پرجوش رکن تھا۔ لیگ کو
کومنتنگ نے غیر قانونی قرار دیا اور اسکی رکنیت کی سزا موت تھی۔ جیو شہہ
نے اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ ۱۹۳۱ء میں یہ سزا بھگتی۔ جنوری ۱۹۳۱ء
میں برطانوی پولیس نے اسے شنگھائی کے بین الاقوامی علاقہ میں گرفتار
کیا۔ وہ چینی حکام کے حوالے کر دیا گیا۔ اور نینکنگ مرکزی حکومت سے
حکم آنے پر ۷ فروری ۱۹۳۱ء کو لنگھوا چھاؤنی میں قتل کر دیا گیا۔ اسکے
پانچ ساتھی جو اس کے ساتھ قتل ہوئے یہ تھے:—

فنگ کنگ (۴۴ سالہ مصنف) **سنگ ہوئی** (۲۱ سال)
ین فو (۲۲ سال) **یی ڈیزن** ۲۸ سال۔ اور
ہوہ پہ ینگ (۲۶ سال)

جیو شہہ کی تصنیفیں " فروری " (دبڑا انز) اور " قدامت
کی موت " ہیں۔ " داشتہ " اسکی بہترین کہانی مانی جاتی ہے۔
چینی ادب کی " انقلابی حقیقت نگاری " پر اس کا مستقل اثر ہوا !!

ماؤ توں
۱۹۲۰ —

" شن ین پنگ " ماؤ توں کے قلمی نام سے
زیادہ مشہور ہے لیکن اس نے یولاؤ اور پنگ تنگ
اور دوسرے قلمی ناموں سے بھی بہت کافی لکھا ہے۔ اسکی ادبی
زندگی بہت ہی معمولی طرح شروع ہوئی۔ پہلے پہل وہ شنگھائی
کے کمرشل پریس میں پروف ریڈر تھا۔ جو دنیا کا سب سے بڑا ذاتی اور
(غیر سرکاری) مطبع خیال کیا جاتا ہے۔ اسکی شہرت مشہور رسالہ
" مختصر افسانہ " کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ اس رسالے نے
چینی پڑھنے والوں کو مغرب کی بہترین کہانیوں سے روشناس کرایا اور
اسی میں سب سے پہلے چین کے ہمعصر جدید کے لکھنے والوں کی تحریریں چھپیں

انقلاب کے زمانہ میں وہ قومی جماعت میں شامل ہوگیا اور سیاسی محکمہ میں کام کرنے لگا جس پر کومنٹنگ کا بایاں بازو چھایا ہوا تھا، سنہ ۱۹۲۷ء میں ہنکاؤ پر قبضہ ہوجانے پر وہاں کے "امن کیو ڈیلی پوسٹ" کا مدیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ پھر انقلاب اور اس کے ساتھ چیانگ کائی شک کے کومنٹنگ کے دائیں بازو کی فتح کی وجہ سے مجبوراً الگ ہونا پڑا۔ اسنے شنگھائی واپس آکر پھر لکھنا شروع کردیا اسکے بعد اس نے سیاست میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ لیکن اس کے مضامین اور تنقیدیں ترقی پسندانہ مخالفت کی پرزور تائید کرتی ہیں وہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ اسکی نو کتابوں کو کومینٹنگ ضبط کرچکی ہے !!

ماؤ توں آجکل کے چینی ناول نگاروں میں شاید سب سے ممتاز ہے، اس کی "آدھی رات" جسکا ترجمہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی ہوچکا ہے۔ اسکی لمبی کہانی "بہار کا ریشم کا کیڑا" اور اس کا نثرالمیہ "سعی" "اضطراب اور نجات" اس کی نئی حقیقت پسندی یا "انقلابی فطرت پسندی" کے ممتاز نمونے ہیں۔ جو چینی ادب میں ایک نئی روح پھونک رہے ہیں۔

اسکی کہانیوں کے متعدد مجموعوں میں "جنگلی گلاب" اس کا شاہکار سمجھا جاتا ہے اسکے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اور اسکی مقبولیت گوتھوسون کے "نوبان" کے برابر ہے۔ سماجی، سیاسی اور ادبی رجحانات کے ساتھ ساتھ ذاتی تعلقات میں بھی وہ توہوسون کے بہت قریب ہے۔ توہوسوں کی طرح اسکا بھی اعتقاد ہے کہ ادب اور آرٹ سماجی قضیوں سے الگ ہوکر بے جان ہیں۔

تنگ لنگ
(۱۹۰۵ء)

تنگ لنگ چین کی تمام موجودہ لکھنے والوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔ خاصکر چین کے نوجوانوں میں تو بہت مقبول ہے۔ جاپان میں بھی اسکی تصنیفیں خوب پڑھی اور پسند کی جاتی ہیں۔ اسکی کہانیاں روسی، جاپانی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہیں۔

تنگ لنگ حانگنفہ (صوبہ ہونان) کے ایک غریب خاندان کی لڑکی ہے تعلیم حاصل کرنے کیلئے اسے بڑی کوشش کرنی پڑی۔ مڈل اسکول ہی کے زمانہ میں وہ انقلابی تحریک میں شامل ہوگئی۔ کمونسٹوں کے خلاف جارحانہ کاروائی کے سلسلہ میں اس کا شوہر قتل کردیا گیا اور اس پر دوستی کا خاتمہ ہوگیا۔ اسکے بعد شن ٹسونگ ون اسکے ساتھ رہا اور اس نے اسکو انقلابی راہ سے ہٹانے کوشش کی، لیکن بیکار گئی۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں حکومت کے نیلی پوشوں نے اسے گرفتار کرلیا اور کچھ دنوں تک یہ خیال کیا جاتا رہا وہ قتل کردی گئی۔ لیکن کچھ عرصہ ننکنگ میں قید رہنے کے بعد وہ آزاد ہوگئی اور آجکل شمالی چین میں ہے۔ جہاں چینیوں کی سویٹ حکومت قائم ہے۔

کومنٹنگ اسکی سات کتابوں کو غیر قانونی قرار دے کر ضبط کرچکی ہے "دبی ہوئی" "ایک مزہ کی سالگرہ" "ایک خودکشی کرنیوالے کی ڈائری" اور "صوفی کی ڈائری" اسکی سب سے مشہور کتابیں ہیں۔ اسکی تحریر کی خصوصیت آجکل کے نوجوانوں کا نفسیاتی تجزیہ اور اس کے اسلوب کی تازگی اور جانداری ہے۔

شن ٹسونگ ون نے تنگ لنگ کی سوانح عمری لکھی ہے جسمیں ہو۔تنگ۔شن "مثلث" کا بیان نہایت ہی دلچسپ ہے۔

شیہہ منگ
(۱۹۰۸ء)

شیہہ منگ ایک چینی مصنفہ کا قلمی جواتنگ اپنے اصلی نام کو چھپائے رہ سکی نام ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں وہ ہوپیہہ کے ایک پرانے اور اونچے طبقہ کے بڑے چینی خاندان میں پیدا ہوئی۔ اس کا باپ ایک بڑا زمیندار تھا اور

صوبائی سرکار کا ایک اعلیٰ عہدہ دار تھا، تسیہ منگ کی کہانیاں عام طور سے مشہور نہیں لیکن چین کے بہت سے نوجوان اور پرجوش مصنفوں پر اس کا بہت کافی اثر ہوا۔ سماجی واقعات جو اب تک چینی ادب میں ممنوع تھے وہ اس بے باکی اور دلیری سے استعمال کرتی ہے کہ وہ لوگ جو ابھی تک یہ یقین کرنے پر اصرار کرتے ہیں کہ چینی ادب میں ماضی سے انقلابی قطع تعلق کرنیکی صلاحیت نہیں، دنگ رہ جائیں گے۔

"ایک کھوئی ڈائری کے کچھ ورق" —— انقلابی حقیقت نگاری کا اچھا نمونہ ہے!

چڑے چڑیا کی کہانی نہیں
مرد اور عورت کی داستان عشق نہیں
प्रभात चित्र
IT'S PRABHAT
شانتارام کا
پڑوسی
نیا زاویہ
نیا موضوع
دو مردوں کی محبت کا فسانہ ہے
ایک عدیم المثال فلم
نیا فسانہ
"پڑوسی" کا
انتظار کیجئے!
یاد رکھئے!
پربھات کے فلم ترقی پسند
ہوتے
ہیں
سنت گیانیشور
دیکھتے جائیے
سنٹرل سینما

رنجیت مووی ٹون کا "مسافر" بہت کامیاب رہا۔ آجکل مسٹر جینت ڈیسائی کی "دیوالی" رائل اوپیرا ہاؤس میں بہت شان و شوکت سے چل رہی ہے۔ اسٹوڈیو میں مسٹر ڈیسائی "شادی" فلم کی طیاری میں مصروف ہیں۔ اور مسٹر منی بھائی "ویاس" "امید" کی شوٹنگ کر رہے ہیں

نیشنل سٹوڈیوز کی "عورت" فلم کی سلور جوبلی پاتھے سینما میں منائی گئی۔ اب نیشنل سٹوڈیوز کا تازہ شاہکار "مسلنکا" پاتھے سینما میں بہت زور و شور سے چل رہا ہے۔ اسٹوڈیوز میں مسٹر کاردار "پوجا" کو ختم کرنے والے ہیں۔ ڈائرکٹر محبوب "آدمی" فلم بنا رہے ہیں۔ جسمیں شیخ مختار کام کرتے ہیں۔ ڈائرکٹر ویریندر "رادھکا" بنا رہے ہیں۔ ایک نئی کہانی جس کا نام "آسرا" ہے اسے چمن کانت اور للت چندر مسٹر محبوب کی نگرانی میں فلمائیں گے۔

پربھات فلم کمپنی اسوقت تمام شائقین سینما کی آنکھیں "پڑوسی" کا بیچینی سے انتظار کر رہی ہیں۔ "پڑوسی" بڑے زور و شور سے تیار ہو رہا ہے۔ خیال ہے کہ دسمبر میں یہ عظیم الشان فلم نمائش کیلئے پیش کیجائیگی۔

مسٹر شانتا رام "عمر خیام" کے ڈائلاگ وغیرہ کے لئے ہندوستان کے بڑے بڑے لکھنے والوں سے تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔ "عمر خیام" ہندوستان کے پردہ سیمیں کی ایک خاص چیز ہوگی۔

واڈیا مووی ٹون۔ مسٹر جمشید واڈیا۔ مدھو بوس۔ سادھنا بوس اور مسز لیلا ڈیسائی تین مختلف زبانوں میں "راج نرتکی" کی طیاری میں مصروف ہیں۔ خیال ہے کہ یہ پکچر کرسمس کی چھٹیوں میں ریلیز کیجائیگی۔ کہتے ہیں کہ اس پکچر میں سادھنا بوس نے رادھا کرشن کا ایک ناچ پیش کیا ہے جس کی طیاری میں کامل پندرہ دن صرف ہوئے ہیں اس کے ساتھ ہی اس پکچر میں پرتما داس گپتا بھی کام کرتی ہیں۔

پرکاش پکچرز کا "نرسی بھگت" بڑے زور و شور سے کرشنا سینما میں چل رہا ہے۔ اسٹوڈیو میں "مالا" کی طیاری ہو رہی ہے جسمیں روز ہیروئین کا کام کرتی ہیں۔ مسٹر وجے بھٹ "بھرت ملاپ" کی طیاری میں مصروف ہیں۔

"رومیو جولیٹ" اور "راکھی" بھی طیار ہو رہی ہیں۔

منروا مووی ٹون کا "بھروسہ" بہت کامیاب رہا۔ مسٹر سہراب مودی "سکندر اعظم" کی طیاری میں منہمک ہیں۔

اسٹیج فلم کمپنی جس نے "خون کا خون" جیسا نامی فلم پیش کیا تھا اب اسٹیج کمپنی کا طیار کردہ فلم "پاکدامن" عید کے دن سے منروا ٹاکیز میں دکھلایا جا رہا ہے۔

جسمیں ہندوستان کے بہترین اداکار۔ غلام محمد۔ مینکا (حیدرآبادی) محمد اسحاق۔ فیروز دستور۔ میرا۔ لیلا (حیدرآبادی) کام کرتے ہیں۔

سرکو پروڈکشن میجسٹک سینما میں "گیتا" نہایت زور و شور سے چل رہا ہے۔ اسٹوڈیو میں مسٹر دوارکا کھوسلا "دیپک" فلم طیار کر رہے ہیں۔

کلکتہ فلم اسٹیج نیو تھیٹرز کا فلم "ہار جیت" ویسٹ اینڈ سینما میں بہت کامیاب چل رہا ہے۔ اسکے بعد نیو تھیٹرز کا فلم "زندگی" پیش کیا جائیگا۔ اسمیں لیلا ڈیسائی کام کرتی ہیں +

اُف - اوہ!

"گھٹیے کے مرض سے صحتیاب ہونے کی تمام امیدوں کو خیرباد کہہ چکی تھی، یہہ مرض ایک دم ہی شروع ہو جایا کرتا تھا اور مجھے بستر پر لیٹنا پڑتا تھا۔ میں نے اس کیلئے ہر چیز کو آزمایا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا"

اب

آہا - ہاہا

"ایکدن میں ایک دوافروش کے یہاں گئی۔ وہاں میں نے ایک گراہک کو گھٹیے کیلئے کروشن سالٹ مانگتے ہوئے سنا پس میں نے بھی اسے خریدنے کا فیصلہ کرلیا اسدن سے پھر مجھے اس مرض کی تکلیف نہیں ہوئی گھٹیے کا درد کم ہوگیا۔ اور اب میں بالکل اچھی ہوگئی ہوں" کروشن کے اندر خاص نمک ہوتے ہیں۔ جنکا اثر بہت جلد یورک ایسڈ کرسٹلز پر ہوتا ہے، یورک ایسڈ کرسٹلز ہی گھٹیے کے درد کا بنیادی سبب ہوتے ہیں۔ اِن کرسٹلز کے تیز کنارے پگھل جاتے ہیں اور یہ کرسٹلز ایک پتلی سی چیز بنکر جسم سے خارج ہوجاتے ہیں۔ کروشن سالٹ گھٹیے کو ختم کردیتا ہے اور مستقل طور پر **مکمل صحتمند بنا دیتا** ہے۔

کروشن سالٹ آپکو بازار میں تمام انگریزی دوافروشوں و دیگر اسٹوروں میں مل سکتا ہے

کروشن سالٹ کا شکریہ

KRUSCHEN SALTS

Cover Printed at the Lakshmi Art Printing Works Sankli Street Byculla, Bombay 8

آپ کی جلد بھی
خوبصورت ہو سکتی ہے